فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سرور

مُرتّب

رشید حسن خاں

فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سُرورؔ

مُرتّب

رشید حسن خاں

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۹۲

بابائے اردو مولوی عبدالحق میموریل سیریز کی پہلی کتاب

سنِ اشاعت : 2015
اشاعت : .... ششم

بہ اہتمام : .... اخترزماں
ڈیزائن سرورق:............................ محمد ساجد
طباعت : .... ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

FASANA-E AJAIB
by : Rajab Ali Beg Suroor
Rasheed Hasan Khan

Price : 180.00
2015

ISBN : 81-7160-079-4

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar :Urdu Ghar Marg, 212, Rouse Avenue,
New Delhi-110002

Phone : 0091-11-23237212 - 23237214

مقدّمہ

مرزا رجب علی بیگ[۱] سُرورؔ کی کتاب فسانۂ عجائب، مختصر داستانوں کے سلسلے کی مشہور کتاب ہے۔ یہ ہمارے کلاسکی ادب کا حصّہ بن چکی ہے۔ آج اِس کتاب کے متعلق [تاریخی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے] بعض حضرات جو راے بھی ظاہر کریں اور اِس پر جس قدر اعتراضات کریں؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتاب سامنے آئی تھی، اُس زمانے میں اِس کی یکتائی کی دھوم مچ گئی تھی اور بہت جلد اِس کو دبستانِ لکھنؤ کی نمایندہ تصنیف کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا۔

صرف داستان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اِس میں بہت سی خامیاں نکالی جا سکتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہی بات کہ داستان کا ہیرو اُن صفات سے بڑی حد تک محروم ہے جو کسی مرکزی کردار میں دل کشی کی چمک پیدا کیا کرتی ہیں۔ کئی ضمنی کہانیوں کے جوڑ پیوند لگی ہوئی اِس داستان کے بوجھ کو سہارنے کی سکت اُس میں نظر نہیں آتی۔ سادہ لوحی میں بھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جانِ عالم کی تخصیص نہیں، ضمنی کہانیوں کے نمایاں افراد بھی ایسے ہی ہیں۔ مثلاً وہ بادشاہ، جو ادنا تامّل کے بغیر، اپنی بیوی کو ایک اَن جان سوداگر کے ساتھ بھیج دیتا ہے، جس نے یہ جھوٹ بولا ہے کہ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور وہ سوداگر اُسے اپنے

---

[۱] فسانۂ عجائب کی اشاعتِ اوّل (۱۲۵۹ھ) اور اشاعتِ ثانی (۱۲۶۳ھ) (یعنی نسخۂ ح اور نسخۂ ض) میں "بیانِ لکھنؤ" کے آغاز میں مصنّف نے اپنا نام "رجب علی بیگ" لکھا ہے۔ اشاعتِ ۱۲۶۷ھ (نسخۂ ک) اور اشاعتِ ۱۲۸۰ھ (نسخۂ ل) میں "مرزا رجب علی" ملتا ہے۔ اِسی لیے میں نے مکمل نام "مرزا رجب علی بیگ" لکھا ہے۔

ساتھ اپنے ملک لے جاتا ہے۔ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی اِس قدر کم فہمی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اُس کے لیے تو خود سُرورؔ نے لکھا ہے کہ "یہ بے چارے اللہ کے ولی"۔ یا مثلاً وہ سوداگر، جس نے بندر کی صورت میں جانِ عالم کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ بادشاہ بندروں کو پکڑوا رہا ہے اور مروا رہا ہے، اِس کے باوجود وہ آنے جانے والوں کو بندر کی باتیں سُنواتا ہے۔ اِتنا بڑا سوداگر اور اِس قدر سادہ لوح! یا مثلاً مجستن کا لڑکا، کہ وہ بھی جانِ عالم کی طرح سادہ لوحی کا مارا ہوا ہے۔ اُسے بھی سُرورؔ نے خود ہی بُڑھاپے کی اولاد کہا ہے۔ یا وہ بادشاہ، جس سے آخر میں جانِ عالم کی لڑائی ہوتی ہے۔ وہ تو اِس قدر احمق ہے کہ اُس کی فوج جانِ عالم سے مل گئی ہے، اکیلا رہ گیا ہے؛ لیکن لڑنے چلا آتا ہے، تلوار چلاتا ہے اور قید کر لیا جاتا ہے۔ غرض کہ نمایاں کردار کے مرد تقریباً سب کے سب جانِ عالم ہی جیسے ہیں۔

یہ بات اگر نظر کے سامنے ہو کہ اودھ کی حکومت میں آصف الدولہ کے زمانے سے مجہولیت نے جس طرح چھاونی چھائی تھی، اور "شہ زادگانِ کرام" جس طرح حکم رانی کی صلاحیت اور صفات سے تہی دامن تھے، تو پھر اِس کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ سُرورؔ نے کہانی کسی بھی خیالی دنیا کی کہی ہو، داستان کی فضا اور اُس کے کردار اُنھی کے زمانے کے ہیں، و. اُن کے زمانے میں اکثر اُمرا اور ولی عہد صاحبان کا احوال یہی تھا[1]۔ [البتہ یہ دل چسپ بات ہے کہ اکثر عورتیں سوجھ بوجھ سے اِس طرح خالی نہیں؛ بل کہ نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں کی فعال اور طرار خواتین کی طرح ہیں۔ وجہ اِس کی بھی اُسی معاشرے کے احوال و کردار میں بہ آسانی تلاش کی جا سکتی ہے]۔

زبان کے لحاظ سے بھی اِس میں بہت سے مجہول تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اکھڑے اکھڑے سے جملے تو اچھی خاصی تعداد میں مل جائیں گے۔ حُسنِ بیان کا رنگ بھی کئی جگہ اُڑا ہوا

---

[1] دلی میں بھی مغلوں کی حکومت کے آخری زمانے میں یہی احوال تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ پچھلی شان دار روایت کا عکس وہاں آنکھوں میں بسا ہوا اور دلوں میں سمایا ہوا تھا، جس کے اثر سے بیرونی سطح پر کچھ نہ کچھ بھرم رہ گیا تھا۔ لکھنؤ میں یہ بڑی کمی تھی کہ یہاں ایسی کوئی روایت سایہ فگن نہیں تھی۔ اِس کے اثرات کئی صورتوں میں نمایاں ہوئے۔

دکھائی دے گا۔ لفظوں کا بے محل صرف بھی ملے گا اور ایسا پیرایۂ بیان بھی ملے گا جس کو بے کمالی کی نشانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب مسلّم اور برحق؛ مگر بات وہی ہے کہ یہ کتاب محض ایک داستان نہیں، صرف زبان کا نگارخانہ نہیں؛ یہ دراصل ایک اسلوب کا دوسرا نام ہے، اور اصل حیثیت اُس اسلوب کی تھی اور ہے۔ آج ہم اپنے زمانے اور ذہن کے لحاظ سے جو بھی کہیں؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کا وہ معاشرہ اِسی انداز کا پرستار اور اِسی اسلوب کا دل دادہ تھا۔ چکبست کے الفاظ میں: "اودھ پنچ کے پہلے رجب علی بیگ سُرورؔ کے طرزِ تحریر کی پرستش ہوتی تھی" [مضامینِ چکبست، انڈین پریس الہ آباد، سالِ طبع: ۱۹۴۰ء، ص ۲۲۹]۔

زمانہ بدل گیا، ذہن بدل گئے، اندازِ نظر بدل گیا؛ اِن بہت سی تبدیلیوں کے باوصف یہ کتاب اپنی حیثیت کو اب بھی برقرار رکھے ہوئے ہے [کلاسکی ادب کی شاید یہ سب سے بڑی پہچان ہوتی ہے] اب بھی یہ چھپتی رہتی ہے اور پچھلی تین دہائیوں میں تو اِس کے متن کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کئی قابلِ ذکر کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ مصنّف کے زمانے سے اب تک یہ کتاب اِتنی بار اور اِتنے اہتمام کے ساتھ چھپی ہے کہ داستانی سلسلے کی کم کتابیں اِس باب میں اِس کی برابری کا دعوا کر سکتی ہیں۔ باغ و بہار سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں، رُخِ روشن کے آگے شمع کون رکھے گا؛ اُس کو چھوڑ کر، اِس انداز کے باقی سبھی داستانی قصّوں کو ادبی حیثیت سے بھی اِس کے برابر شاید ہی رکھا جا سکے۔

اِس کتاب کو [ایسے باقی قصّوں کے مقابلے میں] ایک اور افضلیت بھی حاصل ہے، کہ اِس کی حیثیت صرف ادبی نہیں، تاریخی بھی ہے اور یہ تاریخی حیثیت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی دبستانی بحث کے فروغ میں اِس کا حصّہ بہت زیادہ ہے۔ سُرورؔ نے دیباچے میں میر امّنؔ اور دہلی، دونوں کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اُس نے باضابطہ اعلانِ جنگ کا کام کیا۔ دنوں تک یہ بحث چلتی رہی اور اب بھی اُس کی بازگشت سُنائی دے جاتی ہے [مثلاً جوشؔ ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی میں پچھلے دنوں جو بحث چلی تھی، اُس میں اِس پُرانے جھگڑے کا بھی حوالہ موجود ہے۔۔ رسالۂ نقوش (لاہور) کے "ادبی معرکے نمبر" میں اِسے دیکھا جا سکتا ہے]۔

یہاں ضمنی طور پر [اور بہ طورِ جملۂ معترضہ] یہ وضاحت ضروری ہے کہ دہلی و لکھنؤ کا جھگڑا فسانۂ عجائب سے شروع نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ یہ کتاب نہ لکھی جاتی، تب بھی اختلافات اُبھر کر سامنے آتے ضرور۔ اصلاً یہ سیاسی قضیہ تھا۔ نواب شجاعُ الدولہ کے زمانے ہی سے اختلافات کی بنیاد گہری ہونے لگی تھی۔ پھر جب نواب غازیُ الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے پر بادشاہت کا اعلان کیا، اُس وقت سے وہ جو ایک ظاہری پردہ سا تھا، وہ بھی اُٹھ گیا۔ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اختلافات کی نمود شدت اور وسعت کے ساتھ تہذیبی اور ادبی سطح پر ہوئی۔ چوں کہ سیاسی سطح پر مقامی حکومت اگرچہ نام کی خودمختار تھی، لیکن عملی طور پر وہ بے اختیاری کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف وہ نیا معاشرہ اپنے امتیاز اور اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کا بے طرح آرزومند تھا؛ اِس لیے تہذیبی اور ادبی سطحوں ہی پر ایسے اختلافات کی نشوونما ہونا تھی، اور یہی ہوا۔ ادبی سطح پر اختلافات نے زیادہ شہرت پائی [دریائے لطافت میں سیّد انشا نے جہاں دہلی و لکھنؤ کا موازنہ کیا ہے، وہاں بینَ السطور بہت کچھ پڑھا جاسکتا ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ذہنوں میں کس طرح کے خیالات نشوونما پارہے تھے]۔

دہلی والوں کو اپنی زبان اور اپنی ادبی روایت پر بہت ناز تھا۔ اُس وقت تک سند بھی وہیں سے لی جاتی تھی۔ اگرچہ اُجڑی ہوئی دہلی سے ترکِ وطن کرکے اِس شاد و آباد مملکت میں بہت سے دہلی والوں کو پناہ لینا پڑی تھی؛ اِس کے باوجود وہ "مہاجرین" یہاں والوں کو "پورب والے" کہتے تھے، اُن کی نظر میں نہ یہاں کی تہذیبی روایت کی کوئی حیثیت تھی اور نہ یہاں کی زبان کی۔ وہ اب تک اِس مملکت کو اُسی نظر سے دیکھتے تھے، جس نظر سے ایک خودمختار سلطنت اپنے کسی زیرِنگیں علاقے والوں کو دیکھا کرتی تھی۔ مرزا غالب نے اپنی پنشن کے قضیے میں کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں بھی قیام کیا تھا۔ اُس وقت غازیُ الدین حیدر "نواب وزیر" نہیں، اودھ کے بادشاہ تھے اور معتمدالدولہ آغا میر اُن کے وزیرِاعظم اور نائبُ السلطنت تھے۔ مرزا صاحب اُن سے ملاقات کے خواہش مند ضرور تھے، اُن کی مدح میں قصیدہ بھی کہہ رہے تھے، ایک فارسی نثر بھی لکھی تھی، اور ایک

غزل میں تین شعر بھی مدحیہ انداز کے کہے تھے، جس کے دوٗ شعر یہ تھے :

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے، ہم کو

لائی ہے معتمد الدّولہ بہادر کی امید[1] — جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

غرض ملاقات طے ہوگئی، لیکن ہو نہیں پائی۔ وجہ یہ ہوئی کہ "مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دوٗ شرطیں ایسی پیش کیں، جو منظور نہ ہوئیں : ایک تو یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے" [یادگارِ غالب، طبعِ اوّل، ص ۲۷] یہ در اصل اُسی روایتی احساسِ برتری کا مظاہرہ تھا۔ آپ دیکھیے تو مرزا صاحب مالی امداد کے متمنی ہیں، چاہتے ہیں کہ صلہ ملے، ضرورت مند بھی ہیں، لیکن "ملاقات" کے لیے اپنی طرف سے یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ وزیرِ اعظم اُن کی تعظیم کریں۔ اور وہ وزیرِ اعظم کی خدمت میں دستور کے مطابق نذر پیش نہیں کریں گے۔ نذر پیش کرنے کا مطلب ہوتا ہے بالادستی اور برتری کا اعتراف اور اظہار؛ مرزا صاحب اِس کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ تھی نا عجیب، بل کہ عجیب تر بات! بات وہی تھی کہ دہلی والے آخر تک یہی سمجھتے رہے کہ بادشاہت تو دہلی میں تھی اور وہیں ہے[2]۔ یہاں والوں کو تو سندِ حکومت اُسی دربار سے ملتی رہی ہے۔

بادشاہت کی طرح زبان کا مرکز بھی دہلی کو مانا جاتا تھا، سند بھی دہلی والوں سے لی جاتی تھی۔ اِس کا ردِ عمل تو ہونا تھا۔ سُرورؔ نے دہلی اور میر امّن کے متعلق جو کچھ لکھا، اُس کو اِس ردِّ عمل کے فروغ میں بڑا حصّہ مل گیا اور اِسی نسبت سے شہرت ملی۔ یہ واقعہ ہے کہ سُرورؔ سے پہلے لکھنؤ کے کسی ادیب اور شاعر نے [اور اِس میں ناسخؔ بھی شامل ہیں] دہلی اور اہلِ دہلی کی لسانی بالادستی اور وہاں کی یکتائی اور استناد سے اِس طرح علی الاعلان انکار نہیں کیا تھا[3]۔ احتشام صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

---

[1] بعد میں مرزا صاحب نے اِس مصرعے کو اِس طرح بدل دیا : لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ۔ متداول دیوان میں یہ اِسی طرح ہے۔ [2] میر مہدی مجروحؔ نے مرزا غالبؔ کو جو یہ لکھا تھا کہ: "اگر شرم آئے تو رجب علی سرورؔ کو آئے .... اُن سے کہنا چاہیے کہ اے بندۂ خدا، خدا سے ڈر! لکھنؤ کس بادشاہ کا دار الخلافہ رہا ہے؟" ——— [رجب علی بیگ سرور، ص ۲۵۴] تو یہ اِسی طرف اشارہ تھا۔

[3] "عہدِ دولتِ بابر شاہ سے تا سلطنتِ اکبر ثانی، کہ مثل مشہور ہے: نہ چولھے آگ، نہ گھڑے میں پانی، دہلی

"تاریخی اعتبار سے سرور کی ادبی زندگی لکھنؤ کے اُس عہد سے تعلق رکھتی ہے جب وہاں برائے نام سہی، ایک خود مختار بادشاہت قائم ہو چکی تھی اور وہ اپنی زبان، ادب، معاشرت اور طرزِ فکر میں دہلی سے آزادی حاصل کر رہا تھا۔ لسانی اور ادبی خود مختاری کی خواہش نے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر، لکھنؤ اور دہلی کے اُس فرق کو اور زیادہ نمایاں کر دیا جس کے ہلکے نقوش اُس سے پہلے ہی اُبھرنے لگے تھے۔ رجب علی بیگ سرور کو اس حیثیت سے نئے لکھنوی ادب کا پہلا اہم نمایندہ کہا جا سکتا ہے، جس نے نہ صرف ایک مخصوص اسلوب پیش کر کے اُس تفریق اور خود مختاری پر مُہر لگا دی،

پچھلے صفحے کے حاشیے کا بقیہ:

کی آبادی ویران تھی .... یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی، نہ اب تک وہاں ہے" (ص ۱۸)۔ یعنی قصہ ہی ختم کر دیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

اِس سلسلے میں عام طور پر وہ عبارت نظر میں رہتی ہے جس میں میر امّن کا نام آیا ہے: "اِس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویِ اُردو زبان پر لائے .... اپنے منہ سے دھنّا بائی" (ص ۳۰) لیکن واقعہ یہ ہے کہ پورا "بیانِ لکھنؤ" اِسی جذبے سے بھرا ہوا ہے۔ جگہ جگہ یہ جذبہ، جذبۂ بے اختیار بن کر سطح پر اُبھر آیا ہے اور بین السطور سے اُبھر کر شاملِ سطور ہو گیا۔ مثلاً جب وہ لکھنؤ کی تعریف میں یہ لکھتے ہیں کہ: "جو گفتگو لکھنؤ میں کو بہ کو ہے؛ کسی نے کبھی سُنی ہو، سُنائے۔ لکھی دیکھی ہو، دکھائے"۔ "لکھی دیکھی ہو" سے بھی صاف اشارہ میر امّن کی طرف ہے۔ یا مثلاً: "اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں، کسی شہر کے ایسے ہفت ہزاری ہیں" (ص ۱۹) "کسی شہر" سے صاف صاف دہلی مراد ہے کہ ہفت ہزاری کا منصب وہیں سے ملا کرتا تھا۔ یا مثلاً ص ۸ پر "گومتی میں غوطہ لگایا، دیہاتی پن کے دھبّے دھو گئے، آدمی ہو گئے" میں بھی کنایہ موجود ہے۔ یہاں "گومتی" "جمنا" سے بڑھ گئی ہے۔ "بیانِ لکھنؤ" کا اصل مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ لباس، کھانے وغیرہ معاشرت کے جملہ مظاہر میں لکھنؤ کی افضلیت اور یکتائی کو اِس طرح بیان کیا جائے کہ یہ صاف صاف معلوم ہو جائے کہ اب یہ شہر دہلی پر افضلیت رکھتا ہے اور یہ بھی کہ فصاحت و بلاغت کی ٹکسال بھی اب یہیں ہے۔ ناسخ کے لیے اُنھوں نے جو یہ لکھا ہے کہ "شیخ امام بخش ناسخ نے .... روزمرّے کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلامِ سابقین منسوخ ہوا" (ص ۱۳) تو مطلب اِس کا یہی ہے کہ وہ دَور ختم ہوا جب زبان و شعر میں سند دہلی والوں سے لی جاتی تھی۔

بلکہ واضح طور پر دہلی کے ادبی انداز کو سخن گسترانہ چشمک کا موضوع بھی بنایا۔ اِس حیثیت سے بھی سرور کا مطالعہ بڑی تنقیدی اہمیت رکھتا ہے۔"

[رجب علی بیگ سرور، ص ۱۴]

جس طرح ناسخ کی شاعری کی اندرونی فضا اور اُس کا مزاج لکھنؤ کی اُس نئی معاشرت کا آئینہ دار ہے؛ اُسی طرح سرور کی نثر، آرایش پسندی کے وسیلے سے اُس معاشرت کے انداز و اطوار کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ناسخ اور سرور دونوں اپنے اسالیبِ بیان کے واسطے سے دبستانِ لکھنؤ کے نمایندہ افراد ہیں۔ ایک کی شاعری، لکھنؤ کی نئی شعری روایت کا نقطۂ آغاز بنی اور دوسرے کی نثر [فسانۂ عجائب کی صورت میں] وہاں کے خاص انداز کا پہلا نقش بن کر سامنے آئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شعری روایت نے بہت فروغ پایا اور وہ ایک زمانے تک مثال اور معیار بنی رہی۔ ناسخ نے کبھی اِس کا باضابطہ اعلان نہیں کیا؛ لیکن اُس مملکت کے لیے، جسے نئی نئی بادشاہت ملی تھی، نئی شعری روایت اور نئے لسانی تصور کی بنیاد رکھی۔ نئی حکومت کے لیے جس طرح نیا سکّہ ضروری ہوتا تھا، اُسی طرح اُس نئے معاشرے کو نئی ادبی روایت کی بھی ضرورت تھی؛ جو اُس کی پہچان بھی ہو اور جو اُس علاقے کو، ایک دوسرے علاقے کی ادبی بالادستی سے بھی چھٹکارا دلاکر مستقل لسانی مرکز کی حیثیت دلا سکے۔ یہ تاریخ ساز کام تھا۔ اِس میں ناسخ اور سرور دونوں شریک تھے، البتہ ناسخ کی حیثیت شریکِ غالب کی تھی۔

فسانۂ عجائب سے جس نثری روایت کا آغاز ہوا تھا، اُس نے شہرت تو بہت پائی، صحیح معنی میں قبولِ عام بھی پایا، وہ بھی مثال اور معیار بن کر ذہنوں کو متاثر کرتی رہی؛ لیکن شعری روایت کے مقابلے میں اُس کے اثرات کی حکم رانی کی مدت کم رہی۔ اِس فرق کے باوجود تاریخِ ادب میں اِن دونوں روایتوں کے اثرات ہمیشہ کے لیے اِس طرح محفوظ ہوگئے ہیں کہ اُن کو معلوم کیے بغیر، اُن کو سمجھے بغیر اور اُن کا جائزہ لیے بغیر تاریخِ ادب کے اُس پورے باب کو نہیں سمجھا جاسکتا جو دبستانِ لکھنؤ سے متعلق ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ فسانۂ عجائب کی اہمیت اپنی جگہ پر برقرار ہے اور رہے گی۔

سُرور کا خاص انداز

جیسا کہ میں نے کہا ہے، قافیہ بندی سُرور کی تحریر کا خاص جوہر ہے۔ اُن کا پسندیدہ انداز تو یہ ہے کہ کبھی ایک ٹکڑے اور کبھی دو یا زیادہ ٹکڑوں کے بعد وہ ٹکڑا آتا ہے جس پر قافیے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ایک ہی جملے میں [وہ چھوٹا ہو یا بڑا] قافیہ بندی کا حُسن موجود ہے، یا کئی جملے کسی فصل کے بغیر قافیہ بندی کی بہار دکھاتے ہیں۔ زیادہ مثالوں کی تو گنجائش نہیں، میں پہلے عبارت کا ایسا ٹکڑا پیش کرتا ہوں، جس میں یہ تینوں انداز موجود ہیں:

"یہاں نیند کہاں۔ جی سینے میں بے قرار، پہلو میں وہ خار۔ ہر دم آہِ سرد دلِ پُر درد سے بلند۔ چشمہ چشم جاری، فریاد و زاری دو چند۔ جگر میں سوزِ فراق نہاں، لب سے دودِ پنہاں عیاں، سینہ مجمر، دل و جگر سپند۔ یہ رباعی برزباں" [ص ۶۵]

پہلا ٹکڑا مسجّع بھی ہے اور مقفّا بھی اور خوب ہے۔ یہی ٹکڑا قافیہ بندی کی بنیاد بنتا ہے، یعنی آخری لفظ بنیادی قافیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے بعد دو ٹکڑے آتے ہیں جو "بے قرار" اور "خار" کے واسطے سے ہم قافیہ ہیں، اِن درمیانی دو ٹکڑوں کے بعد تیسرا ٹکڑا آتا ہے، جس میں پہلے ٹکڑے کی رعایت سے "بلند" قافیہ بندی کا حُسن چمکا رہا ہے۔ پھر دو ٹکڑے آتے ہیں، جن میں سے پہلے ٹکڑے میں بیان کا توازن "جاری" اور "زاری" کے واسطے سے برقرار رکھا گیا ہے۔ اِس کے بعد ایک ٹکڑا آتا ہے جو "دو چند" پر ختم ہوتا ہے اور اِس طرح "بلند" سے قافیہ بندی کا پہلو روشن ہو اُٹھتا ہے۔ اِس کے بعد دو ٹکڑوں کے آخر میں "نہاں" اور "عیاں" آتے ہیں، جو بنیادی قافیے کی طرف سے توجہ کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ یہ بھی دیکھیے کہ اِس عبارت کے پہلے ٹکڑے "یہاں نیند کہاں" کی رعایت سے اِس ٹکڑے میں بھی وہی انداز موجود ہے "دودِ پنہاں عیاں" یعنی دونوں لفظ ہم قافیہ ہیں۔ یہ گویا وزن کو سنبھالنے اور بیان کے تناسب کو برقرار رکھنے کی نہایت کام یاب اور فن کارانہ کوشش ہے۔ اِن کے بعد پھر دو ٹکڑے آتے ہیں، یہ دونوں ہم قافیہ نہیں، مگر دوسرا ٹکڑا "سپند" پر ختم ہوتا ہے، جو عبارت کے چوتھے ٹکڑے کے "بلند" اور چھٹے ٹکڑے

"دوچند" کا ہم قافیہ ہے اور اس طرح بنیادی قافیے کا آہنگ ذہن کو تناسب اور توازن کے احساس سے خالی نہیں ہونے دیتا اور توجہ کو پوری طرح منعطف رکھتا ہے۔ اِس عبارت کا اختتام جس ٹکڑے پر ہوتا ہے، وہ پہلے ٹکڑوں کی طرح دُو اجزا کا مجموعہ نہیں، یہاں ایک ہی جز ہے، مگر اس کے آخر میں "برزباں" آتا ہے، جو پہلے ٹکڑے کے بنیادی نقط "کہاں" کے آہنگ کو دُہراتا ہے۔ اِس ٹکڑے میں ایک ہی جز کا ہونا فن کارانہ اندازِ نگارش کا اچھا نمونہ ہے، کیوں کہ اس طرح ذہن میں ابتدائی اور بنیادی آہنگ کی جھنکار اچانک اور پورے دباو کے ساتھ گونج اُٹھتی ہے۔ اگر یہاں بھی دُو ٹکڑے ہوتے، تو یہ جھنکار اِس قدر پُرشور نہ ہو پاتی، آہنگ تقسیم ہو کر کچھ ہلکا ہو جاتا۔

(۲) ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھیے: "اَور تو اَور شُہدا پیرِ بخارا کا 'بُما سا' سیدالشُہدا کا شیدا" [ص ۱۶]۔ "شُہدا"، "شُہدا"، "شَیدا" میں صنعتِ تجنیس نے بیان کا جو حُسن پیدا کیا ہے، اُسے صحیح معنی میں اُسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب پڑھنے والا اِس طرزِ ادا سے واقف ہو اور اُس کا ذہن اِس کے پیدا کیے ہوئے حُسن اور لطف کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہو۔ یہ تبھی ہو گا جب کلاسکی اسالیب سے واقفیت ہو۔ اِس ایک ٹکڑے میں تجنیس کے تین روپ نمایاں ہیں، اِنھیں معلوم اور محسوس کیے بغیر اِس کو نہ تو پورے طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اِس سے لُطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ یہ احوال ہے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا، اِس سے صورتِ حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سرورؔ کی نثر کا حُسن۔ مزید مثالوں کی یوں ضرورت نہیں کہ ایک تو یہاں گنجایش نہیں، دوسرے یہ کہ اِس اشارے کی روشنی میں پڑھنے والا خود ہی ایسے اجزا کو منتخب کرتا چلا جائے گا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اِس کتاب میں ایسے اجزا کی کمی نہیں جن میں مرصّع سازی کا کمال نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے؛ مگر بات وہی ہے کہ نگارش کے اِس انداز اور ترصیع کے اِس فن اور حُسن کو سمجھنے کے لیے ذہن کا تربیت یافتہ ہونا اور کلاسکی اسالیب سے واقفیت ضروری ہے؛ ورنہ یہ سب بے جان لفظوں کا کھیل نظر آئے گا۔

معلوم نہیں یہ خیال ذہنوں میں کیسے سماگیا اور دلوں میں بیٹھ گیا ہے کہ فسانۂ عجائب کی نثر بہت مشکل ہے۔ مشکل نثر کا معیار اگر نوطرزِ مرصّع کو مانا جائے، تو پھر اِس کتاب کو تو آسان تر کہا جائے گا۔ مشکل نثر کی مثال میں اکثر اِس کتاب کے وہ مقامات پیش کیے جاتے ہیں جہاں سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے، یا ضمنی کہانیاں یا نئے بیانات شروع ہوتے ہیں یعنی تمہیدی مقامات؛ اور یہ بڑی ناانصافی ہے۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی، اُس زمانے میں قصّوں کی تمہید بہت پُرتکلّف انداز کی ہوا کرتی تھی۔ طلسمِ ہوش رُبا کی زبان کو کون مشکل کہے گا، لیکن تمہیدی مقامات اُس میں بھی پُرتکلّف اندازِ بیان سے خالی نہیں۔

تمہیدی حصّوں سے قطعِ نظر کو روا رکھا جائے، تو پھر یہ معلوم ہوگا کہ اِس کتاب میں زبان اور بیان کے بہ طورِ عموم دو رنگ پائے جاتے ہیں۔ کہیں تو ایسا صاف شفاف بیان ہے کہ آج کے اوسط درجے کی استعداد رکھنے والے قاری کو بھی اُس کے پڑھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ خاص کر جہاں مکالمات ہیں، وہ مقامات تو بیان کی شگفتگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ دوسرا انداز وہ ہے جہاں علمیت کا رنگ ذرا گہرا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے مقامات پر بیان کا انداز وہی ہے جو متاخر ہندستانی فارسی نثرنگاروں کے اثر سے رواج پاگیا تھا۔ ایسے مقامات اگر آج ہمیں کچھ مشکل نظر آتے ہیں، تو اِس کی اصل وجہ یہ نہیں کہ یہ بجائے خود مشکل ہیں؛ اِس کی اصل وجہ ہے ہمارے دَور کی عمومی کم استعدادی، فارسی زبان سے ناواقفیت اور کلاسکی اسالیب سے کم آشنائی۔ مصنّف جس معاشرے کا فرد تھا، اُس معاشرے کے اُن لوگوں کے لیے جو لکھنے پڑھنے سے تعلق خاطر رکھتے تھے، یہ طرزِ ادا غیر معمولی نہیں تھا۔ مصنّف نے اپنے زمانے کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، اِس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی اِسی سلسلے میں کہنے کی ہے کہ سُرورؔ نے جہاں شادی بیاہ کا یا شاہی جلوس کا احوال لکھا ہے، یا ایسے ہی اور بیانات لکھے ہیں جن میں مختلف اشیا کے نام آتے ہیں؛ تو ایسے مقامات بھی آج ہم کو مشکل نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی اصل وجہ یہ نہیں ہوتی کہ بیان میں کسی طرح کی پیچیدگی ہے یا زبان مغلق ہے؛ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ آج ہم اُن بہت سی اشیا سے

واقف نہیں جن کے نام لکھے گئے ہیں اور جن سے متعلق تفصیلات لکھی گئی ہیں۔ یعنی یہ بھی حقیقی مشکل نہیں، اِس میں ہماری ناواقفیت کا عمل دخل ہے۔

یہ تو بالکل درست ہے کہ زبان کے لحاظ سے باغ و بہار کو اگر معیار مان لیا جائے تو پھر یہ کتاب اُس معیار پر پوری نہیں اُترے گی؛ لیکن یہ عمل بجاے خود سراسر مصنوعی ہوگا۔ دو بالکل مختلف چیزوں کو مقابل رکھ کر، ایک کو برتر بتانا قرینِ انصاف نہیں ہو سکتا۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح باغ و بہار نے ایک اسلوب کی تشکیل کی تھی، اُسی طرح فسانۂ عجائب نے بھی ایک مختلف اسلوب کی تشکیل کی تھی۔ اپنے اپنے دائرے میں یہ دونوں اسالیب مستقل حیثیت کے مالک ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سُرور کے زمانے میں لکھنؤ کے اُس معاشرے میں معیاری حیثیت اُسی اسلوب کو حاصل تھی جسے سُرور نے اختیار کیا۔

یہاں محض ضمنی طور پر عرض کروں کہ سُرور نے جن مقامات پر شاہی جلوس کا احوال لکھا ہے، یا شادی بیاہ کا ذکر کیا ہے، اور اُس کے ذیل میں رسموں اور ٹونکوں کا بیان آگیا ہے، یا جیسے ابتداے داستان میں جوتش کی اصطلاحوں کا مفصّل تذکرہ آیا ہے جوتشیوں ہی کی زبان میں، یا مثلاً چڑیمار اور اُس کی بیوی کی گفتگو لکھی ہے، جس میں اِس پیشے کے بہت سے اصطلاحی لفظ بھی آگئے ہیں، یا جہاں کوہِ مطلب برآر کے جوگی کا بیان کیا ہے؛ تو ایسے سارے مقامات پر دو تین باتیں بہ طورِ خاص توجّہ طلب ہیں: مثلاً جہاں شاہی جلوس کا بیان ہے، تو وہاں مختلف پوشاکوں، ہتھیاروں، عہدے داروں کے اِس قدر نام آئے ہیں اور اِن سے متعلق اِس قدر تفصیلات معرضِ بیان میں آئی ہیں کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اِس شخص نے واقعتاً شاہی جلوس دیکھے تھے اور اُن کی تفصیلات کے عکس اِس کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ اِن تفصیلات اور اِن کے داستانی بیان میں مرقّع نگاری کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جلوس کا وسیع و عریض مرقّع وجود میں آجاتا ہے، ہم جلوس کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں؛ یہ معمولی کمال نہیں۔ پھر یہ بات کہ ایسے مقامات پر ہر جگہ زبان صاف اور بیان شفّاف ہے۔ اغلاق اور اشکال کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ

آج ہماری ناواقفیت، بل کہ آسان پسندی اور اس سے بھی بڑھ کر وہ جو کم فرصتی سے زیادہ عجلت پسندی کا رجحان ہمارے ذہنوں میں سما گیا ہے؛ یہ سب مل کر ہمیں اِس مغالطے میں مبتلا کر سکتے ہیں کہ یہ تو بہت مشکل بیان ہے۔ عورتوں کے مکالمے تو ایسی شفاف زبان میں لکھے گئے ہیں کہ نواب مرزا شوق کی مثنوی کے کچھ شعر یاد آجاتے ہیں۔ جوگی کی کُٹیا کا حال اور "بیانِ لکھنؤ" میں لکھنؤ کے فن کاروں اور پیشہ وروں کا بیان؛ ایسے سارے مقامات پر اندازِ بیان میں علمیت کا رنگ تو ہے، مگر گہرا نہیں، ایسا نہیں کہ اوسط درجے کی استعداد والا اُن کو نہ سمجھ سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مشکل مقامات اِس میں ہیں ہی نہیں، ہیں اور ضرور ہیں؛ لیکن اُن کی تعداد زیادہ نہیں۔

تیسری خاص بات جو ہمہ وقت نظر میں رکھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ سرور نے داستان لکھی تھی، ناول نہیں لکھا تھا؛ اور وہ داستان، فورٹ ولیم کالج یس کل کرسٹ کے جدید ذہن اور نئے اندازِ نظر کے بنائے ہوئے خاکے کے تحت نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ داستان لکھنؤ کے اُس معاشرے کے لیے لکھی گئی تھی جہاں داستان سرائی کی روایت کو پسندیدگی کی سند حاصل ہو رہی تھی اور جہاں مرصع سازی کو کمالِ فن سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ جو مثلاً سردی کے بیان میں بہت سی تشبیہیں آگئی ہیں یا استعارے آگئے ہیں، یا مثلاً کھانوں وغیرہ کے بیان میں بہت سے نام پے در پے آتے ہی چلے جاتے ہیں تو یہ داستان سرائی کا خاص انداز ہے۔ اِس کو سمجھے بغیر ایسے مقامات کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔

یہاں چوں کہ لسانی تجزیہ مقصود نہیں، اِس لیے اِنھی اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ضرورت اِس کی ہے کہ ایک مستقل موضوع کے طور پر کوئی واقف کار اِس کتاب کی نثر کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے اور "عیب و ہنر" دونوں کی تفصیلات مرتب کرے۔ [میں یہ بات اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اِس میں اُس "ہنر" کا پلّہ بھاری نکلے گا جو (اِس زمانے میں نہیں) اُس زمانے میں کمال کی نشانی تھا اور جسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور جس کے تجزیے سے آج ہم میں سے بہت سے لوگ شاید صحیح طور پر عہدہ برآ بھی نہ ہو سکیں]۔ یہ ضمنی گفتگو ختم ہونے کو آئی؛ لیکن اِسے ختم کرنے سے پہلے، اِسی سلسلے میں عزیز احمد کا

ایک اقتباس ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں :

"طلسماتی داستانوں کے دور میں اور اس کی پیداوار کے طور پر کم سے کم ایک کتاب ایسی ظہور میں آئی جو ناول سے بہت قریب ہے، یہ مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب ہے۔ تین خصوصیتیں اِسے طلسمِ ہوش رُبا اور بوستانِ خیال جیسی داستانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ پہلی تو اس کا اختصار.... دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ گرد و پیش کے ماحول سے بھی متاثر ہے.... تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنّف قصّے سے زیادہ زبان و اسلوب پر توجہ دیتا ہے اور زبان کی داد چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت بہت ہی اہم ہے کہ مصنّف نے اسلوب کو کتاب کی دل چسپی کی جان بنانا چاہا ہے اور اس طرح رتن ناتھ سرشار کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے.... سرشار کے یہاں بھی... اصل دل چسپی قصّے سے زیادہ زبان میں، واقعات سے زیادہ بیان میں اور عمل سے زیادہ مکالمے میں ہے۔" [ترقّی پسند ادب، بہ حوالۂ رجب علی بیگ سرور، ص ۲۳۱]

فسانۂ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعایتوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اِس میں اُن کی "کم مشقی" کا دخل کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی دوسری کتاب ترجمۂ الف لیلہ کو دیکھیے، جس کا نام شبستانِ سرور ہے؛ اُس میں ایسی خامیاں اور اِس طرح کا کچا پن نہ ہونے کے برابر ہے۔

رعایتِ لفظی سرور کی نثر کا عام جوہر ہے اور قافیہ بند جملے لکھنا اُن کا خاص انداز ہے۔ اِس میں بجائے خود کچھ ایسی خرابی نہ تھی؛ مگر لفظی رعایت کے شوقِ بے حد اور قافیہ بندی کے شوقِ بے نہایت نے کچھ مقامات پر عبارت میں خرابی بھی پیدا کر دی ہے۔ داستانی انداز یوں ہی تفصیل بل کہ طوالت کا طلب گار رہا ہے۔ داستان میں ایجاز اور اختصار کو دخل حاصل نہیں ہوتا، اُس کے بیان کا بڑا حصّہ بے مزہ بن کر رہ جائے اگر اُس میں مختلف مناظر، اشیا، جذبات وغیرہ کے سلسلے میں تفصیل نگاری اور آرایش پسندی سے کام نہ لیا جائے؛ لیکن سرور کے یہاں تفصیل نگاری کے ذیل میں بعض اوقات لفظی رعایت

کے ایسے بھدّے ٹکڑے بھی آجاتے ہیں جو عبارت کو بے کیف بنا دیتے ہیں۔ مثالوں کی تو یہاں گنجایش کم سے کم ہے، آپ صرف بہ طورِ مثال اُس حصّے کو دیکھیے جہاں جانِ عالم انجمن آرا کو ساتھ لے کر بادشاہ سے رخصت لیتا ہے اور عازمِ وطن ہوتا ہے [ص ۱۷۸ سے ص ۱۸۵ تک]۔ رعایتِ لفظی اور قافیہ بندی کے شوقِ فضول نے کئی جگہ بدمزگی پیدا کردی ہے۔ صرف ایک مثال: "پھر شکار کا سامان میر شکار لائے ۔۔۔ چیتے، جو دشمنوں کا بُرا چیتے، بلکہ لہو پیتے۔ سیاہ گوش در آغوش۔ ہرن لڑنے والے، خانہ زاد، گھر کے پالے" [ص ۱۸۱] ایسے کئی جملے اِس بیان میں مل سکتے ہیں [اِس کے باوجود، اِس بیان میں شاہی ساز و سامان کا جیسا بیان ہے، مختلف شاہی کارخانوں کا جیسا احوال سامنے آتا ہے اور سامانِ سفر کا جس طرح بیان ہوا ہے؛ یہ سب بھی اپنی جگہ پر حیرت آفریں اور ہوش رُبا ہیں۔ شاہی سامان کا تو کیا ذکر، معمولی اشیا اور افراد کا تذکرہ آج ہمارے لیے معلومات بخش بھی ہے اور حیرت آفریں بھی۔ مثلاً سقّوں کا بیان: "اِن کے بعد ہزارہا سقّا، خواجہ خضر کا دم بھرتا، پھڑ کا ذکر تا۔ کمر میں کھاروے کی لنگیاں، شانوں پر بادلے کی جھنڈیاں، مشکوں میں بیدمشک بھرا، دہانے میں ہزارے کا فوّارہ چڑھا ..."]

یا مثلاً سردی کے بیان کو دیکھیے، جو ص ۳۲۶ سے ص ۳۲۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس بیان کے متعدد ٹکڑوں کو غیر ضروری اور غیر متناسب لفظی رعایتوں اور قافیہ بندی کے ہوکے نے بے مزہ بل کہ بدمزہ بنا دیا ہے۔ صرف دو جملے بہ طورِ نمونہ کافی ہوں گے: "اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اُولا تھا، پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا"۔ "بندوق میں لاگ نہ تھی، چانپ کے پتھروں میں آگ نہ تھی، تُوڑا ہر ایک گُل تھا، تُوتے کی جگہ شورِ بلبل تھا۔"

رشید حسن خاں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِہۡرًا ؕ وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیۡرًا ۝

سزاوارِ حمد و ثنا خالقِ ارض و سما، جَلّ وَعلا، صانعِ بےچون و چرا ہے؛ جس نے رنگِ بے ثباتی سے، بہ ایں رنگا رنگی، تختۂ چمنِ دُنیا پُر از لالہ و گُل جُزو و کُل بنایا۔ اور باوُجودِ ترسِ باغبان و بیمِ صیّاد، وَلولۂ رُخِ گُل بلبل کو دے کر دامِ مَحبّت میں پھنسایا۔ اور عاشقِ باوَفا و معشوقِ پُر دَغا کو ایک آب و گل سے خَمیر کر کے، پردۂ غَیب سے بہ عَرصۂ شُہوُد لایا۔ ایک خِلقَت سے دُو طرح کا جلوہ دکھایا اور انسانِ ضعیف بُنیان کو اَشرفُ المخلوقات فرمایا۔

جلوۂ حُسنِ بُتاں بہ خُدا شیفتگی کا بہانہ ہے۔ نالۂ بلبلِ شیدا گوشِ گُلِ رعنا کا ترانہ ہے۔ اُس کی نَیرنگیوں کے مشہور فسانے ہیں، ہم اُس کی قدرتِ کامِلہ کے دیوانے ہیں۔ صفت اُس کی مُحال ہے، زبان اِس تقریر سے لال ہے۔ جس کی شان میں مُخبرِ صادقؐ یہ فرمائے، دوسرا اِس عہدے سے کب بَر آئے: مَاعَرَفۡنَاکَ حَقَّ مَعۡرِفَتِکَ۔

عِناں تابیِ اَشہبِ خامہ وادیِ نعتِ رسولِ مُجتبیٰ، محمدِ مُصطفیٰ سزاوارِ اُلوف تحیّت و ثنا میں۔

بعدِ حمدِ خالقِ جِن و بَشَر، حاکمِ قضا و قَدَر، مُبدِءِ شام، طالعِ سَحَر؛ نعت سیّدِ کائنات، خُلاصۂ موجودات، بِہترینِ عالَم، بَرگُزیدۂ نوعِ بَنی آدم کی ہے، جس کے چراغِ ہِدایَت کی رُوشنی سے تیرہ بخت، گُم گَشتۂ کوچۂ ضَلالَت بہ راہِ راست آئے۔ بہ توفیقِ رفیق اور مَدارجِ تحقیق کیا کیا مرتبے بلند پائے۔ اور مُنحَرِف کُور باطنوں کو فہمِ ناقص کی کَجی اور زُعمِ فاسِد، وَہمِ باطل نے کیسے کیسے رُوزِ سیاہ دکھائے۔ اُس کے حق میں یہ حُکمِ حق آیا ہے؛ بہ چشمِ غور دیکھو تو، کسی اَور نے ایسا رتبۂ رفیع اِس خاکدانِ پست بنیاد میں پایا ہے: لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔ سَرِ حلقۂ اَوّلین، خاتَمُ الْمُرسَلین، مظہرِ صنعتِ کریم، اَحمَدِ بے میم، شَفیعِ عرصۂ جزا محمدِ مُصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہِ الطّاہِرِیْن وَاَصْحَابِہِ الْمُکَرَّمِیْن وَسَلَّم۔ کوئی شاعر اُس کی شان میں کہتا ہے، لا اَعْلَم:

پیش از ہمہ شاہانِ غَیور آمدۂ — ہر چند کہ آخر بہ ظُہور آمدۂ
اے ختمِ رُسُل! قُربِ تو معلومم شد — دیر آمدۂ، ز راہِ دور آمدۂ

اِس مُشتِ خاک کا کیا فہم اور اِدراک، جو شمّہ صِفاتِ ذاتِ بابَرکات زَبان پر لائے، جو عَجز میں نہ در آئے۔ کام و زَباں ناکامی سے فورًا جل جائے۔ اور مَنقَبَتِ امیرُ المومنین، اِمامُ المُتّقین، یکّہ تازِ میدانِ لافتیٰ،

خُلاصۂ مضمونِ سوْرَۂ هَلْ اَتیٰ یہی کافی ہے جسے پیمبر نے کہا : لَحْمُكَ لَحْمِیْ وَ دَمُكَ دَمِیْ ۔ عَلِیٌّ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْہُ ۔

اور مَدْحِ اَہلِ بیتِ رِسالت کہ وِلا اُن کی ، ایمان کی دلیل ہے اور محبّت اُن کی ، ہر فردِ بشر کو واجب بہ اِیں حدیثِ جلیل ہے ، حدیث : مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَهَوٰى ۔

زمزمہ پردازی عندلیبِ نغمہ سراکی گلشنِ حالِ سلطان ابوالمظفّر ، شاہِ زَمَن ، قُباد شوکت ، وارثِ دوْدمانِ سعادت میں ۔

پس اَز حمدِ خُدا و نعتِ سَروَرِ اَنْبیا ؛ لازِم و ضرور ہے کہ مَدْحِ والیِ ملک بیان کرے ۔ قَوْلُہٗ تَعالیٰ : اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔ اگرچہ صِفَتِ شاہ گدا کی زبان بہ مَعْرِضِ بیاں لائے ، تو "چھوٹا مُنہ بڑی بات " تمام کائنات کہنے لگے ؛ مگر نامِ نامی ، توصیفِ ذاتِ گرامی اُس کی ، وسیلۂ توقیر اِس تحریر کا اور مِفْتاحِ بابِ اِس پریشاں تقریر کا جان کر ؛ شمّہ اَز شمائل و ذرّہ اَز خورشیدِ خصائل رَقم کرتا ہوں ۔

شاہِ کیواں بارگاہ ، بلند مرتبہ ، عالی جاہ ؛ سَرحلقۂ شاہانِ والاتبار ، جَم شوکت ، فَریدوْں فر ، سُلیمان اِقتدار ؛ کِشوَر گیر ، مُلک سِتاں ، خدیوِ گیہاں ؛ اَبوالمظفَّر ، مُعِزّ الدّین ، شاہِ زَمَن غازی الدّین حیدر

بادشاہِ غازی خَلَّدَ اللہُ مُلْکَہٗ وَسَلْطَنَتَہٗ وَ اَیَّدَہُ اللہُ بِالنَّصْرِ وَالظَّفَر جَلَّ جلالُہٗ۔

اگر معرکۂ رزم یا صحبتِ بزم اُس کی انشا کروں، صفحۂ دنیا پر نہ لکھ سکوں۔ دمِ رزم: رُستم و سام و نریمان مثلِ پیرزال لرزاں۔ اور وقتِ سخا اور عطاے زر و مال: حاتم کے ہاتھ میں کاسۂ سوال۔ بزمِ طرب میں: زُہرہ اور مشتری سرگرمِ نغمہ پردازی و عربدہ سازی۔ ہنگامِ عتاب و خشم: مریخ مستعدِ جلّادی و بیدادی۔ یہ ادنیٰ عنایت ہے، بیت:

چناں بموسمِ سرما دو شالہا بخشید که گرم شد ہمہ بنگالہ، سرد شد کشمیر

بس کہ سحابِ بخشش اُس بحرِ عطا کا روز و شب مزرعۂ کِہ و مِہ پر بارش رکھتا ہے؛ شہر میں سالہا کان مشتاق سائل کی صدا کا اور دیدہ ندیدہ صورتِ گدا کا رہتا ہے۔ بحرِ موّاجِ فیض دن رات بہتا ہے۔ عدل یہ کہ ہاتھی، چیونٹی سے ڈرتا ہے۔ شیر، بکری کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ بہ چشم اُس کے عہدِ دولت میں ہزاروں نے دیکھا ہے: بکری شیر کے بچّے کو شیر پلاتی تھی، کنار میں شفقت سے سُلاتی تھی۔ بازِ تیز پرواز بچّۂ کُنجشک کا دم ساز اور نگہباں۔ بلّی کی عادتِ جبلّی یہ کہ کبوتر سے ہراساں۔ دودِ دلِ اندوہ ناک روزنِ ہر خانہ سے مسدود۔ شحنۂ داد رخنہ بندیِ فساد کو موجود۔ اللہ تعالیٰ اُس اُمیدگاہِ عالم و عالمیاں کو اپنے حفظ و اماں میں سلامت رکھے۔

دَولت خواہ اُس والا جاہ کے بہ عیش و شادی مُدام اور دشمنِ رُو سیاہ بہ رنجِ نامُرادی گرِفتارِ آلام رہیں؛ بہ حقِّ ربِّ ذُوالمِنَن، بہ تَصدُّقِ پنجتَن۔

تقریرِ مؤرّخِ دل پَذیر کی، کیفیت شہرِ بے نظیر کی۔ ذکرِ صنعتِ کاملینِ علم و فن، واقفانِ رُموزِ سُخَن و تذکرۂ اہلِ حرفہ، دُکان دار بہ طرزِ یادگار۔

یہ ہیچ مَداں، مُحرِّرِ داستاں، مُقلّدِ گُذشتگاں، سراپا قصور مرزا رجب علی، تخلّص سُرُور؛ مُتوطّنِ خطّۂ بے نظیر، دل پَذیر، رشکِ گلشنِ جِناں، مَسکَنِ حور و غِلماں۔ جاے مَردُم خیز، باشندے یہاں کے ذکی، فہیم، عقل کے تیز۔ اگر دیدۂ انصاف و نظرِ غور سے اِس شہر کو دیکھے، تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے، ہر بار یہ کہے، شعر:

سُنا، رِضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سُبحَانَ اللہِ وَبِحَمدِہٖ! عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی دل چسپ؛ جو کوچہ ہے، باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طَور کا باوضع، قَطع دار ہے۔ دو رویہ بازار کس انداز کا ہے! ہر دُکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ گو، ہر محلّے میں جہان کا ساز و ساماں مُہیّا ہے؛ پر، اکبری دروازے سے جِلو خانے اور پکّے پُل

تک، کہ صراطِ مُستقیم ہے، کیا جلسہ ہے! نان بائیٔ خوش سلیقہ۔ شیرمال، کباب، نان، نہاری، بلکہ جہان کی نعمت اِس آب داری کی؛ جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دِماغ مُعطّر ہوجائے۔ فرشتہ گُزرے تو سونگھے، مست ہوجائے، غُنودگی میں اونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھنے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سُرخ سُرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سُریلی چھنکار۔ شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ، بھربھری؛ ایک بار کھائے، نانِ نعمت کا مزہ پائے، تمام عُمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔

کباب اِس آب و تاب کے کہ مُرغانِ ہَوا، ماہیانِ دریا کا دل سیخِ آہ پر مُتّصل حسرتِ محرومی سے کباب۔ ادرک کا لچھّا میاں خیرُاللہ کی دُکان کا بال سے باریک کترا، ہاضم، نایاب۔ حُسینی کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن۔ اُس کی شیرینی کی گفتگو میں لَب بند، جہان کو پسند۔ پپڑی لذیذ، دبیز، بسی بسائی، پستہ و بادام کی ہَوائی؛ ہونٹ سے چبائے، دانت کا اُس پر تمام عُمر دانت رہے، لگانے کی نوبت نہ آئے۔ جوزی: خوب۔ حبشی: اہلِ ہند کو مرغوب۔ دودھیا: شیرخوارہ نُوش کرجائے۔

ہر کُنجڑن کی وہ تیکھی چِتوَن: آدمی صورت دیکھتا رہے، رُعبِ حُسن سے بات نہ کرسکے۔ تنگرنیں پری زاد، سَرو قامت، رشکِ شمشاد۔ دُکانوں میں اَنواع اَقسام کے میوے قرینے سے چُنے۔ رُوزمرّے، مُحاورے اُن کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اُٹھی، بیٹھے بِٹھائے قہقہہ مار اُٹھی کہ: ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے! کھانے والو زُود مزہ ہے! کوئی مَوزوں طبیعت یہ فقرہ بَرجستہ

سُناتی، جوبن کی جھمک دِکھاتی: مزہ انگور کا ہے رَنگتَروں میں!
کسی طرف یہ صدا آتی: گنڈیریاں ہیں پَونڈے کی! ایک طرف تنبولی
سُرخ روئی سے یہ رَمز و کنایہ کرتے، بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ
دم بھرتے: مکّے کا مُنہ کالا، مَہوبا گرد کر ڈالا! کیا خوب ڈھولی ہے، ابھی
کھولی ہے۔ عبیر ہے نہ گُلال ہے، اَدّھی میں مُکھڑا لال ہے۔

گلیوں میں گجر دَم یہ آواز آتی: شیرمال ہے گھی اور دودھ کی!
مفلس کا دل اُچاٹ ہے، ٹکوں کی چاٹ ہے۔ کدھر لینے والے ہیں؛
نَمش کی قُفلیاں، کھیر کے پیالے ہیں! کیا خوب بھُنے، بھُر بھُرے ہیں؛
چنے، پرَمل اور مُرمُرے ہیں! جیٹھ بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل
انڈا چھوڑتی؛ دو پیسے کو برف کی قُفلی جمی دو کھائے، بدن تھرّائے۔
زیادہ ہَوکا کرے؛ لقوے، فالج میں مرے۔

سَرِ چوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھِلا، نسیم و صبا کو سیدھا رستہ
نہ ملا۔ شیخ کوَلی کی مٹھائی جس نے کھائی: جہان کی شیرینی سے دل
کھٹّا ہوا؛ بنارس کا کھجلا بھولا، متھرا کے پیڑے کا ٹھٹّھا ہوا۔ برفی
کی نَفاست، بو باس، کھوئے نے ہوش کھوئے۔ وہ اُس کا دَر دَراپَن،
نُقرئی وَرَق کا جوبن؛ کسی اور شہر کا رکاب دار اگر دیکھ پائے، یا ذائقہ لب
پر آئے: زندگی تلخ ہو، جب تک جیتا رہے، ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔
اِمرتیِ مُسلسل کا ہر پیچ ذائقے کو پیچ تاب دیتا، یاقوتیِ مُفرِح کا جواب
دیتا۔ جب مُنہ میں رکھا اَصل تو یہ ہے عَسَلِ مُصفّیٰ جنّت کی نہر کا حلق

سے اُترا۔ پَراچیوں کی گلی کی کھجور : لذّت ٹپکتی، ذائقے میں چوَر، بہتر از انگور؛ نہایت آب و تاب، ہم خُرما ہم ثواب۔

نوؔرا کی دُکان کی بالائی جب نظر آئی، بِلّور کی صفا سے دل مُکدّر ہوا؛ نورٌ علیٰ نور، کہہ کر، بے قند و شکر، شکرِ خدا کر کر چھُری سے کاٹی اور کھائی۔ مَدارِیے حُقّے وہ اِیجاد ہوئے، کَنگر ایسے اُستاد ہوئے کہ جب تڑاقا اُن کا سُنا، پیچوان کا دَم بند ہوا، سب کو پسند ہوا۔ پیسے کا مَداریا کہیں دُنیا میں مَدِّ نظر نہ ہو، دو روپے کو میسّر نہ ہو۔ پٹھانا کا تنباکو مُشک و عَنبَر کی خوش بو؛ جس نے ایک گھونٹ کھینچا، اُسی کا دم بھرنے لگا۔ آغا باقر کے امام باڑے سے مُتّصل جو تنباکو کی دُکان ہے، شائق اُس کا سب جہان ہے۔ محمدی اُس کا نام ہے، تبرّک سمجھ کر لے جاتے ہیں، زبان زدِ خاص و عام ہے۔

رنگ ریز سَبک دست، طبیعت کے تیز۔ جو پھول دِکھایا؛ اُنھوں نے کپڑے پر اُس سے ڈَہڈَہا گُل کِھلایا، نَقل کو اَصل میں مِلایا۔

عَلَی الخُصُوص مردِ تماش بیں کے واسطے یہ شہر خرّاد ہے، ہر فن کا یہاں اُستاد ہے۔ سیکڑوں گھامڑ، بدگِل، کُندۂ ناتراش، زُعمِ باطل میں عیّاش؛ اَطراف و جَوانب سے آ، ہفتے عشرے میں چھِل چھلا وَضع دار ہو گئے۔ گومتی میں غوطہ لگایا، دیہاتی پن کے دھبّے دھو گئے، آدمی ہو گئے۔ ابو تُراب خاں کے کٹڑے میں جا، میاں خیراتی سے کسی کی خیرات میں خط بنوایا؛ بارہ برس کے سِن کی گالوں میں لوچ آئی، گو گردن میں موچ آئی۔ چار پہر کھونٹی

ٹٹولی، پتا نہ پایا۔ کاتبِ قدرت کا لکھا مِٹاتا ہے، ایسا خط بناتا ہے۔

سید حسین خاں کے کٹڑے کے دروازے پر عبداللہ عِطر فروش کی دُکان، جائے نشستِ ہر وضع دار جوان ہے۔ دو پیسے میں بیلے، چنبیلی یا حنا کا تیل، ریل پیل، فتنہ بپا کرنے والا ایسا مَلا کہ سُہاگ کا عِطر گرد ہوگیا، جون پور سے دل سرد ہوگیا۔ عطر کی روئی رکھی کان میں، جا بیٹھا کسی افیونی کی دُکان میں۔ سفید سفید چینی کی پیالیاں خوب صورت، رنگتیں نرالیاں۔ افیون فیض آبادی گلاب باڑی والے لالے کی وہ رنگین جس نے تریاکِ مصر کے نشے کِرکِرے کیے۔ جھمکڑا بادۂ اَرغوانی و زعفرانی کا پیدا، یاقوت رشک سے ہیرا کھاتا۔ تبدیلِ ذائقے کو فرنی کے خونچے، نُقرئی ورق بجے، پستے کی ہوائی پر بادام کا دل دو ٹکڑے ہو کر پِستا۔ یا بنبئی کا پونڈا نرم، گُندہ، قند و شہد کا سینچا۔ اگر پوپلا مسوڑھوں سے چبائے، شربت کا گھونٹ حلق سے اُتر جائے۔ اِدھر چسکی پی، یا اشکِ بُلبُل کا دورِ تسلسُل ہوا؛ آنکھوں میں گُل کِھلا۔ پھر ایک دم کے بعد حُقّے کا دم کھینچا، حجاب کا پردہ اُٹھ گیا۔ وہاں سے بڑھا، کان میں آواز آئی: بیلے کے ہار ہیں شوقین البیلے کو؛ پہن لے، چلا جا فرنگی محل کے میلے کو! جب یہ سج بنی، بگڑا، پنجوں کے بل چلا۔ یہ بھولا، وطن کی چال ڈھال، رہ و رسم بھولا۔ اکثر باہر سے آ، یہ دھج بنا، جون پور کے قاضی ہونے کو مُفتی میں راضی ہوگئے ہیں۔ جمع پونجی پریشان ہو کے کھو گئے ہیں۔

اگر برسات کا موسم ہے تو شہر کا یہ عالم ہے: اِدھر مینہ برسا؛ پانی

جا بہ جا سے بہہ گیا، گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زردوزی جوتا پہن کر پھرے، سلیقہ شرط ہے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ باغ بہار کے صنعتِ پروردگار کے۔ رضوان جن کا شائق، دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشے کا میلا، ہر وقت چین کا جلسہ۔ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا۔ سڑک کے درختوں کی فضا؛ جدھا، کھجوا موجیں مارتا۔ ہار سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا۔ رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک؛ تختۂ لالہ و نافرمان جن پر قربان۔ بندہ ہائے خاص کی سبک روی، خرامِ ناز۔ ہر قدم پر کبکِ دری چال بھول کر جبینِ نیاز رگڑتے۔ شاخِ سروِ شمشاد قامتوں کے رُو بہ رُو نہ اکڑتی۔ شائق ہزار در ہزار، شمع پروانوں کا عالم، غول کے غول باہم۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا، خاص جھولا وہیں پڑا۔ جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا۔ محبت کے پینگ بڑھتے، دیکھنے والے درود پڑھتے۔ باغ میں کوئل، پپیہے، مور کا شور۔ جھولے پر گھٹا رہی اور بھی گھنگھور۔ ساون بھادوں کے جھالے، وہ رنگین جھولنے والے!

دشتِ غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے؛ دل پاش پاش ہو کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کان پور کی برسات، ہیہات، ہیہات! دخل کیا دروازے سے باہر قدم رکھے اور پھسل نہ پڑے۔ گلی میں پاؤں رکھا، کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا۔ دو اِس فصل میں باہم نہ دیکھے، مگر چہلے کے پھنسے۔ اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جائیں کہیں۔

اُن کے حق میں ناحق برسات: حَوالات، گھر: جہل خانہ۔ کیچڑ کے مُقیّد، کہیں جانا نہ آنا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے، تو چونک پڑے کہ پھسل گئے۔ اور جو بازاری، کار باری ہیں، اُن کا یہ نقشہ دیکھا: ہاتھ میں جوتیاں، پائنچا چڑھا، کیچڑ میں لت پت، یہاں گرے، وہاں گرے؛ خُدا خُدا کر جیتے گھر پھرے۔ اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو، شعر:

دیکھی ہے یہ رسم اِس نگر میں　　　جوتا ہے گلی میں، آپ گھر میں

پھر بَر سرِ مطلب آیا، خاص بازار کہ شہرِ وسیع و خوش قَطع ہے، اُس کے نقشے سے مانیؔ و بہزادؔ نے خار کھایا۔ شَبیہ کشی تو کیا، خاکہ خاک نہ کھنچا، ہاتھ تھرّایا۔ کوٹھیاں فَرح بخش و دل کُشا۔ بُرج ہر ایک جہاں نُما۔ سُلطان منزل اور اِستری مَنجَن نَشاط افزا، تَوبہ شِکن۔ انسان کو، دیکھ کر سَکتہ ہو جائے۔ کام اُن کا وَہم و قیاس میں نہ آئے۔ سرِ راہ کی بارہ دری جواہر سے جڑی۔ پری کی صورت کے قریب نہر جاری، تکلّف کی تیاری۔ پائیں باغ اُس کا جس نے دیکھا، باغِ اِرَم سمجھا۔ سُوسَن نَمَط ہزار زبانیں بہم پہنچیں؛ تعریف نہ کر سکا، گونگے کا سپنا ہوا۔

رُومی دروازہ اِس رِفعت و شان کا ہے، گُذرگاہ ایک جہان کا ہے۔ اگر اُس پر چڑھ جائے؛ بامِ فلک پست معلوم ہو، فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے۔ سِپہرِ اَوّلیں اُس کی زمیں ہے شَشش جہت میں دوسرا نہیں ہے۔ مسجد اِنتخاب ہے۔ اِمام باڑہ لاجواب

ہے۔ مقبرے عالی شان، وہ نادر مکان کہ فلک بہ دیدۂ انجم نگراں ہے۔ اُن کے نظیر کی جستجو میں، مشعلِ مہ و خورشید روز و شب رُوشن کیے، کُو بہ کُو سرگرداں ہے۔ اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ اُن میں ہاتھ آئے، سرِدست مرجانے کو جی چاہے۔ گومتی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے، طبیعت لہراتی ہے۔ دو رویہ آبادی، عمارت۔ کہیں رمنے، کسی جا باغ بنے۔ صُبح و شام وہ بہار ہے کہ شامِ اَوَدھ اور بنارس کی سحر نثار ہے۔

شہر نفیس، مجمعِ رئیس۔ ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ خوش نویس حافظ ابراہیم صاحب سا۔ اِس قَطْع کا قطعہ لکھا: جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے، اپنے لکھے کو رُوتے، اشکِ حسرت سے وَصلیاں دُھوتے۔ مرزائی صاحب کی مشق کا کوئی پرچہ اگر نظر پڑ جاتا؛ نیریز پریز پریز کہتا، یاقوت رقم ہیرا کھاتا۔

مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرزِ نَو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخِ کہن نے مُسَلَّم الثُّبوت اُستاد کیا۔ عِلمِ موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا؛ اِس طرح کا دُھرپت، خیال، ٹپا گایا اور بنایا کہ کبھی کسی نائک کے وَہم و خیال میں نہ آیا۔ ایک رنگین اِحاطہ کھینچا ہے؛ جو اُس میں آیا، پھولا پھلا، وہ اِن کا پیرو ہوا۔ اور جس نے ڈھنگ جُدا کیا؛ وہ ٹکسال باہر، بدرنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا، اِن کے نام پر کان پکڑتا۔ بھیک مانگ کھاتا، مگر نہ گاتا۔

ہزاروں شاگرد، جگت اُستاد ہوا؛ مولوی سب میں پری زاد ہوا۔
امیروں میں حُسین علی خاں بلبلِ ہزار داستاں، خوش اِلحاں۔ مرثیہ گو
بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مردِ
مِسکیں۔ مکروہاتِ زمانہ سے کبھی افسُردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے
ناظمِ خوب، دبیرِ مرغوب۔ سکندر طالع، بہ صورت گدا۔ بارِ احسان
اہلِ دوَل کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیے، سلام کا دیوانِ کثیر فرمایا۔
شہر میں جتنے رئیس تھے، اُن کے انیس، جلیس تھے۔

طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے، قُمْ بِاِذْنِی کا دم بھرتا ہے۔
جسے دیکھا بُقراط، سُقراط، جالینوسِ زماں ہے۔ اِس معنی میں یہ
خِطّہ، رشکِ زمینِ یونان ہے۔ میرک جان صاحب پیرنے کے
فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مَردُمِ بَرّ و بَحر سرگرمِ ثنا ہوئے۔ شاعر،
زبان داں ایسے کہ عُرفی و خاقانی کی غلطی بتائی، فردوسی و انوری کی یاد
بُھلائی۔ شیخ اِمام بخش ناسخ نے یہ ہِندی کی چِندی کی اور رُوزمرے کو
ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلامِ سابقیں منسُوخ ہوا۔ فُصحائے شیراز و اِصفہاں
اِس سیفِ زباں کا جوہر دیکھ کے، لُوہا مان گئے۔ اپنے قُبح پر مُنفعِل ہوئے،
اِس زبان کا حُسن جان گئے۔ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا، سیکڑوں
کو اُستاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی کی آتش بیانی، شرر افشانی سے
دل جلوں کے سینے میں سوز و گداز ہے۔ مردِ قانع، شاعرِ مُمتاز ہے۔
فرنگی محل کا حال کیا لکھوں! کہاں زبان و دست کا یارا، جو

شمہ لکھتا۔ مولوی : فاضل، عدیمُ المثال۔ ہر شخص جمیع عُلوم کا اُستاد۔ کُتبِ درسی ابتدا سے انتہا تک یاد۔ منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کی تجلّی اور پرِ توفیض سے جہان رُوشن۔ مولوی مُبین دور بیں، سراجِ انجمن، بحرُ العلوم۔ مولوی سیّد مخدوم جامعِ ہر عُلوم۔ مولوی ظہورُ اللہ سُبحان اللہ! ایسے فقیہ، محقّق کہاں ہوتے ہیں! یہی لوگ نادرُ الزّماں ہوتے ہیں۔

اُدھر رُکنِ دیں بلاکد میر سیّد محمّد مُجتہدِ مُستند۔ مرزا کاظم علی مُتّقی۔ آخوند محمّد رضا رضائے خُدا کا جویا۔ حاملِ قرآں، ہمہ داں، کسی علم میں عاری نہیں، روئے زمیں پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں۔

مگر وہ جو مثل ہے: نیک اندر بد؛ یہ اَصل ہے۔ لبِ معشوق مولویوں سے، یعنی ہم پہلو لُعبتانِ مہ رُو، پری شمائل، زُہرہ جبیں، رہ زَن رہ زنِ دیں، مشتری خصائل۔ ستم ناز، غضب انداز، سحر کرشمہ، طلسم غمزہ، آفت عشوہ، قہر ادا، قیامت گات، کرامت بات کی؛ کہ ہاروت ماروت تو کیا، معاذ اللہ! اگر سب فرشتے عرش سے فرشِ خاک پر آئیں؛ اُن کی چاہ میں لکھنؤ کے کنوئیں بھر جائیں۔ گھڑی بھر اُن سے زانو بہ زانو بیٹھے؛ توبۂ نصوحا ٹوٹے، اُن کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لولیِ چرخ بلا گرداں، اُن پر نثار ہے۔ ہر ایک حور وش، آفتِ روزگار ہے۔ خوش مزاج، مردم شناس۔ روزمرہ شستہ۔ دمِ تقریر رمز و کنایہ۔ اسی کوچے

کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراشِ اثرِ صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

کلاوَنت، قوّال بے مثال۔ چھجّو خاں، غلام رسول؛ سب کو موسیقی میں کمال حصول۔ شوری کے زور شور کی دنیا میں دھوم ہے۔ ٹپّے کا موجِد ہوا، سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا۔

پتنگ ایسا بنا، ایسا لڑا کہ نزدیک و دور مشہور ہے۔ ستّر پچھتر تار ڈور، اُس کا پتنگ خیراتی یا چھنگا کے ہاتھ کا، لڑائی کی گھات کا، رستم کی عافیت تنگ کرنے والا؛ منّخی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمدو نے ایسا لڑایا، عمداً اِتنا بڑھایا کہ کرّوبیوں سے اِس پیچ میں عبادت چھوٹی، دوڑ دوڑ کر ڈور لوٹی۔ آنکھ بچا کر پیٹا توڑا، فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔ مرزا نظر علی نے ہاتھ اور نظر میں یہ زور بہم پہنچایا کہ ساٹھ تار کا پتنگ، مُنڈھا پھینک کر بڑھایا۔ چھ سات سیر ڈور پر گھٹ بڑھ دیکھی، کنّا کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ مردان بیگ مانجھا دینے وال دیکھا نہ سُنا۔

غرض کہ جو چیزیں یہاں نئی بنیں اور ایجاد، طبیعت سے کاریگروں نے نکالی؛ سلف سے آج تک نہ ہوئی تھی۔ زردوزی ایسی بنی، یہ باریکی چھنی کہ باہر بندو اور گی کی بنّی جو پائیں؛ بجائے جیغہ و سرپیچ، اپنے سر پر لگائیں۔ انتہائے حیرت کی بات ہے، ستّر اسّی روپے کی

سادی کلابتون کی اَوڑگی۔ اور جوتا گھیتلا خُرد نوک کا ببر علی نے اِس نوک جُھوک کا بنایا کہ جہان کو پسند آیا۔ آرام پائی جس کے ہاتھ آئی، دل نے چین پایا۔ پانچ اشرفی دَھنیا کہاری نے دے کر جوتا بنوایا۔

چالیس سال جہان کی دیکھ بھال کی؛ ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے۔ چناں چہ میاں محمد اشرف، نواب مُعتَمَدُ الدَّولہ بہادُر کے زمانے میں باورچی خانے کے داروغہ تھے۔ آدمیّت، مروّت، ہمّت۔ ہزاروں مرد آدمی اُن کی ذات سے فیض پاتا تھا، جہان کی نعمت کھاتا تھا۔ کاریگر ایسے: مُعتَمَدُ الدَّولہ بہادُر کے دستارخوان پر سَو اُمَرا ہوتے تھے؛ چھ مہینے تک جو چیز ایک دن رُو بہ رُو آئی، دوسرے دن تکرار نہ ہونے پائی۔ پُلاو سے قَلیہ، روٹی تک روز نئی صورت کی تمام شَے دستارخوان پر چُنی، ذائقے میں دیکھی نہ سُنی۔ اور یہ قول تھا: جو اِرشاد ہو، برس دن تک ہر روز جو چیز رُو بہ رُو آئے، دوسرے دن ممکن نہیں جو اُس کی بُو آئے۔ کاریگر ایسے تھے؛ ہمّت میں امیر نہ ہوں گے، جیسے تھے۔

اَور تو اَور؛ شُہدا پیر بُخارا کا، تماشا، سیّدُ الشُّہدا کا شیدا؛ بَرَس رُوز میں جو پیدا کیا، عَشرۂ مُحرّم میں محتاجوں کو نذرِ حُسینؑ کِھلا دیا۔ یہ اِک رنگی مزاج میں سمائی: تمام سِن جُوا کھیلا، دُوِے کے داؤں پر آدھی نہ لگائی؛ ایک روپیہ ہُوا خواہ سَو، کہہ دیا: پَو۔ سیکڑوں داؤں مَنجِے گئے، مُنہ سے نہ پنجے گئے۔ وہاں بھی ایک چوک

لگا رہتا ہے۔ آدمی کے چھکّے چھُٹ جاتے ہیں، جب وہ لوگ نظر آتے ہیں۔

مَشائخ، فقیروں کے مزار خوب۔ خوابِ راحت میں آسودہ سالِک و مَجذوب۔ شاہ مِینا، شاہ پیر محمّد، شاہ خیرُاللہ؛ ایک سے ایک سُبحانَ اللہ۔ بہ ظاہر مُردہ، حقیقت میں جیتے ہیں۔ اَشیاے لطیف کھاتے پیتے ہیں۔ مولوی عبدُالرحمٰن بَرگُزیدۂ یَزداں، عالِمِ باعَمَل، دَرویشِ کامِل۔ خواجہ باسِط اور میر نصیر، جن کا عَدِیل نہ نظیر۔ خواجہ حُسین و حَسَن سَرگروہِ انجمن۔ طبیعت بس کہ مصروف بہ اِختصار ہے، ایک ایک فقرہ لکھا ہے؛ وگرنہ اِن بزرگواروں کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے؛ مگر، شعر:

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید، مختصر گیرید

اِس پر عمل کیا۔ مُنصِف سے انصاف طَلَب ہیں، ہَٹ دَھرم سے کیا کہیں۔ جھوٹے کے رُوبہ رُو سچّا رُو دیتا ہے۔ بِالفرض مُعتَرِض کہے: یہ لوگ کہاں کے تھے؟ تو یہ جوابِ شافی کافی ہے کہ یہ شہر ایسا تھا، جیتے جی یہاں سے نہ نکلے۔ مرگئے، پر یہیں رہے۔ اور یوں تو، مصرع: کس نگوید کہ دُوغِ من تُرش است

جو گفتگو لکھنؤ میں کو بہ کو ہے، کسی نے کبھی سُنی ہو، سُنائے۔ لکھی دیکھی ہو، دِکھائے۔ عہدِ دَولتِ بابر شاہ سے تا سلطنتِ اکبرِ ثانی کہ

مَثَل مشہور ہے : نہ چولھے آگ ، نہ گھڑے میں پانی ؛ دلّی کی آبادی ویران تھی، خَلقت مُضطر و حیراں تھی۔ سب بادشاہوں کے عصر کے روزمرّے ، لہجے، اُردوے مُعلّیٰ کی فصاحت تصنیفِ شُعَرا سے معلوم ہوئی۔ یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت کبھی نہ تھی، نہ اب تک وہاں ہے۔

قَطعِ نظر اِس سے ، لوگ اِس خَلقت کے گِرَہ سے کھوئیں اور جلسہ کریں۔ چُناں چہ ایک بندے کے شفیق ، جگَت آشنا جناب مرزا محمّد رضا ؛ مجمعِ خوبی از پا تا فرق ، تخلّص برق۔ فی الحقیقت کلامِ بَلاغت نِظام اُن کا صاعقۂ خرمَنِ ہستیِ حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار اُن کے رُو بہ رُو کاسِد ہے۔ جوانِ خوش رُو ، بہادُر، آشناے بامزہ ، نیک خو۔ شبِ ماہ صُحبتِ مُشاعرہ بہ دَولت خانۂ مرزا مُعَیَّن ہے۔ رئیس ، امیر ، صغیر و کبیر تشریف لاتے ہیں۔ اُس مکانِ وَسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قِلّت ہوتی ہے۔ ہَوا کشمکش سے بار پاتی ہے ، جب پنکھے کی سَعَی اُٹھاتی ہے۔ سَخُن سَنجِ بے رنج ، خوش گو ، نازک فَہم ، باریک بیں ، نیک خو جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اُن سے ، وہ لوگوں سے لُطف اُٹھاتے ہیں۔ تلامِذۂ مرزاے مَمدوح خدمت کو حاضر۔ کورے کورے مَدارِیے دم بہ دم۔ گِلوریاں وَرَق لگی ، کتّھا بَسا ، چونا سنگِ مَرمَر کا مُتَواتِر۔ قَبل اَز غزل خوانی افیون کا چرچا ہوجاتا ہے ؛ کوئی پیتا ہے ، کوئی کھاتا ہے۔ اگر چاہ کسی کو چاے کی ہوئی ، دودھ پیتے بچّے تک شیر چاے موجود کردی۔ ہمیشہ صُبح اُس

شام کے جلسے کی ہو جاتی ہے۔ طبیعت گھبراتی نہیں۔ گھر جانے والوں کو صدائے مُرغِ سَحَر، نِدائے اَللّٰہُ اَکۡبَر آتی ہے۔ ہر چند سب لوگ یہاں کے تَھَر ہیں، مگر یہ بزرگوار زینتِ شہر ہیں۔

اور لکھنؤ کے جیسے بازاری ہیں، کسی شہر کے ایسے ہَفت ہزاری ہیں۔ دَلّال: مُرَفَّہ حال، خوش پُوشاک، چِکّے چمکائے۔ اور ملکوں کے سیٹھ، کرور پتی: لاکھ اَنسیٹھ سے گانڑ میں لنگوٹی یا دُھوتی۔ جب بڑا تکلّف کیا، گاڑھے کا مرزائی پہن لیا۔ کلمۂ حق کہنے والے کا مَدار دار پر ہوتا ہے، منصور نگر اُس کا محلّہ ہے۔ یہ نکتہ بہ گوشِ دل و جاں سُن: اَلْحَقُّ مُرٌّ۔ حاسدوں کے خوف سے یہ مذکور، مُختَصَر کیا۔ اگر زیادہ لکھتا، قصّہ ہوتا۔ گُوتَہ ہیں لکھنؤ کے نام سے چڑ جاتے ہیں، رشک کھاتے ہیں، اِفتِراپردازی کرتے ہیں، کھَپ کر جَل مرتے ہیں۔

اچھے آغاز کا انجام بہ خیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مَشقّت کسی کی بے کار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ شُروع زمانۂ غازی الدّین حیدر بادشاہ میں ہوا۔ اور تمام عَصرِ سُلطان بِن سُلطان، اَبُو النَّصر نصیر الدّین حیدر دَامَ مُلکُہٗ کے ہُوا۔

اللہ اللہ! یہ عجب شاہِ جَم جاہ اَریکہ نشیں ہوا کہ حاتم کا نام، صَفحۂ سَخا سے مثلِ حرفِ غَلَط مِٹا دیا۔ فقیروں کو امیر بنا دیا۔ عیش و نَشاط کی طرف طبیعت جو آئی؛ ایک ایک ادنیٰ کُنجڑن، ہَفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی۔ شہ زادیوں کو کہاریوں پر رشک آیا۔ خَواصوں کو

صاحبِ نوبت کیا؛ چنڈول، شکھپال میں چڑھایا۔ ہاتھی، پالکی کو جلو میں پھرایا۔ ہزار بارہ سے چلنے والی حوروش، برق کردار، کبک رفتار، نغز گفتار، از پا تا فرق دریائے جواہر میں غرق، ہردم دست بستہ رو بہ رو کھڑی رہی۔ جہان کی نعمت اُن کے سامنے پڑی رہی۔ اصیلوں کو کروروں روپے دیے۔ پیش خدمتوں نے بادشاہت کے چین کیے۔ قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی، معاً رفعت و شان فلکِ ہفتم پر پہنچائی۔ کئی کرور روپے اُس منظورِ نظر نے صرف کیے۔ خزانے خالی کر، محتاجوں کے گھر بھر دیے۔ تجربہ کاروں کا قول تھا کہ اِن کے بعد یہ شہر ویران اور تباہ ہوگا۔ نہ اِس ہمت کی بیگم، نہ اِس حوصلے کا بادشاہ ہوگا۔ ہر وقت راجہ اِندر کی صحبت سے بہتر جلسہ رہا۔ نہروں میں عطر بہا۔ مکان اِس طرح کے بنوائے کہ فلکِ گرداں نے صدقے ہو کر چکّر کھائے۔ اِندراسن، گلشنِ اِرم؛ کس کس کا نام لوں! یہ باغ، یہ کوٹھیاں چشم و گوشِ سِتمار نے دیکھیں نہ سنیں۔ دوازدہ اِمام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخِ گرداں کو اور خواب میں نظر نہ آئی۔ اِندراسن میں عطر کا حوض چھلکتا رہا، تمام شہر مہکتا رہا۔

مُغلانیوں نے گوٹے کناری کی کترنوں سے چاندی سونے کے محل اُٹھائے۔ خاصے والیوں نے لونگ، اِلائچی، زعفران کے اپنے گھروں میں خاصے ڈھیر لگائے۔ مکّا خیّاط مالِ دُنیا سے مالامال ہے، اِستغنا کا دم بھرتا ہے۔ سینا تو کیا، ٹانکا کم بھرتا ہے۔

بجز غمِ حُسینؑ، شہریار کو اَنْدُوہ و غم نہیں۔ کون ہے جو اِس زمانے میں شاد و خُرّم نہیں۔ اَرْبَعِین تک عَزاداری ہوتی ہے۔ خلقِ خُدا ماتمِ حُسینؑ میں رُوتی ہے۔ لاکھوں روپیہ اِس راہ میں صرف ہوتا ہے۔ چالیس شب نہیں سوتا ہے۔ تُخمِ عَمَلِ نیک مَزْرَعَۂ آخِرَت میں بُوتا ہے۔ روزِ تَوَلُّدِ ہر امام و شبِ وَفاتِ جگر بَنْدانِ خَیرُ الْاَنام لاکھ لاکھ روپے کا صَرف ہے۔ اِس ہمّت کے آگے فَیاضانِ گُذَشتہ پر حَرْف ہے۔ حُسنِ صورت، شَوکت و حَشمت، جاہ و ثَروَت؛ جتنی دُنیا کی خوبیاں ہیں، اللہ نے سب دی ہیں۔ ہر شب شبِ بَرات، رُوز عِیدَین کے ہیں۔ سیرِ دریا کی دَفْعَتاً جو لہر آئی، گنگا سے نہر منگائی۔ اِس میں بھی غُربا نہال، کارِندے مالا مال ہو گئے۔ بس کہ خامۂ مُوَلِّف اِختِصار رَقَم ہے؛ مگر جتنا اُس کی صفت میں لکھیے، بہت کم ہے؛ لہذا اِس غزل پر مطلب کو اِختِتام دیا۔ یہ داستان وہ نہیں جو لکھی جائے، ناچار تمام کیا۔ غزل:

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیرُ الدّین حیدر بادشائے لکھنؤ

گو ملے جنّت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک میں اٹھتا ہوں اس پر کہہ کے: ہائے لکھنؤ

رشک کھا کھا، گو فلک مجھ سے چھُڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں، دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

یا تو ہم پھرتے تھے اُن میں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

اِن کی اِستِغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جامِ جَم پر تُف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

کیوں گمانِ زاغ بلبل کے ترانے پر نہ ہو
یاد آجائیں جو وہ نغمہ سرائے لکھنؤ

ہر محلے سے بچانا جی، ہے عیسیٰ کو مُحال	چھوڑتے جیتا نہیں معجز نمائے لکھنؤ
جن و اِنس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں	ہے سُلیماں اِن دنوں فرماں روائے لکھنؤ
دشتِ غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا	دل سے اُڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ
یہ رہے آباد یارب تا بہ دَورِ مُشتری	میں کہیں ہوں، مانگتا ہوں پر دُعائے لکھنؤ

بلبلِ شیراز کو ہے رشک تاسخ کا سُرور
اِصفہاں اِس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

الٰہی! بہ حُرمتِ سیدِ اَبرار احمدِ مختار و بہ تصدّقِ اَئمۂ اَطہار، لکھنؤ کو آباد رکھ۔ والیِ مُلک کو یہاں کے کارفرما، رعیّت پرور، سریرِ حکومت پر دل شاد رکھ۔ جب تک گنگا جمنا میں پانی بہے؛ یہ خطۂ دل چسپ، فَرَح اَفزا، آباد رہے۔ فرد:

الٰہی! لکھنؤ بستا رہے دَورِ قیامت تک
سُرورِ دشت پیما کا کبھی وہ شہر مَسکن تھا

اور مُقلّد یہاں کے، موجِد سے بہتر ہوتے ہیں۔ شاگرد ہو کر، اُستاد کے ہمسر ہوتے ہیں۔ مَطبع اِس شہر میں اکثر سنگ کے ہیں، نمونے نیرنگ کے ہیں؛ مگر ہمارے شفیق و مہرباں، یک رنگ حاضر و غائب یکساں جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مَدّظِلّہٗ عزیزِ دلہا، ہمہ صفت موصوف ہیں۔ دور دور مشہور و معروف ہیں۔ سابق ازیں فرنگی محل میں چھاپہ خانہ تھا، اَلعاقِلُ تَکفِیہِ الاِشَارَۃ، رشکِ ابنائے زمانہ تھا۔ اخبار کا پرچہ چھپتا تھا، اِن کا پتا نہ چھپتا تھا۔ خوش نویس

ایسے جمع ہوتے تھے : اور محرّر اپنے لکھے کو روتے تھے۔ اپنے اپنے انداز پر بے نظیر؛ یادگارِ آغا، ہم پہلوے میر۔ کلیں ولایتی دل کو بے کل کرتیں۔ یہ تکلف کہ بے پاؤں اشارے پر چلتیں۔ کانپی کو دیکھ کے جی کانپتا۔ کیسا ہی زبردست جوان ہو؛ بے فرمائے، ایک فرما نکالنے میں ہانپتا۔ پتھروں پر ایسی جلا کہ دمِ نظارہ بہ یکِ نگاہ کا پاؤں پھسلتا۔ یہ صفا اگر بہ غور دیکھو تو قلمِ مو سے یہ لکھا ہے کہ ہر پتھر پر طور کا جلوہ ہے۔ کتبِ پارینہ کے واسطے اِحیاے اموات کا نقشہ تھا، معجزۂ عیسیٰ کے اِثبات کا نقشہ تھا۔ شائقوں سے اَرِنی کی جب صدا آتی، بیلن سے بے لَن تَرانِی اور نہ ندا آتی۔ گو تحریر کا مقدمہ زمانے میں ہے، سیاہی میں روشنائی کا جلوہ اِسی کارخانے میں ہے۔ جو کتاب چھپی، وہ مرقّعِ مانی کی تصویر تھی۔ حرف مٹنے کا کیا حرف، مثلِ نوشتۂ تقدیر تھی۔

شہروں میں اِس چھاپے کی دھوم تھی، گردشِ تقدیر کسے معلوم تھی! دفعتہً فلک نے یہ چکر کھایا حرفِ غلط کی طرح رگڑ کے شہر کو مٹایا۔ پردہ میں سے بناتُ النّعش کی صورت نظر آئی۔ ایسا تفرقہ پڑا کہ پھر نہ کسی کی خبر پائی۔ فقیر جنبُ الطّلب مہاراج ایسری پرشاد نارائین سنگھ بہادر راج بنارس دام حشمتہم بنارس میں آیا۔ شکر صد شکر کہ رئیس والا جاہ، رعیت پناہ، غریب نواز، غربا پرور، باریک بیں، قدر شناس، سخی، شجاع، سخن فہم، عدل گستر پایا۔

دَرپیں وِلا ' دوستوں کی تحریک سے مولوی صاحب کو شغلِ پارینہ منظور ہوا ' پہلے عزمِ فسانۂ سُرور ہوا۔ اِس کی صحّت کی خاطر بندے کو لکھا۔ بجز اِقرار چارہ نہ ہوا ' انکار گوارا نہ ہوا۔

ہر چند یہ فسانہ ' بہ طرزِ زمانہ ' ہر ایک چھاپہ خانے میں نیا نیا رنگ لایا۔ جس نے چاہا جس فقرے پر پانی پھیرا ' صَفحۂ کتاب سے بہایا۔ بہ قولِ فقیر : جو مضمون سمجھ میں نہ آیا ' نہ پڑھا گیا ؛ وہ کُند بَسولے سے گڑھا گیا۔ جَودَتِ قلم نشّاروں کی ہوئی ' اِصلاحِ خط یاروں کی ہوئی۔ شعر :

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا ' وَلے
سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

یہ نہیں سمجھتے ' مصرع :

قبولِ خاطر و لطفِ سخن ' خداداد است

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔ حاسد مفلس کے چراغ کی طرح جھلملا کے جلتے ہیں۔ فروغ کیا ہو ؛ مُنہ کی کھاتے ہیں ' ٹیڑھی راہ چلتے ہیں۔ فقیر نے اِس کے دیکھنے میں عرق ریزی از حد کی۔ حضرت کے خوف سے اِنتہا کی کَد کی۔ جس جگہ محل اور موقع پایا ہے ' کیا کیا جملہ بڑھایا ہے۔ طبیعت نے بُڑھاپے میں کیا کیا زُور دکھایا ہے۔ کہنے کو قصہ ہے ' کہانی ہے ؛ ہر جا تصویر کھینچی ہے ' مُرقّعِ مانی ہے۔ ہر صفحہ رشکِ گلزار ' باغ سراپا بہار ہے ؛ مگر حاسد کے دل میں کھٹکتا ہے ' خار ہے۔ ایسی

مَتاعِ گِراں بَہا کس گنجینے میں ہے، جس کی جگہ ذی فَہم قدرشناسوں کے سینے میں ہے۔ باریک بیں، نُکتہ سنج، مَرزُجاں مَرنج خود دیکھ لیں گے کہ اَور نسخوں میں کیا ہے، اور اِس میں کیا لکھا ہے۔ فصاحت کا دریا بہا دیا ہے۔ حشر تک اِس کے شائق دُنیا میں کم نہ ہوں گے، قیامت یہ ہے کہ ہم نہ ہوں گے۔ الٰہی! جب تک فلک کی حرکت سے چمَنِ دُنیا میں نسیمِ بہاری رہے؛ کارفَرما سَرسبز، کام جاری رہے۔

بندہ کم ترینِ تلامذہ اور خوشہ چینِ خرمَنِ سخُن جناب قبلہ وکعبہ، اُستادِ شاگرد نَواز، مُعزّز و مُمتاز، مجمعِ فضل وکمال، نیک سیرت، فَرخندہ خصال، خرَد آگاہ، دانش آموز، یادگارِ جناب میر سوز، عُرفیِ عصر، سعدیِ زَماں، رشکِ انورِی وخاقانی آغا نوازش حسین خاں صاحب، عُرف مرزا خانی، تخلّص نَوازش، ہے۔ حقیقتِ حال یہ مَقال ہے کہ طرزِ ریختہ اور رُوزمرّہ اُردو کا اُن پر ختم ہے۔ شعر اُن کے واسطے، وہ شعر کی خاطر مَوضُوع ہیں۔ کہنے کے علاوہ، پڑھنے کا یہ رنگ ڈھنگ ہے: اگر طِفلِ مکتب کا شعر زَبانِ مُعجز بیاں سے اِرشاد کریں؛ فَیضِ دَہاں، تاثیرِ بیاں سے پسندِ طَبعِ سَحبانِ وائل ہو۔ فی زمانہ تو کیا، سابقین جو مُوجدِ کلام کُوسِ لِمَنِ المُلکی بجاتے تھے، اُن کے دیوانوں میں دس پانچ شعر تناسُبِ لفظی یا صَنائعِ بَدائع کے ہوں گے، وہ اُن پر نازاں تھے اور مُتاخّرین فخریہ سند گردانتے ہیں؛ لہٰذا جس شخص کو

فہمِ کامل یا اِس فن میں مرتبۂ کمال حاصل ہو اور طبع بھی عالی ہو؛ آپ کا دیوان بہ چشمِ انصاف و نَظرِ غور سے دیکھے؛ کوئی غزل نہ ہوگی جو کیفیت سے خالی ہو۔ ہر مصرع گواہِ ہزار صنعت، ہر شعر شاہدِ مَعانی، باکیفیت۔ مَطلع سے مَقطع تک ہر غزل پری کی صورت۔ اکثر اشعار آپ کے تبرّکاً و تیمّناً بہ طریقِ یادگار بندے نے لکھے ہیں۔ جہاں لفظِ "اُستاد" ہو، وہ آپ کا شعر سمجھو۔

وجہِ تالیف اِس قصّۂ بے نظیر کی اور کیفیت صاحبِ فرمایش کی تقریر کی۔ حکیم صاحب کی تحریک، سفر کان پور کا، لکھنا سُرورؔ کا۔

حَسبِ اِتّفاق ایک روز چند دوستِ صادق، مُحِبِّ مُوافق باہم بیٹھے تھے؛ مگر نَیرنگیِ زمانۂ ناہنجار اور کج رَوِیِ فلکِ سِفلَہ پَرَوَر، دُوں نَواز، جفا شِعار سے سب بادلِ حَزِین و زار اور ہُجومِ اَندُوہ و یاس سے اور کثرتِ حرمان و اَفکار سے، کہ ہر دم یہ پاس تھے؛ دل گرفتہ، سینہ رِیش اور اُداس تھے؛ یہ ذِکر بَر زَباں آیا کہ شُعبدہ بازیِ چَرخِ چنبَرِیِ نیلی فام اَز زمانِ آدم عَلَیہِ السّلام تا ایں دم یوں ہی چلی آئی ہے۔ اور تفرِقہ پَردازی، رنج و محَن سے سِوا آزار دیتی ہے؛ یہ ادنیٰ اِس ظالم کی کج ادائی ہے۔ اب یہی غنیمت جانیے، اِس کا احسان مانیے کہ تم ہم اِس دم باہم تو

بیٹھے ہیں۔ اُستاد:

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں، سُنو، یہ دم غنیمت ہے
یہ ہنسنا بولنا رہ جائے تو کیا کم غنیمت ہے

اور واقعی شدّتِ رنج و اَلَم میں دوستِ صادق، یارِ مُوافق ہم پہلو ہو؛ تو کچھ خیال میں نہیں آتا ہے، دل بہل جاتا ہے۔ اور صُحبتِ غیرِ جِنس میں تختِ سلطنت، تختۂ تابُوت سے بدتر ہو کے کاٹے کھاتا ہے۔ سعدی:

پای در زنجیر پیشِ دُوستاں
بِہ کہ با بیگانگاں در بُوستاں

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوُجودِ کثرتِ غم و شدّتِ اَنْدُوہ و اَلَم، دو شخص باہَم نہیں دیکھ سکتا۔ مرزا:

پھینکے ہے مَنْجنیقِ چرخ، تاک کے سنگِ تَفْرِقَہ
بیٹھ کر ایک دم کہیں، ہوویں جو ہم کلام دو

جب سلسلۂ سُخَن یہاں تک پہنچا؛ اُس زُمرے میں ایک آشنا بامزہ بندے کے تھے، اُنھوں نے فرمایا: اِس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زَبانی ایسی بیان کر کہ رَفعِ کُدُورَت و جَمْعیَّتِ پریشانیِ طبیعت ہو اور غُنچۂ سَربَستۂ دل، جو سَمُومِ حَوادِث سے مُضْمَحِل ہے؛ بہ اِہتِزازِ نسیمِ تَکَلُّم کِھل جائے۔ فرماں بردار نے بجز اِقرار، اِنکار مناسب نہ جانا؛ چند کلمے گُوش گُزار کیے۔ اگرچہ گریہ کردن راہم دلِ خوش می باید؛ مگر اِس نظر سے، مصرع:

ہر چہ از دوست میرسد، نیکو ست

وہ باتیں اُنھیں بہت پسند آئیں، کہا: اگر بہ دل جَمعیِ تمام تو اِس پَراگَندہ تقریر کو، از آغاز تا انجام، قصّے کے طَور پر زبانِ اُردو میں فَراہَم اور تحریر کرے تو نہایت منظورِ نَظَرِ اہلِ بَصَر ہو؛ لیکن تقصیر مُعاف ہو، لُغَت سے صاف ہو۔ بندے نے کہا: طبیعتِ اَبنائے روزگار بیش تر مُتوَجّہِ عَیب جُوئی و ہُنر پوشی ہے، بہ قولِ دِلگیر، شعر:

قُبح کے دیکھنے والے تو بہت ہیں دلگیر!
اور یہاں حُسن شَناسانِ سُخَن تھوڑے ہیں

وہ بولے: چشم داشتِ صِلہ، طَلَبِ اُجرت کسی سے مُتَصوَّر نہیں، فَقَط ہماری خوشی مَدِّ نظر رکھ۔ جیسا رَطب و یابِس کہے گا، ہمیں پسند ہے؛ بہ شرطے کہ جو رُوزمَرّہ اور گُفتگو ہماری تمھاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیِ عبارت کے واسطے دِقّت طَلَبی اور نُکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فَرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔ نیاز مند نے کہا: یہ تو مُقدّمۂ تحریر ہے؛ اگر سر سَرکار کے کام آئے، جائے تقریر نہیں؛ مگر جلدی نہ کرنا، بہ وقتِ فُرصت لکھوں گا۔ وہ تو یارِ شاطِر، نہ بارِ خاطِر تھے؛ قبول کیا۔

اُسی دن سے ہمیشہ اِس کا خَیال رہتا تھا، عَدَمِ فرصت سے نہ کہتا تھا۔ آخرُ الاَمر بہ مُقتَضائے عادت، تلاشِ مَعاش کے حِیلے میں فلکِ تَفرِقہ پَرداز، گَردُونِ عَربَدہ ساز نے صورت مُفارَقت کی دکھائی؛

مُہاجرت وطن آوارہ کے اِستقبال کو آئی ۔ مسرت :

بوقتِ لُقمہ خوردن اے مسرت! گفت بہایم
کہ روزی میکند از ہم جدا یارانِ ہمدم را

رَبیعُ الثّانی کے مہینے میں کہ سنۂ ہجریِ نبوی صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم بارہ سَے چالیس تھے ؛ آنے کا اتّفاق مجبور، کوردِہ کان پور میں ہوا۔ بس کہ یہ بستی ویران، پُوچ و پُچر ہے ۔ اَشراف یہاں عنقا صفت ناپَیدا ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشیں، عُزلت گزیں ؛ مگر چھوٹی اُمّت کی بڑی کثرت دیکھی ۔ یہ طَور جو نظر آیا، دلِ وحشت منزل اِس مقام سے سخت گھبرایا ۔ قریب تھا جُنون ہو جائے، تیرہ بختی روزِ سیاہ دکھائے ؛ لیکن بہ شربتِ عنایت و معجونِ شفقتِ اَرسطو فطرت، بُقراط حکمت، حارو بارِدِ زمانہ دیدہ، تجربہ رسیدہ حکیم سیّد اسد علی صاحب شیرِ بیشۂ علم و کمال، سخن فَہم، ظَریف، خوش خِصال ؛ طَبعِ سَودا خیز اور سَرِ جُنوں اَنگیز کو آرام و تسکیں حاصل ہوئی ۔ اکثر حالِ فقیرِ دل گیر پر اَلطاف و کرم فرماتے تھے ۔ تدبیریں نیک و اَحسن، دافعِ رنج و مِحَن بتاتے تھے ۔

ایک رُوز بعدِ اِظہارِ حالِ مُکلّفِ فسانۂ دوستانہ، یہ بھی کہا کہ حسبِ وعدہ ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں ۔ سُن کے فرمایا : بیکار مَباش، کچھ کیا کر ۔ میرؔ :

میرؔ! نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے | نامِ خدا ہو جواں، کچھ تو کیا چاہیے

اُس وقت یہ کلمہ توسَنِ طبع کو تازیانہ ہوا، تحریر کا بہانہ ہوا۔ اگرچہ اِس ہیچ مَیرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویِ اُردو زبان پر لائے یا اِس فسانے کو بہ نظرِ نَشّاری کسی کو سُنائے۔ اگر شاہ جہاں آباد کہ مَسکنِ اہلِ زباں، کبھی بیتُ السَّلطَنَتِ ہندوستاں تھا؛ وہاں چندے بُود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا؛ اُن سے تحصیلِ لاحاصل ہوتی، تو شاید اِس زبان کی کیفیت حاصل ہوتی۔ جیسا میر اَمَّن صاحب نے قصۂ چار درویش کا باغ و بہار نام رکھ کے خار کھایا ہے، بکھیڑا مچایا ہے کہ ہم لوگوں کے دہَن، حصّے میں یہ زبان آئی ہے؛ مگر بہ نسبت مُولّفِ اوّل عطا حسین خاں کے، سو جگہ مُنہ کی کھائی ہے۔ لکھا تو ہے کہ ہم دِلّی کے رُوڑے ہیں؛ پر، مُحاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتّھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مُفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزا وار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مُشک آنست کہ خود بُوید، نہ کہ عطّار گوید۔ یہ وہی مثَل سُننے میں آئی کہ: اپنے مُنہ سے دھنّا بائی۔ لیکن تحریر اِس کی الفاے تقریر ہے۔ قصّہ یہ دل چسپ، بے نظیر ہے۔

اُمّید ناظرینِ پُر تمکیں سے یہ ہے کہ بہ چشمِ عیب پوشی و نظرِ اِصلاح مُلاحظہ فرما؛ جہاں سَہو یا غَلَطی پائیں، بہ اِصلاح مزیّن فرمائیں۔ کیسی ہی طبیعتِ عالی ہو، ممکن نہیں جو بَشَر خطا سے خالی ہو۔ اِس کے مُطالعے سے خاطرِ خَطیر اگر شاد ہو، عاصی دُعاے خیر

سے یاد ہو۔ نیاز مند کو اِس تحریر سے نمودِ نظم و نثر، جودتِ طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا اِحتمال نہ تھا۔ بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دِقّت طلب، غیر مُستعمل، عَرَبی فارسی کا مشکل تھا؛ اپنے نزدیک اُسے دور کیا۔ اور جو کلمہ سَہلِ مُمتنع، مُحاورے کا تھا؛ رہنے دیا۔ دوست کی خوشی سے کام رکھا، فسانۂ عجائب اِس کا نام رکھا۔ اِنَّہٗ الْمُبْدِءُ وَاِلَیْہِ الْمَآبْ۔ عِنایتِ اِیزدی سے تمام ہوئی کتاب۔

آغاز داستانِ اِعجاز بیاں سلطان فیروز بخت کی، اور تلاش اُس کو وارثِ تاج وتخت کی۔ خوش قسمتی سے حاجت کا بر آنا، گوہرِ دُرجِ شہریاری صدفِ تمنّا سے پانا۔

اُستاد:

مَثل ہی سے، نہ الفاظِ تلازُم سے یہ خالی ہے
ہر اک فقرہ کہانی کا گواہِ بے مثالی ہے

لا اَعْلَمْ:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ سُن رکھو تم فَسانہ ہیں ہم لوگ

گِرہ کُشایانِ سلسلۂ سُخَن، تازہ کُنِندَگانِ فَسانۂ کُہَن؛ یعنی مُحَرِّرانِ رنگیں تحریر و مُوَرِّخانِ جادو تقریر نے؛ اَشْہَبِ جَہِنْدَۂ قلم کو میدانِ وسیع بیاں میں، باکَرِشمۂ سِحر ساز و لطیفہ ہائے حیرت پَرداز گرم عِنان و جَولاں یوں کیا ہے کہ سَر زَمینِ خُتَن میں ایک شہر تھا مینُو سَواد، بہشت نژاد، پسندِ خاطرِ

محبوبانِ جہاں، قابلِ بود و باشِ خوبانِ زماں۔ شمیمِ صفت اُس کی مُعطّر کُنِ دِماغِ جاں، مُسکّنِ اِلتہابِ قلب، دافعِ خفقاں۔ زمین اُس کی رشکِ چرخِ بریں۔ رِفعت و شان چشمک زنِ بلندیِ فلکِ ہفتمیں۔ گلی کوچے خجلت دِہِ گلشن۔ آبادی گلزار، بسانِ تختۂ چمن۔ بازار ہر ایک بے آزار، مُصفّیٰ، ہموار۔ دُکانیں نفیس۔ مکان نازک، پایدار۔ خلقِ خُدا باخاطرِ شاد اُسے فُسحت آباد کہتی تھی۔ سب طرح کی خلقت، ہر طور کی رعیّت رغبت سے اُس میں رہتی تھی۔

والیِ مُلک وہاں کا شاہِ گردوں وقار، پُر تمکین، با اِفتخار، سکندر سے ہزار خادِم، دارا سے لاکھ فرماں بردار، قُباد شوکت و کاؤس حشم، مالکِ تاج و تخت، والا مرتبت، عالی مقام، شاہنشاہ فیروز بخت نام۔ موجِ بخشش سے اُس بحرِ جُود و عطا کی، سائلانِ لب تشنہ سیراب۔ اور نائرۂ غضب کے شُعلے سے، دشمنِ بد باطن جگر سوختہ، بے تاب۔ دبدبۂ داد دِہی، غُلغلۂ عدالت سے، دشمن دوستِ جانی۔ چور مسافر کے مال کا نگہبان؛ ڈکیتوں کو عہدۂ پاسبانی۔ ملک وافر۔ سپاہ افزوں از قیاس۔ خزانہ لا اِنتہا، بے کراں۔ وزیر، امیر جاں فِشاں۔ تاج بخش و باج سِتاں۔ محتاج اور فقیر کا شہر میں نام نہیں۔ داد فریاد، آہ و نالے سے کسی کو کام نہیں۔ رعیّت راضی۔ سپاہ سر فروش، جاں نثار، شاداں۔ دشمن خائف۔ شمع کا چور سرِ محفل لرزاں۔ اِس نام سے یہ ننگ تھا کہ امیروں کا چور محل نہ ہونے پاتا تھا۔ دُزدِ حنا کا رنگ نہ جمتا تھا، سرِ دست ہاتھ باندھا جاتا تھا۔ آنکھ چُرانے سے ہم چشم چشمک کرتے تھے۔ کارِ خیر سے اگر کوئی جی چُراتا، تو نامردی کی

تہمت اُس پر دھرتے تھے۔

لیکن بہ ایں حکومت و ثروت، کاشانۂ اُمید کا چراغ گُل، اولاد بالکل نہ تھی۔ خواہشِ فرزند دردل۔ نہ ہونے کی کاہش متّصل۔ حسرتِ پسر میں رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ ہر ساعت بر زباں۔ و رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِیًّا وظیفۂ ہر زماں۔ لڑکے کی تمنّا میں بادشاہ مثلِ گدا دست دراز۔ ایسا لاپروا، بے نیاز کی قدرت سے، بانیاز۔

آخرش جنابِ باری میں تضرّع وزاری اُس کی منظور ہوئی، لاوَلدی کی بدنامی دور ہوئی۔ ساٹھ برس کے سن میں، بڑھاپے کے دن میں گوہرِ آب دار، دُرِ شاہوار، صدفِ بطنِ بانوے خجستہ اطوار سے پیدا ہوا۔ چھوٹا بڑا اُس کی صورت کا شیدا ہوا۔ اُس روح افزا کا، فیروز بخت نے، جانِ عالم نام رکھا۔ شب و روز پرورش سے کام رکھا۔ حُسن اللہ نے یہ عطا کیا کہ نیّرِ اعظم چرخِ چارم پر رُعبِ جمال سے تھرّایا۔ اور ماہ، باوجودِ داغِ غُلامی، تابِ مشاہدہ نہ لایا۔ اُس نقشِ قُدرت پر تصوّرِ مانی و بہزاد.. حیران اور صنّاعی آزر کی ایسے لُعبتِ حقیقت کے رُو بہ رُو پشیمان۔ کاسۂ سر سراسر شورِ جوانی، زورِ شباب سے معمور۔ آنکھیں، جھپکانے والی دیدۂ غزالانِ ختن کی، شرابِ عشق کے نشے سے چکنا چور۔ چہرے پر جلالِ شاہی، شوکتِ جہاں پناہی نُمایاں۔ حُسنِ درخشندہ کی تڑپ بہ از انجم واخترِ تاباں۔ مصحفی:

اُسے دیکھ طفلی میں، کہتی تھی دایہ[1]

یہ لڑکا طرح دار پیدا ہوا ہے

مرزا قتیلؔ، ع :

پارہ خواہد شد ازیں دست گریبانے چند

لکھا ہے کہ جب وہ مہرِ سپہرِ سلطنت بُرجِ حَمَل سے جلوہ اَفروز ہو، زینت بخشِ کنارِ مادر و زیب دِہِ آغُوشِ دایہ ہوا؛ دَرِ خزانہ و مَحبَس کُھلا۔ ہزارہا قیدی رِہا ہو اپنے گھر آیا اور سیکڑوں لونڈی غُلام نے فرمانِ آزادی پایا۔ شہر میں محتاج ناپیدا تھا؛ مگر اَشرفی، روپیہ حاجیوں کے واسطے مکۂ مُعظّم اور زائروں کی خاطر کربلائے مُکرّم میں پیہم بھیجا۔ ایک سال کا خِراج رعیّتِ محتاج کو مُعاف ہوا۔ شہ زادے کے نام کے گنج آباد ہوئے۔ مسجدیں، مَدرَسے، مہمان سَرا، مسافر خانے تعمیر ہوئے۔ اہلِ شہر دل شاد ہوئے۔

نُجومی، پنڈت، جَفرداں حاضر ہوئے۔ بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی: مہاراج کا بُول بالا؛ جاہ و حَشَم ہر دم بڑھے، مرتبہ دوبالا، اعلیٰ رہے؛ ہماری پوتھی کہتی ہے: بھگوان کی دَیا سے شہ زادے کا چَندرماں بَلی ہے۔ چھٹا سورج ہے۔ جو گرَہ ہے وہ بھلی ہے۔ دِیگ تیگ کا مالک رہے۔ دَھرَم مُورت یہ بالک رہے۔ جلد راج پر براجے۔ بِرَتھمی میں دھوم مچے، ایسی شادی رچے۔ اِستری تین ہو۔ دو کا پرَمان، ایک کی ہین ہو۔ مگر پندرھویں برس مُشتری بارھویں آئے گی؛ سنیچر پاؤں پڑے گا۔ ایک پَنکھیرو سُوے کے بَرَن میں ہاتھ آئے گا۔ تِریا کی کَھٹ پَٹ سے وہ بَچن سُنائے گا کہ راج پاٹ چُھٹا، دیس سے بدیس لے جائے گا۔ ڈگر میں شاہ زادہ بھٹکے گا، کوئی مانس پاس نہ بھٹکے گا۔ ساتھی چُھٹیں۔

اپنے ڈیل سے ڈانواڈول رہے۔ پھر ایک مَنُکھ، ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے، راہ لگائے۔ کوئی کَلنکَن، تُو بھی ہو، کَشٹ دِکھائے۔ وہاں سے جب چھُٹے، رانی ملے مَہا سُندر؛ وہ چَرَن پر پِران وارے۔ پِتا اُس کا گیانی، گُن کی تَکھتی دے؛ اُس سے کئی مَلیچھ مارے، دُکھ میں آڑے آئے، بگڑے کاج بنائے۔

جب اُس نگر پہنچے، جس کی چِت میں گھر چھوڑے؛ تو لاب بہت ہو۔ دَرَب، گہنے ہاتھ آئیں۔ دور سب کلیس ہو جائیں۔ پر، ایک ہِتی، من کا کَپٹی، اِستری پر دُچِت ہو، کھٹائی کرے۔ جُجھ پڑیں، نَر ناری لڑیں۔ اور کچھ جَل میں بھی ہل چل پڑے۔ پرہِتی لوگ چھُٹ جائیں۔ نگر نگر کھوج میں پھر آئیں۔ سب بِچھڑے مِل جائیں۔ ماتا پِتا کے ڈِھگ آئیں۔ بڑا راج کرے۔ دَیا دَھرَم کے کاج کرے۔ گُسیّاں کی کرپا سے جان کی کھیر ہے۔ بڑی بڑی دَھرتی کی سَیر ہے۔

یہ سُن کے بادشاہ گُونہ ملول ہوا۔ پھر مستقل مزاجی سے یہ کلمہ فرمایا: فِعلُ الحَکِیمِ لَا یَخلُو عَنِ الحِکمَۃِ۔ اُن سب کو بہ قدرِ حال، فراخورِ کمال مالا مال کیا۔ خِلعَت و اِنعام دیا۔ بہ بَشاشَتِ تمام سَرگرمِ پرورِش صُبح و شام رہا۔ کوئی تو برسوں میں بڑھتا ہے؛ وہ نِہالِ نو دَمیدۂ بُستانِ سَلطَنت گھڑیوں میں بلند بالا ہوتا تھا۔ چند عرصے میں، بہ حَول و قُوّتِ اِلٰہی، وہ ہاتھ پاؤں نکالے؛ دس برس کے سِن میں اُس غزال چشم نے ہِرَن کے سینگ چیر ڈالے۔ دست و بازو میں یہ طاقت ہوئی کہ دَرِندۂ فیلِ مست ہوا۔ جوانِ رعنا، چہرۂ زیبا، رُستم شوکت،

اِسفَندیار سے زبردست ہوا۔ جو اُس کا رُوئے مُنوّر دیکھتا، یہ کہتا، لااَعْلَم: ①

مُنہ دیکھو آئنے کا، تری تاب لا سکے — خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے
تصویر تیری کھینچے مُصوّر تو کیا مجال — دستِ قضا تو پھر کوئی تجھ سا بنا سکے

تحصیلِ علم و فضل میں شُہرۂ آفاق ہوا۔ جتنے فنِ سپہ گری ہیں، اُن کا مشّاق۔ جَمیع عُلوم، ہر فن میں طاق ہوا۔ جَلَّ جَلالُہٗ! باپ ویسا، بیٹا ایسا محبوب۔ محبّت میں بَسانِ یوسف و یعقوب عَلَیْہِما السَّلام۔ جب وہ ہلالِ سپہرِ شَہر یاری بہ فضلِ باری بَدرِ کامل ہوا اور چودھواں بَرس بھر گیا، جوانوں میں شامل ہوا۔ بہ صَلاح و صَواب دیدِ اَرکانِ سلطنت و ترقّی خواہانِ دولت شادی کی تجویز ہوئی۔ بہ تلاشِ بے شمار و تجسُّسِ بِسیار ایک شہ زادی پری پیکر، خوب صورت، نیک سیرت، حور نژاد، گُل اَندام، سیمیں بَر، رشکِ سَرو، غیرتِ شَمشاد، ماہ طلعت نام، دُود مانِ والا سے مُقرّر ہوئی۔ وہ جو آئینِ بادشاہی، طریقِ فرماں رَوائی ہے؛ اُسی طرح اُس کے ساتھ اُس اخترِ تابندۂ فلکِ شاہی کو ہمقِراں کیا، نکاح پڑھوا دیا۔

جَولانی سَمندِ تیز رفتارِ قلم کی میدانِ بیانِ سواریِ شہ زادہ جانِ عالم میں، اور خریدنا توتے کا، اور کج بحثی ماہ طلعت کی توتے سے۔ پھر کیفیتِ حُسنِ انجمن آرا توتے سے سُننا، شہ زادے کا نادیدہ عاشق ہونا، وحشت سے سر دُھننا۔

بُلبلِ نَوا سَنجِ ہزار دستاں؛ طوطیِ خامۂ زمزمہ ریزِ خوش بیاں

گلشنِ تقریر میں اِس طرح چہکا ہے، صَفحۂ فسانہ مہکا ہے کہ بعدِ رسمِ شادی؛ سیر و شکار کی اجازت، سواری کا حُکم شاہِ ذَوِی الْاِقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام و پگاہ جانِ عالَم سوار ہونے لگا۔ سَیر و شکار کی طرف مائل ہوا۔ ایک روز گُزر اُس کا گُذری میں ہوا۔ اَنبوہِ کثیر، جمّ غفیر نظر آیا اور غُلغُلۂ تحسین و آفرِیں اَز زمیں تا چرخِ بریں بلند پایا۔ شہ زادہ اُدھر مُتوَجِّہ ہوا، دیکھا: ایک مردِ پیر، نحیف، سَتّر اَسّی بَرَس کا سِن، نہایت ضَعیف؛ پِنجرہ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ اُس میں ایک جانور مانندِ ساکنانِ جناں سبز پُوش، طائرِ بے مروّت، خانہ بَدوش؛ با منقارِ گُلنار لطیفے لطیف، رنگین اور نُکتے قابلِ تعریف، نمکین، مثالِ طوطیِ پسِ آئینہ بیان کر رہا ہے۔ تماشائیوں کی کثرت سے بازار بھر رہا ہے۔ لاَاَعْلَم:

در پسِ آینہ طوطی صِفَتَم داشتہ اند[1]

اُنچہ اُستادِ ازل گُفت، ہَماں می گویم

شہ زادے کے دیکھتے ہی تُوتا مالک سے بولا: اے شخص! کوکبِ بخت تیرا اِفلاس کے بُرجِ تیرَہ سے نکلا، نصیب چمکا۔ طالع بَرسرِ یاری و زمانہ آمادۂ مددگاری ہوا۔ دیکھ! ایسا شہ زادۂ حاتم شِعار، ابرِ گُہر بار مُتوَجِّہ اِس مُشتِ پَر، ذرّۂ بے مقدار پر ہُوا ہے۔ وہ بے کار شَے کارگاہِ بے ثبات میں ہوں، جس کا طالب نہیں کہیں۔ یہ حَدّ ہے کہ جانور ہوں اور بِلّی کا کھاجا نہیں؛ مگر جو یہ نظرِ عنایت کرے: ابھی تیرا ہاتھ پُر زَر ہو، دامن گُہر سے بھرے۔

جانِ عالَم نے یہ سخنِ ہوش رُبا، کلمۂ حیرت اَفزا کو سُن، تُوتے عقل

کے اُڑا، پنجرہ اُس طائرِ ہمہ داں، جانورِ سحر بیاں کا ہاتھ میں لے کے، مالک سے قیمت پوچھی۔ توتے نے کہا، مؤلّف :

کب لگاتا ہے کوئی اِس دلِ بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مُفلس کے غرض مال کا مول

مگر جو حُضور کی مرضی! جانِ عالم نے لاکھ روپے، خِلعت کے سِوا، عنایت کیے اور پنجرہ ہاتھ میں لیے دَولت سَرا کو روانہ ہوا۔ گھر میں جا، ماہ طلعت کو توتا دِکھا یہ مصرع اِنشا کا پڑھا، اِنشا :

بازار ہم گئے تھے، اک چوٹ مول لائے (۱)

توتے نے شہ زادے کو سخنانِ دل چسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شعرِ خوب، خمسہ ہائے مرغوب سُنا اپنے دامِ محبّت میں اَسیر کیا۔ یہ نَوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے، دربار کے سِوا، ایک دم جُدا نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا، پنجرہ بہ تاکیدِ حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا اور دربار سے دیوانہ وار، بہ شوقِ گُفتار بے قرار جلد پھر آتا۔

ایک دن شاہ زادہ دربار گیا، توتا محل میں رہا۔ اُس روز ماہ طلعت نے غُسل کیا اور لباسِ مُکلّف سے جِسم آراستہ، زیورِ پُر تکلّف سے پیراستہ ہو، جَواہر نِگار کُرسی پر بیٹھی۔ ہَوا جو لگی، آئینے میں صورت دیکھ خود محوِ تماشا ہوئی۔ بحرِ عُجب و نَخوت میں آشنا ہوئی۔ خَواصوں سے، جلیسوں سے؛ جو جو دَم ساز، محرمِ راز تھیں؛ اپنے حُسن وصورت کی داد چاہی۔ ہر ایک نے مُوافقِ عقل وشعور تعریف کی۔ کسی نے کہا: ہلالِ عید ہو۔

کوئی بولی : خُدا جانتا ہے، دید ہو نہ شُنید ہو۔ اللہ تعالیٰ نے، یہ اپنی کثرتِ مخلوقات، تمھارا ہمسَر۔ اَز قِسمِ جنّ و بَشَر بنایا نہیں۔ پری نے یہ قد و بالا، حور نے یہ حُسن کا جھمکڑا پایا نہیں۔

جب وہ کہہ چکیں، ماہ طلعت نے کہا : تُوتا بہت عقل مند، ذی شعور، سَیاحِ نزدیک و دور ہے، اُس سے بھی پوچھنا ضرور ہے۔ مُخاطِب ہوئی کہ اے مُرغِ خوش خُو و طائرِ زمُرّد لباسِ سُرخ رُو، بَذلہ سَنجِ بے رنج ! سچ کہنا، اِس سَج دھج کی صورت کبھی تیرے طائرِ وَہم و خیال کی نظر سے گزری ہے ؟

نیرنگیِ چرخِ کج رفتار، فتنہ پردازیِ گردونِ واژوں عیاں ہے۔ آگاہ سب جہاں ہے۔ اُس وقت تُوتا رنجیدہ دل، کبیدہ خاطر مُضمحِل بیٹھا تھا؛ چُپ ہو رہا۔ شہ زادی نے پھر پوچھا۔ تُوتے نے بے اِعتِنائی سے کہا : ایسا ہی ہو! یہ رنڈی معشوق مزاج، طُرّہ یہ کہ شہ زادے کی جُورو؛ شوہر مالکِ تخت و تاج؛ برہم ہو کے بولی : میاں مٹھو! جینے سے خفا ہو جو ہمارے رُو بہ رُو چبا چبا کر گُفتگو کرتے ہو؟ تُوتے نے کہا : سوال و جواب اَور، دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا، غُصّے کی آنکھ دِکھانا اَور ہے۔ کیوں اُلجھتی ہو، شاید تمھی سچّی ہو! پھر تو شُعلۂ غَضَب کانونِ سینۂ شہ زادی میں مُشتَعِل ہوا، کباب دل ہوا، کہا : کیوں جانورِ بدتمیز، ناچیز! تیری موت آئی ہے؟ کیا یہ بیہودہ ٹیں ٹیں مچائی ہے! واہی بک رہا ہے! ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا ہے! تُوتے کے مُنہ سے نکلا : کیوں اِتنی خفا ہوتی ہو، اپنا

مُنہ مُلاحظہ کرو؛ صاحب تم بڑی خوب صورت ہو!

یہاں تو یہ حَیص بَیص تھی، جانِ عالَم تشریف فرما ہوا۔ عجب صُحبت دیکھی کہ شہ زادی بہ چشمِ پُرآب و با دِلِ کباب، غَیظ میں آ، تھرّا تھرّا توتے سے بحث رہی ہے۔ شہ زادے نے فرمایا: خَیر باشد! توتا بولا: آج بَرا شَر ہے، خَیر بہ خَیر۔ مگر چَندے حیاتِ مُستعار اِس وَحشی کی اور آب و دانہ قَفَس میں پینا کھانا باقی تھا۔ اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے؛ تو میرا طائِرِ روح، گُربۂ غَضَبِ شہ زادی سے مجروح، پرواز کر جاتا، ہرگز جیتا نہ پاتے؛ مگر پنجرہ خالی دیکھ مزاجِ عالی پریشان ہوتا، بہ حسرت و افسوس یہ فرماتے، اِنشا:

توتا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا ①

ماہ طلعت اِن باتوں سے زیادہ مُکدّر ہوئی، شہ زادے سے کہا: اگر میری بات کا توتا جواب صاف نہ دے گا؛ تو اِس نگوڑے کی گردن مَروڑ، اپنے تلوؤں سے اِس کی آنکھیں مَلوں گی، جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جانِ عالَم نے کہا: کچھ حال تو کہو۔ توتے نے گزارِش کی: حُضور! یہ مُقدّمہ غُلام سے سُنیے۔ آج شہ زادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھر، بقا:

دیکھ آئینے کو، کہتی تھیں کہ اللہ ری مَیں! ②

پھر مجھ سے فرمایا: تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی تھی؟ مجھ اَجَل رَسیدہ کے مُنہ سے رَو میں نکلا: خدا نہ کرے! اِس جُرمِ قَبیح پر شہ زادی کے نزدیک کُشتنی، سوختنی و گردن زَدَنی ہوں۔ بہ قولِ میر تقی، شعر:

بے جُرم تہِ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو[1]
کچھ بات بُری مُنہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جانِ عالَم نے کہا: تم بھی کتنی عقل سے خالی، حُمق سے بھری ہو! تم تو پری ہو۔ اور جانور کی بات پر اِتنا آزُردہ ہونا! گو گویا ہے، پھر طائر ہے، نادانی اِس کی ظاہر ہے۔ میاں مٹھو کو اِن باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ بدل کے رُوکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولا: خُداوَندِ نعمت! جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے۔ ہمسَر جس کا کوئی نہیں، وہ ذات وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ کی ہے۔ اُس کے سِوا ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔ سب کو یہ خبر ہے: فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ میں نے جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا۔ اگر راستی پر ہوتا، گردن کَج کیے سیدھا گُور میں سُوتا۔ یہ سُن کے وہ اور مُجوّز ہوئی۔ مَثَل مشہور ہے: راج ہَٹ، تریا ہَٹ، بالک ہَٹ۔ جانِ عالَم نے مجبور ہو کے کہا: جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے! سچ کہہ دو۔ تُوتے نے بہ مِنّت عرض کی: دُرُوغِ مَصلَحت آمیز، بہ از راستیِ فتنہ انگیز۔ مجھے سچ نہ بُلوائیے، میرا مُنہ نہ کُھلوائیے۔ نہیں، انجامِ راستی حُضور کے دُشمنوں کو دَشت نَوَردی، بادِیَہ پیمائی، غَریبُ الوَطَنی، کوچہ گردی نصیب ہو گی۔

شہ زادے نے کہا: یہ جُملہ تم نے اور نیا سُنایا۔ اب جو کچھ کہنا ہے، کہا چاہیے، باتیں بہت نہ بنائیے۔ اُس نے کہا: میں نے ہر چند چاہا کہ آپ رنجِ سفر، مَصائبِ شہر بہ شہر، ایذاے غُربت سے باز رہیں۔ کہ

سفر اور سقر کی صورت ایک ہے، اِس سے بچنا نیک ہے؛ مگر معلوم ہوا حضور کے مقدر میں یہ اَمر لکھا ہے، میرا قصور اِس میں کیا ہے۔ رفیع سودا:

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو ①

سوزنِ تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

سنیئے قبلۂ عالم! یہاں سے برس دن کی راہ، شمال میں ایک ملک ہے عجائب زرنگار۔ ایسا خطّہ ہے کہ مرقعِ خیالِ مانی و بہزاد میں نہ کھنچا ہوگا اور پیرِ دہقانِ فلک نے مزرعۂ عالم میں نہ دیکھا ہوگا۔ شہر خوب۔ آبادی مرغوب۔ رنڈی، مرد حسین، طرح دار۔ مکان بِلّور کے بلکہ نور کے، جواہر نگار۔ عقلِ باریک بیں مشاہدے سے دنگ ہو۔ خلقت اِس کثرت سے بستی ہے کہ اُس بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو۔ خورشید ہر سحر اُس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے۔ بدرِ کامل وہاں دو دن نہیں رہتا؛ غیرت سے کاہیدہ ہو، ہلال نظر آتا ہے۔

وہاں کی شہزادی ہے انجمن آرا۔ اُس کا تو کیا کہنا! کہاں میری زباں میں طاقت اور دہاں میں طلاقت جو شمّہ مذکورِ شکل و شمائل اُس زہرہ جبیں، فخرِ لُعبتانِ لندن و چیں کا سناؤں۔ اُستاد:

ایک میں کیا، خوب گر دیکھے اُسے حسن آفریں ②

اپنی صنّاعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سو خواصِ زریں کمر، تاجِ دل بری برسر، ماہ رو، عنبریں مو، سرگروہِ خوبانِ جہاں، جانِ جاں، آرامِ دلِ مشتاقاں؛ اُس کی خدمت

میں شب و روز سرگرمِ خدمت گزاری، بڑی تیاری سے رہتی ہیں۔ اگر اُن کی لونڈیوں کو شہ زادی صاحب بہ چشمِ انصاف دیکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں؛ یقین تو ہے، چُلّو بھر پانی میں، مَحجوب ہو کے ڈوب جائیں۔ ماہ طلعت یہ سُن کے سَن ہوئی، سر جھکا لیا۔ جانِ عالم کو کچھ اَور ہی دھن ہوئی، پنجرہ اُٹھا لیا؛ دیوان خانے میں لے جا مُفصّل حال دریافت کرنے لگا۔ جی کا حال کچھ اور ہی ہو گیا، ہر دم آہِ سرد دلِ نیم بسمل سے بھرنے لگا۔ مولوی جامی:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد (1) بسا، کیں دولت از گفتار خیزد
در آید جلوۂ حُسن از درِ گوش ز جاں آرام بر باید، ز دل ہوش
ز دیدن ہیچ اثر نے درمیانہ کند عاشق کساں را غائبانہ

توتے کو شہ زادے کے طرزِ گفتگو، رنگِ رُو، آنکھ کی تری، ہونٹ کی خُشکی، دل کی دھڑک، کلیجے کی پھڑک سے کہ یہ نشانِ عشق، گُمانِ خبط سب ہیں؛ ثابت ہوا کہ شہ زادے کا دل پُرزے پُرزے اور دِماغ کا اَیاغ بادۂ عقل سے خالی ہوا، خیالِ مُحالِ وِصالِ انجمن آرا بھرا، خوب حالی ہوا۔ سخت نادِم و خَجِل ہو کے دل سے کہا: کم بخت زَبان نے، حُسن کے بیان نے غَضب کیا، مَنتَر کارگر ہوا، پڑھا جِن سر چڑھا، حضرتِ عشق کا گُزر ہوا۔ چاہا کہ بہ لَطائفُ الحِیَل اِس عَزمِ بیجا سے باز رکھّے، عقل اور عشق میں اِمتیاز رکھّے، کہا: اے ناداں، دشمنِ جاں! یہ قَصدِ لاحاصل ہے۔ عَمَداً اِس کوچے میں پاؤں نہ دھر، اپنے خون سے ہاتھ نہ بھر، بہ قولِ مُؤلِّف:

خُدا کو مان، نہ لے نام عاشقی کا سُرور
کہ مَنفعت میں بھی اِس کی، ہیں سَو ضَرر پیدا

بیان اِس کا مُحال ہے، مگر مختصر سا یہ حال ہے: عقل اِس کام میں دور ہو جاتی ہے، وحشت نزدیک آتی ہے۔ لب خشک، چشم تر، چہرہ زرد، دل خون ہوتا ہے۔ بھوک پیاس مرجاتی ہے، خواب میں نیند نہیں آتی ہے۔ جانِ شیریں تلخ ہو، کلیجے میں درد، آخر کو جُنون ہوتا ہے۔ لختِ جگر کھاتا ہے، خونِ دل پیتا ہے، مرمر کے جیتا ہے۔ رقیبوں کے طعنوں سے سینہ فگار ہوتا ہے۔ لڑکوں کے پتھروں سے سر کا رنگ گلنار ہوتا ہے۔ دن کو ذِلّت و خواری، شب کو انتظار میں اختر شماری۔ بے قراری سے قرار رہتا ہے۔ اپنے بیگانے کی نظر میں ذلیل و خوار رہتا ہے۔ جنگل میں جی لگتا ہے، بستی اُجاڑ معلوم ہوتی ہے۔ در بہ در پھرنے میں دن تو کٹ جاتا ہے، تنہائی کی رات پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ سینہ آتشِ غم سے جل کے تنوّر ہوتا ہے۔ آنکھوں سے دریا اُبلتے ہیں، طوفان کا ظہور ہوتا ہے۔ عقل کا چراغ گُل، تپِ فراق سے دل جلتا ہے۔ شجرِ تمنّا بے برگ و بار رہتا ہے، پھولتا ہے نہ پھلتا ہے۔ جوانی کا گھُن، پیری تک اُدھیڑ بُن رہتی ہے۔ گونگا بہرا بن جاتا ہے، ہر دم طبیعت سُن رہتی ہے۔ ابھی پہلی بسمِ اللہ ہے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو، لب پر آہ ہے۔ دیکھا نہ بھالا ہے، سینے کے پار عشق کا بھالا ہے۔ آئینہ ہاتھ میں لے مُنہ تو دیکھو، نقشہ کیا ہے۔ معشوقِ باوَفا گوگردِ سُرخ، لعلِ سپید سے نایاب سوا ہے؛ کہاں ملتا ہے۔ خاک میں، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے خواہاں ملتا ہے۔ یہ جو زمانے میں مشہور با مہر و وفا ہیں؛ بے وفا، بانیِ صد جور و جفا ہیں۔ عشق کم بخت بے پیر ہے، اُو نوجواں! یہی ٹیڑھی کھیر ہے۔ سُنا نہیں کوہ کن نے جانِ شیریں کس تلخی سے کھوئی! یوسف کی چاہ میں

زلیخا نے کیسے کنوئیں جھانکے، کیا کیا رُوئی! مجنوں کو اِس دَشت میں جُنون ہوا، لیلیٰ کا کیا بگڑا؟ پرویز کا اِس کوچے میں خون ہوا، شیریں نے کیا کیا؟ افسوس تو یہ ہے کہ اِتنا بھی کوئی نہ سمجھا، جامی :

غمِ چیزے رگِ جاں را خراشد[1]

کہ گاہے باشد و گاہے نباشد

ذِلّت اِس کام میں عَین عزّت ہے۔ درد کا نام یہاں راحت ہے۔ دل اِس کشمکش میں ٹوٹ جاتا ہے۔ رُستم کا اِس مَعرکے میں جی چھوٹ جاتا ہے۔ اِسفَندِیار سا رُوئیں تن ہو، تو مُوم کی طرح پگھل کر بہ جائے، حسرت ہی حسرت رہ جائے۔ لوگوں نے ہزاروں رنج، صدمے اِس کام میں اُٹھائے؛ بعدِ خرابیِ بِسیار ناتجربہ کار کہلائے۔ وہ یہ بُرا کام ہے؛ ناکامی جس کا آغاز، بدنامی انجام ہے۔ مُبتَدی ہو یا مَشّاق ہے، دونوں کی رائے ایک سی ہوتی ہے۔ صدمۂ دوری، المِ حضوری شاق ہے۔ مَرَضِ عشق میں کوئی دوست گرفتار نہ ہو۔ مؤلّف :

دوست تو دوست ہے، دشمن کو یہ آزار نہ ہو

مُسَدّس :

کیا میں اِس کافرِ بدکیش کا اَحوال کہوں یہی خوں خوار، پیا کرتا ہے عاشق کا خوں

زار کر دیتا ہے انسان کو یہ اور زَبوں رفتہ رفتہ یہی پہنچاتا ہے نوبت بہ جُنوں

یہی خوں ریز تو خوں خوار ہے انسانوں کا

دین کھوتا یہی کافر ہے، مسلمانوں کا

یہی کرتا ہے ہر اک شخص کو رسوا، ظالم
یہی کرتا ہے ہر اک چشم کو دریا، ظالم
کوہ دکھلاتا ہے گاہے، گہے صحرا، ظالم
کیا بتاؤں تمھیں، کرتا ہے یہ کیا کیا ظالم

در بہ در، خاک بہ سر، چاک گریباں کرکے
جان لیتا ہے، قلے بے سر و ساماں کرکے

یہی بانی تو زلیخا کی بھی تھا خواری کا
یہی باعث دمن و نل کی ہُوا یاری کا
یہی فرہاد کی، حامی تھا، تبر داری کا
عشق کہیے نہ اِسے، قہر ہے یہ باری کا

تلخ کامی ہوئی شیریں کو اسی سے حاصل
کیے بے پردہ و برباد ہزاروں محمل

اِس نے مجنوں سے بنائے ہیں بہت دیوانے
اِس نے خود رفتگی میں، اپنے کیے بیگانے
گو کہ مشہورِ جہاں اِس کے ہیں سب افسانے
پر، جو اِس کام کا مشّاق ہو، وہ ہی جانے

کبھی معشوق کے پردے میں نہاں ہوتا ہے
کبھی سر چڑھ کے یہ عاشق کے، عیاں ہوتا ہے

ناقۂ لیلیِ مُضطر کا شُتربان یہ تھا
نجد میں قیس سے پہلے ہی حُدی خواں یہ تھا
چاہ میں ڈال کے، یوسف کا نگہباں یہ تھا
جان ہر شیر کی لینے کو، نیستاں یہ تھا

حُسن بن جاتا ہے، انداز کہیں، ناز کہیں
دردِ دل ہے یہ کہیں، سُوز کہیں، ساز کہیں

مثلِ فرہاد بہت مر گئے سر پھوڑ، حزیں
دی ہے شیریں کی طرح کتنوں نے جانِ شیریں
پاس عذرا کے گیا اور کوئی وامق کے قریں
اِس سے آوارہ بچا اور نہ بچا گوشہ نشیں

اِس سے ملتا ہے جسے، رنج و محَن ملتا ہے
گور ملتی ہے کسی کو نہ کفن ملتا ہے

طور کو نور کے جلوے میں جلایا اِس نے
کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اِس نے
جان چھوڑی نہیں، جیتا جسے پایا اِس نے
اور نیرنگ جہاں اپنا دکھایا اِس نے

کام مُردوں سے لیا، زندوں کو ناکام رکھا
درد کا نام بھی بے درد نے آرام رکھا

اِس کے افسانے ہیں دُنیا میں بہت طول و طویل
جس کا ہمدم یہ ہوا، ہو گیا وہ خوار و ذلیل
اِس کا بیمار، پڑا رہتا ہے بستر پہ علیل
دھونس دے دے کے، بجا دیتا ہے یہ کوسِ رحیل

رنج و ماتم کے سوا، اور یہ کیا دیتا ہے
وصل کی شب سحرِ ہجر دکھا دیتا ہے

یہی اِخفا ہے بہ صد زیب رگِ ہر گُل میں
سوز و نالہ یہ اِسی کا ہے دلِ بلبل میں
یہی ہے جزو میں، اگر دیکھو، یہی ہے کُل میں
گر فرشتہ ہو، تو آجاتا ہے اِس کے جُل میں

خونِ بے جرم زمانے کا بہاتے دیکھا
مَیل چِتون پہ کبھی اِس کی نہ آتے دیکھا

ایک شمّہ ہے، لکھا حال جو میں نے اِس کا
جس پہ اِس دیو نے اَلطاف کا سایہ ڈالا
دشتِ غُربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا
دوست بھی چھوٹتے ہیں، شہر بھی چھوٹے اپنا

پاس جس کے یہ گیا، خلق سے وہ دور ہوا
کون سا شیشۂ دل تھا کہ نہ وہ چور ہوا

ہجر کے رنج میں کتنوں کا ہوا اِس میں وِصال　　لے گئے سینے میں فرقت کا سبھی درد و ملال
اِس کی گردش سے ہر اک ماہ ہوا بَدر، ہِلال　　کس کی طاقت ہے جو تحریر کرے اِس کا حال

زیست کرتا غمِ ہجراں سے یہ ہے سب کی شاق
جان دے دیتے ہیں کہہ کہہ کے یہی: ہائے فراق!

وصل میں گو مزہ ہے، ہِجر کا رنج وَلے جاں گزا ہے۔ چاہ، کُنوَیں جھکواتی ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جو جان کے ساتھ جاتی ہے۔ ہمیشہ سے اِس کام والے آہ و نالہ بَرلَب، خاک بہ سَر، چاک گرِیباں سب رہے ہیں۔ اگر عاشق کی عزّت و توقیر ہوتی، تو دُنیا میں اِس سے بہتر کوئی شَے نہ تھی۔ جستہ جستہ اِن لوگوں کے مرتبہ شَناس، قَدرداں ہیں؛ مگر ہر جگہ کہاں ہیں! اور یہ قصّہ جو میں نے کہا، فَقَط بات کی پیچ کا جھگڑا تھا؛ ورنہ کہاں مُلکِ زرنگار، کُجا شہ زادیِ عالی تبار! جانِ عالَم نے کہا: اَستَغفِرُاللہ! اگر وہ جھوٹ تھا، تو یہ فِقرہ کب سچ ہے۔ یہ تو نِری کُھڑ پیچ ہے۔ سوز:

خدا ہی کی قسم ناصح! نہ مانوں گا کہا اب تو[1]
نہ چھوٹے گا ترے کہنے سے، میرا دل لگا اب تو

اِسی تقریر میں یہ حال ہوا کہ دل میں درد، چہرہ زرد ہونے لگا۔ لب پر آہِ سرد، گرِفتارِ رنج و تعَب، عشق کے آثار سب ظاہر ہوئے۔ شاہ زادے صاحب جامے سے باہَر ہوئے۔ ضبط کا پردہ درمیاں سے اُٹھا۔ شُور فغاں سے اُٹھا۔ جنون پیرامُونِ عقل۔ بے چارہ نَوگرِفتار سلسلۂ محبّت میں اسیر بہ قولِ میر ہو گیا۔ طالِع بیدار دَفعَۃً سُویا، فتنہ چونک کر جاگا۔ دل، بَر سے نکل بھاگا۔ میر:

طبع نے اک جنوں کیا پیدا ① اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
ہاتھ جانے لگا گریباں تک چاک کے پاؤں پھیلے داماں تک
بے قراری نے کج ادائی کی تاب و طاقت نے بے وفائی کی

توتا یہ حال دیکھ کر محجوب ہوا کہ ناحق، رنڈی کی کج بحثی سے، شہزادے کو مرگ کا مستعد کیا۔ بیٹھے بٹھائے خونِ بے گناہ اپنی گردن پر لیا۔ اب اِس طرح کا سمجھانا، مانع ہونا: اُبھارنا، بھڑکانا، بلکہ نرا جلانا ہے۔ گھبرا کر تسکین و تشفی کرنے لگا اور زخمِ شمشیرِ عشق کو مرہمِ مژدۂ وصال سے بھرنے لگا۔ کہا: آپ ہوش و حواس بجا رکھیے۔ اگر مجھے ایسا سچا جانا کہ میرا جھوٹ، سچ مانا؛ اِس شرط سے آپ کو لے چلوں گا: جو میرا کہا نہ مانو گے؛ زک اُٹھاؤ گے، دھوکا کھاؤ گے، پھر مجھ کو نہ پاؤ گے، پچھتاؤ گے۔ جانِ عالم نے فرمایا: اے رہ برِ کامل، رنج کے غم گسار، راحت کے شامل! تیرے جادۂ اِطاعت سے ہرگز قدم باہر نہ دھروں گا۔ جو تو کہے گا، وہی کروں گا۔ مگر جلد حالِ مفصّل اور بُعدِ منازل و سمتِ شہرِ دوست سے نشانِ کامل دے؛ وگرنہ یہ دلِ بے تاب، خجلت دِہِ بے قرارئ سیماب، کہ قطرۂ خوں سے فزوں نہیں؛ تڑپ کر، از راہِ چشمِ نادیدۂ رُوئے دوست نکل جائے گا۔ پھر بجز حسرت و افسوس تیرے کیا ہاتھ آئے گا۔

میر: دل تڑپتا ہے متّصل میرا ②
مرغِ بسمل ہے، یا کہ دل میرا

توتے نے کہا: اِضطراب کا کام خراب ہوتا ہے، ناحق حجاب ہوتا ہے۔

اِتنی جلدی موقوف کیجیے۔ آج کی رات اِس شہر میں کاٹ، صُبح اُدھر کی راہ لیجیے۔ اگر کشِش صادِق اور طالِع بھی مُوافِق ہے؛ منزلِ مقصد کا سفر درپیش ہوگا، ہمراہِ رَکاب یہ خیر اَندیش ہوگا۔ عَزمِ بالجَزم درکار ہے۔ درِ شہر پناہ پر خانۂ دل دار ہے۔

جانِ عالم یہ خوش خبری سُن کے بَشّاش ہوا۔ پھر کہا، اُستاد:

مُژدۂ وصل ہے کل، رات کی نیّت ہو حرام ①
دیں اگر طالعِ برگشتہ نہ تدبیر اُلٹ

اُس رات کی بے قراری، گریہ و زاری، اختر شُماری شہ زادے کی کیا کہوں! ہر گھڑی بہ حالِ پریشان سُوئے آسماں مُضطر نگراں تھا کہ رات جلد بسر ہو، نُمایاں رُخِ سَحَر ہو، تا عَزمِ سفر ہو۔ اور یہ کہتا تھا، سعدی:

سعدیا! نوبتی اِمشب دُہُلِ صبح نکوفت ②
یا مگر صبح نباشد شبِ تنہایی را!

آخر بہ تاثیرِ دُعاے سَحَری، اَثرِ نالۂ نیم شبی سے ظُلمتِ شب، بہ نورِ رُوز مُنوّر ہوئی۔ وزیر زادے کو، باوُجودِ خود فَراموشی، یاد فرمایا۔ لڑکپن سے تا زمانۂ عشقِ انجمن آرا، اُس سے بھی اُلفت رکھتا تھا۔ جب وہ حاضر ہوا، حُکم کیا: دو گھوڑے صبا رفتار، برق کردار؛ جن کی جَھپَٹ نسیمِ تُند رَو کو کُھنْدَل ڈالے، اُن کے قدم سے کُمیتِ صَرصَر کی ڈَپَٹ پاؤں نہ آگے نکالے؛ جلد لا۔ وہ بہ مُجرّدِ اِرشاد اَصطَبلِ خاص میں جا، گھوڑے لایا۔ کچھ اسبابِ ضَروری، وہ بھی بہ مجبوری سے لے کے؛ دونوں

خستہ تن، بہ قولِ میر حسن چل نکلے۔ میر حسن:

نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی[1]
نکل شہر سے، راہ جنگل کی لی

وطن آوارہ ہونا نو گرفتارِ محبّت کا، اُٹھانا ایذائے غُربت کا۔ نیا نیا سفر، راہ معلوم نہیں، رہ بَر بجز ذاتِ حَیِّ قَیّوم نہیں۔ ایک رفیق، وہ اکیلا۔ دوسرا جانور، یہ بے چارہ بے پَر۔ پھر ہِرن کا ملنا، اِن سب کا چھوٹنا، جادوگرنی کا سَدِّ راہ ہو کے مزے لوٹنا۔

بادیہ پیمایانِ مرحلۂ محبّت و صحرا نَوَردانِ منزلِ مَوَدّت؛ رہ رَوانِ دَشتِ اِشتیاق و طے کُنندگانِ جادۂ فِراق؛ مسافرانِ بارِ ناکامی بَردوش، بجُز راہِ کوچۂ یار دین و دُنیا فَراموش؛ عشق سر بر سوار، خود پیادہ؛ زیست سے دل سیر، مرگ کے آمادہ لکھتے ہیں کہ جب بہ ایں ہَیئَتِ کذائی، وہ پَروَردَۂ دامنِ ناز و آغوشِ شاہی گھر سے نکلا اور دَرِ شہر پناہ پر پہنچا؛ پھر کر عماراتِ سُلطانی، بسے ہوئے شہر کو بہ نظرِ پریشانی دیکھ، آہِ سردِ دلِ پُر درد سے کھینچی۔ بیاباں مدِّ نظر کر، غریب الوطنی پر کمرِ ہمت چُست کی اور فراقِ یارانِ وطن میں دل کھول کے وہ خستہ تن خوب رُو دیا۔ پھر فاتحۂ خیر پڑھ، آگے بڑھ، تُوتے کو

پنجرے سے کھول دیا۔ گھوڑوں پر شہ زادہ اور وزیر زادہ، سمندِ صبا پر میاں مٹھو پیادہ، نیا دانہ کھاتے، نیا پانی پیتے روانہ ہوئے۔

بعدِ طَیِّ منازِل و قطعِ مراحل اِن کا گزر ایک دشتِ عجیب، صحرائے غریب میں ہوا۔ ہر تختہ جنگل کا بہ رَوِشِ باغ تھا۔ جو پھول پھل تھا؛ تازہ کُنِ دل، مُعطّر نمائے دِماغ تھا۔ جہاں تک بیکِ نگاہ جاتا، بجز گُل ہائے رنگین و یاسمن و نسرین اور کچھ نظر نہ آتا۔ شہ زادہ شگفتہ خاطری سے صنّاعی باغبانِ قضا و قدر کی دیکھتا جاتا تھا۔ ناگاہ ایک سمت سے دو ہرن برق وَش، صبا کردار، سُبک جَست، باچشمِ سیہ مست، تیز رفتار سامنے آئے۔ زربفت کی جھولیں پڑیں، جڑاؤ سنگوٹیاں جڑیں۔ گلے میں مُغرّق ہیکلیں، مِثلِ معشوقِ طنّاز عربدہ ساز، سرگرمِ خرامِ ناز، چھم چھم کرتے، چوکڑیاں بھرتے۔ جانِ عالم بے چین ہوا، وزیر زادے سے کہا: کسی طرح اِن کو جیتا گرفتار کیجیے، جانے نہ دیجیے۔ اِس سَعی میں گھوڑے ڈالے۔ یا تو وہ اپنی وضع پر چلے جاتے تھے؛ جب گھوڑوں کی آمد دیکھی؛ سنبھل، کنوتیاں بدل، چوکڑی تیز باجَست و خیز بھرنے لگے۔ اِنھوں نے گھوڑے ڈپٹائے۔ اِن کا گھوڑے دوڑانا، وہ طائرِ فرزانہ چوکڑی بھول کے پکارا: ہاں ہاں، اے نوجواں! کیا غضب کرتا ہے! یہ دَشت پُر سِحر ہے، بیہودہ کیوں قدم دھرتا ہے! ہر چند پکارا، مگر سنّاٹے میں کسی نے نہ سُنا، توتے نے لاکھ سر دُھنا۔ آخر مجبور ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھ رہا، وہ چلے گئے۔

دو چار کوس دونوں ہرن ساتھ بھاگے؛ پھر ایک اَور سمت،

دوسرا اور طرف چلا۔ ایک کے ساتھ شہ زادہ، دوسرے کے تعاقب میں وزیر زادہ۔ یہ بھی جُدا ہوئے۔ اَلقِصَّہ تا غُروبِ آفتاب وہ شمسِ سپہرِ سلطنت گھوڑا بگٹٹ پھینکے گیا۔ دَفعَۃً ہرن نظر سے غائب ہوا۔ اِس نے باگ رُوکی۔ گھوڑا عَرَق عَرَق، خود پسینے میں غَرَق، سر سے پا تک تر، بہ حالِ مُضطر، حیران و پریشاں، نادم و پشیماں، یکّہ و تنہا، وزیر زادہ نہ تُوتا، آپ یا دَشتِ پُر خطَر۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر بہت دیکھا، بوے انسان وحیواں مَشامِ جاں تک نہ آئی، طبیعت سخت گھبرائی۔ جب کسی کو نہ دیکھا، بہ صد یاس یہ کہا، شعر:

اُڑے یہ ترنگ جوانی کی، کیا جس نے مجھ کو جَلا وطن①
ہوا ایسا پیش ازیں کاہے کو، مَیں نکل کے گھر سے خراب تھا

اور کبھی جو یادِ یارانِ ہمراہی جی میں آتی تو یہ شعرِ دردناکِ میر سوز بادِلِ صد چاک و آہِ جگر دُوز پڑھتا، میر سوز:

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو②
راہ ملتی ہی نہیں دشت کے آواروں کو

کچھ آگے بڑھا، چشمۂ آب نظر پڑا۔ گھوڑے سے کود ہاتھ مُنہ دُھویا، اپنی تنہائی پر خوب رُویا۔ اُسی حالِ گریہ وزاری میں دستِ دُعا بہ جنابِ باری اُٹھا پکارا کہ اے کَسِ بے کَسان و اے مددگارِ رَہ گُم کردگاں! مجھ خستہ و پریشاں، دور فُتادۂ یار و دِیار کی رہ بَری کر۔ تیرے بھروسے پر سلطنت کو خاک میں مِلا، گھر سے ہاتھ اُٹھا، آوارۂ صحراے غُربت، مُبتلاے رنج و مصیبت

ہوا ہوں۔ لا اَعلَم :

نہ مونسے، نہ رفیقے، نہ ہمدمے دارم　　حدیثِ دل بکہ گویم، عجب غمے دارم

تیری ذات ہے یا یہ جنگل وحشت اَنگیز، دَشتِ بلاخیز؛ جہاں بُوئے عمرانات نہیں آتی ہے، دَھڑکے میں جان جاتی ہے۔ یہ کہہ کے زار زار مانندِ ابرِ نَوبہار رونے لگا، دامن وگریباں بھگونے لگا۔ فریاد و زاری، تڑپ اور بے قراری اُس کی بہ درگاہِ مُجیبُ الدَّعوات قبول ہوئی۔ تیرِ دُعا ہَدَفِ اِجابَت سے لَبِ معشوق ہوا۔ ایک پیر مرد سفید ڈاڑھی والے، سبز عمامہ بسر پر، عَبائے عُنّابی کندھے پر ڈالے، ہاتھ میں عَصا، خِضرصورت، بُزُرگ سیرت، پارسا؛ وارِد ہو پکارے :
اَلسَّلامُ عَلَیکَ اے نَوباوۂ چَمَنِ سلطنت و اے گرِفتارِ محنتِ مَحبّت ! شہ زادے نے آنسو پُونچھ سلام کا جواب دیا۔ پیر مرد نے فرمایا : اے عزیز ! کیا حاجت رکھتا ہے، بیان کر۔ یہ سُن کے ایسا خوش ہوا کہ رنج راہ بھولنے کا بھولا۔ وزیر زادے اور تُوتے کی جُدائی بھی یاد نہ آئی، کہا : آپ کو قَسَم اُسی کی جس نے میری رہ بَری کو بھیجا ہے، جلد نشانِ مُلکِ زرنگار دکھادیجیے، یا دَرِ دل دار تک پہنچادیجیے۔ وہ سِتُودَہ صِفات ہنسا اور کہا : اللہ رے بے خودی ! ابھی بلائے ناگہانی، آفتِ آسمانی، جس میں آپ پھنسے ہیں، اُسی سے نَجات نہیں پائی، معشوقہ یاد آئی ! جانِ عالَم نے کہا : کوئی آفت و ستم و بلا ہجرِ جاناں اور مُفارَقتِ دوست سے سِوا نہیں ہے۔ میر سوز :

نہ لگے دردِ جُدائی کو قیامت کا رنج[1]
روزِ محشر کو نہ میری شبِ ہجراں سے مِلا

اُس صاف باطن نے فرمایا: صاحِب زادے! یہ صَحرائے غَضَب، دَشتِ پُر تَعَب ہے۔ ہر تختہ اِس کا دامِ ستم، گُل اور بوٹا نِرا خارِ غم والَم ہے۔ یہاں کا پھنسا، اُلجھا؛ حَشر تک نہیں چُھٹتا۔ یہ سب کارخانۂ طِلسم ہے۔ شہ زادے نے کہا: ہم سِحرِ مَحبّت میں گرِفتار ہیں؛ ہمیں جینا، مرنے سے فُزوں ہے۔ دل کا حال دِگر گوں ہے۔ شیفتہ:

ہمیشہ آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے[2]
الٰہی! موت دے، گزرا میں ایسے جینے سے

اُس کریمُ النَّفس کو اِس کے حال پر رَحم آیا، فرمایا: بدحواس نہ ہو، نظر بہ خُدا رکھ کہ وہ چارہ سازِ عالَمیں، جامعُ المُتفرِّقین ہے۔ شہ زادے نے کہا: فی الحقیقت، مگر برائے خدا ایک نظر ملکِ زرنگار اور وہ معشوقِ طَرح دار اگر نظر آئے، جانِ زار بچ جائے۔ زیست کا کیا اِعتبار ہے، مَرگ ہر دم ہم کِنار ہے، حسرتِ دید تو نکل جائے۔ اُس خدا پَرست نے فرمایا: آنکھ بند کر۔ پلک سے پلک شہ زادے کی لگی، مُلکِ زرنگار میں گُزار ہوا، آفتِ تازہ سے دوچار ہوا اور صورت اُس حوَر کردار کی نظر پڑی۔ بہ مُجرّد نگاہ، دل سے آہ کی۔ بے ہوشی ساری، غَشی طاری ہوئی۔ مردِ بُزرگ نے سمجھایا: اِس اَمرِ لاطائل سے کیا حاصل! زِندگی درکار ہے، ایک روز دوست بھی ہَم کِنار ہے۔ سمجھانے سے اِتنی تسکین ہوئی کہ آنکھ کھولی۔ رات ہوگئی

تھی؛ پیرمرد نے کچھ کھلا، لبِ چشمہ سُلایا۔

جس وقت اُفُقِ چرخ سے، راہ گُم کردہ مُسافرِ مَغرِب، یعنی آفتابِ عالَم تاب جلوہ اَفروز ہو حصّۂ چہارُم آسماں پر آیا، شہ زادے کی آنکھ کھلی۔ وہاں آپ کو پایا جہاں سے ہِرَن کے پیچھے گھوڑا اُٹھایا تھا۔ سِجدۂ شُکر ادا کر سَرگرمِ رَہِ دوست ہوا۔ راہ کا پتا اُس رہ بَرِ خَیلِ سَبز پُوشاں سے پوچھ لیا تھا۔ قدم بڑھایا۔ جاتے جاتے، ایک روز آفتاب کی تَمازَت بہ درجۂ اَتَم تھی، پیاس کی شِدّت ہوئی۔ آب وہاں گوہرِ نایاب تھا۔ خِضر تک اُس دَشت میں لاعلاج، پانی کا محتاج تھا۔ زَبان میں کانٹے پڑے۔ رِیت کی گرمی سے تَلوے جلتے تھے۔ دو گام قدم نہ چلتے تھے۔ لُو کا شُعلہ یہ سَرگرمِ آزارِ جگر سُوختگاں تھا کہ پرِندے پتّوں میں مُنہ چھپاتے تھے۔ کُوسوں دَرِندے نظر نہ آتے تھے۔ دشت، کُوزۂ آہَنگَراں تھا۔ ہرطرف شُعلۂ جَوّالہ دَواں تھا۔ رِیگِ صحرا کیفیتِ دریا دِکھاتی تھی، پیاسوں کی دَوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی۔ صدائے زاغ و زَغَن سے سَنّاٹا، دھوپ کا تڑاقا۔ دَشت کا پتھر تپنے سے انگارا تھا۔ جانور ہر ایک پیاس کا مارا تھا۔ وہ تابِشِ شَمس جس سے ہِرَن کالا ہو، مذکور سے زَبان میں چھالا ہو۔ بادِ سَموم سے وَحشیوں کے مُنہ پر سِیَہ تاب تھا۔ لُو سے گاوِ زمیں کا جگر کباب تھا۔ سیپیوں نے گرمی کے مارے لب کھولے تھے۔ حَبابِ دریا کی چھاتی میں پھپھولے تھے۔ ہر ذی حیات حرارت سے بے تاب تھا۔ سوا نیزے پر آفتاب تھا۔ مچھلیاں پانی میں بُھنتی تھیں، جل جل کر کَنارے پر سر دُھنتی تھیں۔ سَرطانِ فلک جلتا تھا۔

کیکڑا لبِ دریا اُبلتا تھا۔

ایسے مَوسم کے سفر میں مَفر کیوں کر ہو۔ مُسافر خواب میں بَرّاتے: چُلّو بھر پانی دُو۔ درخت خشک، سوکھے پتّے کھڑکھڑاتے تھے۔ جانور پَر کھولے پھڑپھڑاتے تھے۔ چار پایے ایک سِمت ہانپتے تھے، گرمی کے خوف سے کانپتے تھے۔ یہ حَرارت مُستَولی تھی کہ دوستوں کی گرمی سے جی جلتا تھا۔ مُسافِرِ وَہم پاے گُماں سے راہ نہ چلتا تھا۔ خورشیدِ حشر کی طَرح آفتاب تاباں تھا۔ صحراے قیامت وہ بیاباں تھا۔

اِسی حالِ خراب میں شہ زادہ سَرگَشتہ، دِل بِرِشتہ، حیران پریشان؛ ایک طرف درخت گُنجان، سایہ دار دیکھ کر آیا۔ وہاں حَوض، مُصَفّیٰ پانی سے مُلَبَّب بھرا پایا۔ پانی دیکھ کے جانِ رَفتہ تَن میں آئی۔ آنکھوں نے لہروں سے ٹھنڈک پائی۔ گھوڑے سے اُتر، پانی پینے کو جُھکا؛ چَرخِ کُہَن نے نیرنگی نئی دِکھائی: وہی معشوقۂ مرغوبۂ مطلوبہ، جس کے سَیلِ تلاش میں غَریقِ مُحیطِ اَلَم، گِرِفتارِ لَطمۂ غَم، مِثلِ پَرِکاہ بہا بہا پھرتا تھا؛ حَوض میں نظر آئی۔ آنکھ چار ہوتے ہی وہ بولی: اے شِناوَرِ بحرِ مَحبّت و اے غَوّاصِ چشمۂ اُلفت! دِیر سے تیری مُنتَظِر تھی، لِلّٰہِ الحَمد تو جلد پہنچا۔ تاَمُّل نہ کر، کود پڑ۔ اِنھیں تو وہ آنکھ بند کرنے کا نقشہ ہر پَل مَدِّ نظر تھا؛ بےتاَمُّل نہنگِ آفت کے مُنہ میں کود پڑا؛ زیست سے سیراب ہو، یہ کہتا، شعر:

(1) کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا جو کام ہوا ہم سے، وہ رُستم سے نہ ہوگا

کودتے ہی سر تلے، ٹانگیں اوپر، غلطاں پیچاں تحت الثریٰ کو چلا۔ گھڑی بھر میں تہ کو پاؤں لگا۔ آنکھ کھولی۔ نہ حوض نظر آیا نہ اُس دُرِ شہوار کو پایا؛ مگر صحرائے لق و دق، جسے دیکھ کے رُستم اور اِسفندیار کا رنگ فق ہو، دیکھا۔ اُس وقت سمجھا: دوسری زک اُٹھائی، تُوتے کی بات آگے آئی، مصرع:

وای بر ما و گرفتاریِ ما

یہ کہہ کے آگے چلا۔ دور سے چار دیواری معلوم ہوئی۔ جب قریب آیا، باغ اور عمارتِ مُفصّل دیکھی۔ درِ باغ بسانِ آغوشِ مُشتاق، وا۔ سردِ سرد ہوا۔ یہ تو گرمی کا مارا، وطن آوارہ تھا، بے تکلّف اندر قدم رکھا، باغ میں آیا۔ قطعہ، دل چسپ پھولا پھلا پایا۔ تختہ بندی معقول۔ پیڑ خوش قطع، خوب صورت پھول۔ رَوِشیں صاف، نہریں شفّاف۔ چشمے ہر سمت جاری، نئی تیّاری۔ درختوں پر جانورانِ نغمہ سرا۔ برگ و بار و گُل سے بِالکُل باغ بھرا۔ باغبانیانِ پَری وَش ہر رَوِش پر بہ رَوِشِ دل بَری خراماں۔ شاخوں پر بُلبُلیں غزل خواں۔ بیچ میں بارہ دری عالی شان، سب تکلّف کا سامان۔ اُس کے مُتَّصِل چبوترا سنگِ مرمر کا، باذلے کا سایبان کھنچا، مسندِ مُغرَّق بچھی۔ ایک عورت خوب صورت عجب آن بان سے اُس پر بیٹھی۔ خواصیں دست بستہ گرد و پیش، وہ مغرور بہ حُسن و جمالِ خویش۔

شہ زادے کو دیکھ کر ایک خواص پُکاری: اے صاحِب! تم کون ہو؟

جان نہ پہچان، بے دھڑک پرائے مکان میں چلے آئے! یہ تو زیست سے بیزار، مرگ کا طلبگار تھا؛ اُسے جواب نہ دیا، بے تامّل مسند پر برابر جا بیٹھا یہ شعر پڑھتا، اُستاد:

بھڑ بیٹھے ہو دو زانو، وضعِ مؤدّب اُس سے[1]
وَضعی جو تھا، تو ہم کو دابِ اَدب نہ آیا

وہ تو فریفتۂ قدیم تھی، ہنس کے چُپ ہو رہی۔ پوچھا: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ شہ زادہ مُتحیّر باغ کو دیکھ رہا تھا۔ جو پیڑ تھا، پَر دار جانور کی صورت۔ پھول کِھلے، پھل تیّار، آپس میں سَرگرمِ گُفتار۔ جس میوے پر رغبت ہو؛ اُس درخت کا جانور سامنے آ رَقص کرے؛ پھل بے ہاتھ لگائے مُنہ کے پاس آئے۔ جتنا اُسے کھاؤ، ثابت پاؤ۔ جب طبیعت سیر ہو، اُسی درخت میں دیکھ لو۔ یہ حرکتیں اُس کی خَواصیں شہ زادے کے دِکھانے کو، درپردہ ڈرانے کو کرتی تھیں۔ اِس تَرپینے سے جانِ عالم کو یقین ہوا کہ یہ سب جادو کا ڈَھکوسلا ہے۔ پیرِ مرد سچ فرماتا تھا۔ افسوس، بُرے پھنسے!

یہ تو اِن خیالوں میں تھا، اُس نے مُکرّر پوچھا۔ شہ زادے نے جواب دیا کہ ہمارا آنا جانا تمھی خوب جانتی ہو۔ اجنبی ہیں، مگر تم پہچانتی ہو۔ وہ مُسکرائی، خَواصوں سے کہا: آپ مہمان ہیں، مُروّت شرط ہے۔ اُنھوں نے کچھ اشارہ کیا۔ کَشتیاں شراب کی، قابیں گزک کو کباب کی، مَعِ جام و صُراحی خود بہ خود آئیں۔ اور مینائے بے زَباں، پُنبہ دہاں،

رَقصاں یہ بُولی، حافظ :

اگر شراب خوری، جُرعۂ فشاں بر خاک (1)

ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر، چہ باک

پھر دَفعَۃً جامِ لَب رِیز، بریز بریز کہتا، خندہ زَناں، جانِ عالَم کے قریب آکے بولا، حافظ :

بنوش بادہ کہ ایّامِ غم نخواہد ماند (2)

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

شہ زادے نے انکار میں مَصلَحت نہ دیکھی۔ ڈرا کہ اگر عُذر کروں اور اسی طَرح یہ شراب بے قَصد حَلق میں اُترے، تو کیا لُطف رہے؛ مگر صاحبِ خانہ سے آنکھ ملا، بہ صَد حسرت یہ شعر پڑھا، لا اَعلَم :

یار سے ہے لطف مے کا، آہ یہ ہو، وہ نہ ہو (3)

یہ کوئی صُحبت ہے ساقی! واہ یہ ہو، وہ نہ ہو

پھر اُس جام کو ناکام ہاتھ میں لے کے، لہو کے سے گھونٹ، گلا گھونٹ گھونٹ پیے۔ وہ دَورَہ بے سَر انجام، پُر آلام گردِش میں آیا۔ جب دو چار ساغَر مُتَواتِر جادوگرنی نے پیے؛ کاسۂ دِماغ سے عَقل دُور، وَلولۂ مستی سے معمُور ہو، چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ شاہ زادہ اُس کا اِختِلاط، کَج بَحثی سے بدتر جانتا تھا۔ مجبور، گردِشِ گَردُونِ دُوں دیکھ کر، کچھ ہاں ہوں کر دیتا۔ سچ ہے: جسے جی پیار کرتا ہے؛ اُس کی گالی، بَدرُجی کے بُوس و کِنار سے زیادہ مزہ دیتی ہے۔ اِسی

صُحبت میں آدھی رات گزری۔ خاصہ طلب کیا۔ دو چار نوالے جانِ عالم نے بہ جبر، پانی کے سہارے سے، اُگل اُگل، حلق کے نیچے اُتارے۔ اُس مَر بُھکّی نے قرار واقعی ہتّھے مارے۔

کھانا زہر مار کر، شہ زادے کا ہاتھ پکڑ بارہ دری میں لے گئی۔ جواہر نگار مَسہری پر بٹھایا۔ ایک تو شراب کا نشہ، دوسرے عالمِ تنہائی؛ بیٹھتے ہی، شرم و حجاب کا پردہ اُٹھا لپٹ گئی۔ وہ سَرکا۔ پھر تو خفیف ہو کے بولی: تو نے سُنا ہوگا شہپال جادو شہنشاہِ ساحرانِ جہاں، فخرِ سامری و جیپال کا نام؛ مَیں اُس کی بیٹی ہوں۔ تمام باغ، بلکہ نَواح اِس کا، سب سحر کا بنا ہے۔ برسوں سے تیری فریفتہ و شَیدا ہوں۔ بہ تمنّائے وِصال خراب حال جیتی تھی۔ کوفت کے سوا کچھ نہ کھاتی نہ پیتی تھی۔ آج لات، مَنات کی مدد سے تو میرے اِختیار میں آیا، دل کا مطلب بھر پایا۔ جس چیز کا شائق و طلبگار ہو، جو شَے تجھے درکار ہو، بجز مُلاقاتِ انجمن آرا؛ جہان کا سامان مُہیّا ہے، بہ شرطِ اِطاعت و اِظہارِ محبّت؛ وگرنہ خدا جانے تیرا مآلِ کار کیا ہو او بے مروّت!

جانِ عالم پہلے ڈرا، پھر جی مضبوط کر کے بولا: یہ سب سچ ہے جو تو نے کہا؛ مگر تیری تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ تو رَہ و رَسمِ محبّت سے آشنا ہے۔ نوشِ وصل، نیشِ فصل کا مزہ چکھا ہے۔ انصاف کر، جس کے واسطے خانماں آوارہ، غربت کا مارا، سرگرداں ہوا ہوں، تو اُسی کے نام کی دشمن؛ مَیں تیری دوستی پر کیوں کر اِعتماد کروں؟ دُنیا

میں تین طَرَح کے دُشمن ہوتے ہیں : ایک تو وہ جو صَریح اپنا عدوُ ہو۔ دوسرا : دشمن کا دوست۔ تیسرا : دوست کا دشمن۔ یہ سب سے بُرا ہے، اُس سے کَنارہ اچھا ہے۔ یا یہی شرطِ مَحبّت ہے کہ ایک شخص کا نام خراب کر کے ؛ جہاں آسایش ملے، وہاں بیٹھ رہے ؛ فکرِ سلطنت، جُستجوے دَولت میں سَر بہ صَحرا نہیں ہوا ہوں، جو تیری جاہ وثَروَت پر اِکتِفا کروں۔ تجھے معلوم ہو گا اللہ کی عنایَت سے گھر کی حکومت، چَین کرنے کو کافی تھی ؛ مگر میرا تو یہ حال ہے، میر تقی :

اک مُدّت پاے چِنار رہے، اک مُدّت گُلخَن تابی کی [1]
برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے، عشق نے خانہ خرابی کی

یہ سُن کے، وہ کِھسیانی کُتیاسی جُھنجھلائی، کہا : قُدرتِ سحر میری سُن لے : مَغرِب و مَشرِق کا فاصِلہ گَردِشِ چَشم ہے، زرنگار جانا کیا پَشم ہے ! اِدھر پَلک جھپکائی، اِتنے عرصے میں زرنگار گئی اور آئی۔ خیر، اگر میری ہَم صُحبَتی کَرہِہ جانتا ہے، تیری اُمید بھی قطع کر دیتی ہوں ؛ ابھی انجمن آرا کو لا، تیرے رُوبہ رُو جَلا، اپنا دل ٹھنڈا کرتی ہوں۔ جانِ عالَم بَدحَواس ہُوا کہ رنڈی کے غُصّے سے ڈرا چاہیے۔ سخت غَضَب میں گرِفتار ہوئے۔ انکار میں قتلِ معشوق مدِّنظر اور اقرار کرنے میں اپنی جان کا ضَرَر۔ دونوں طَرَح مشکل ہے۔ حَیران ہو مَآلِ کار سُوچنے لگا، مُنہ نُوچنے لگا۔ واقعی یہ مُقدّمہ بہت پیچ دار ہے ؛ جس پر گزرا ہو، وہ جانے۔ دل کا حال یہ ہوتا ہے :

جدھر آیا، آیا؛ جس سے پھرا، پھرا۔ اور یہ کیا عذابِ عظیم ہے: فراقِ محبوب، وِصالِ نامرغوب۔

آخر کار شہ زادے کو بجز اِطاعت، مصلحت نہ بَن پڑی۔ دل کو تسلّی دے کہا: اگر اِس سے موافقت کروگے، انجمن آرائی اور اپنی زندگی ہوگی۔ خالق رَحمۃٌ لِّلعالمین، جامعُ المُتفرِقین ہے؛ کوئی صورت نکل آئے گی کہ اِس بلا سے رِہائی، دَرِ دِل دار تک رَسائی ہو جائے گی۔ اِلّا، حیلہ شرط ہے۔ یہ خیال کر، ساحرہ سے کہا: ظالم! ہم تیرا جی دیکھتے تھے۔ ہم نے سُنا تھا: عاشق، معشوقوں کے ناز بَردار ہوتے ہیں؛ مگر یہ جھوٹ تھا۔ دَھمکاتے ہیں، ڈَراتے ہیں۔ عاشقی میں حُکومت کسی نے کانوں سے نہ سُنی ہوگی، ہم نے آنکھوں سے دیکھی۔ تو یہ نہ سمجھی، ایسا کون اَحمق ہوگا جو تجھ سا معشوقِ عاشق خِصال اور یہ سَلطَنَتِ لازَوال چھوڑ کے اَمرِ نادیدہ کی جُستجو کرے۔ اُمیدِ موہوم پر جنگل جنگل ڈھونڈھتا پھرے۔ یہ فَقَط اِختِلاط تھا۔ یہ کہہ کے گردن میں ہاتھ ڈال دیا، بات کو ٹال دیا۔ وہ قَحبہ تو اِزار کھولے بیٹھی تھی، لیٹ گئی۔ ناچار باخاطرِ فِگار پہلے تو ٹالا کیا، پھر اُس تیرہ بخت کا مُنہ کالا کیا۔ پھر ہاتھ مُنہ دُھو، اُس کے ساتھ سُو رہا۔ وہ بُجِز مَرانی بَدمست لیٹتے ہی جَہنّم واصل ہوئی، دل کی تمنّا حاصل ہوئی۔

یہاں نیند کہاں۔ جی سینے میں بے قرار، پہلو میں وہ خار۔ ہر دم آہِ سرد دلِ پُر درد سے بَلند۔ چشمۂ چشم جاری، فریاد و زاری دوچند۔ جگر میں سُوزِ فراق نِہاں، لب سے دُودِ پِنہاں عَیاں۔ سینہ مجمَر،

دل وجگر سپند، یہ رُباعی برزباں، لااَعْلَم:

کسی کی شبِ وصل سوتے کٹے ہے　　کسی کی شبِ ہجر روتے کٹے ہے (1)

ہماری یہ شب کیسی شب ہے الٰہی!　　نہ سوتے کٹے ہے، نہ روتے کٹے ہے

مگر جب وہ کروَٹ لیتی، اِس کی جان خوف سے نکلتی، دَم بہ خود ہوجاتا، جھوٹ موٹ سوجاتا۔ اِسی حال سے، بہ ہزار خرابی و مشاہدۂ بے تابیِ جانِ عالم، گریبانِ سحر چاک ہوا۔ رات کا قصّہ پاک ہوا۔ جادوگرنی اُٹھی، شہ زادے کو حَمّام میں لے گئی۔ وہاں اور عجائباتِ سحر دِکھائے۔ نہا کے دونوں باہر آئے۔ خاصہ چُنا۔ ناچ دیکھا، گانا سُنا۔ بعدِ فراغِ صُحبت وجلسۂ طعام اُس نے یہ کلام کیا کہ میرا معمول ہے اِس وقت سے تا شام عَلَی الدَّوام شہپال کے دربار میں حاضر رہتی ہوں؛ تیری اجازت ہو تو جاؤں، دربار کا رنگ دیکھ آؤں۔ جانِ عالم نے دل میں کہا: لِلّٰہِ الحَمْد جو دم تیری صورتِ پُرکدوَرت نہ دیکھیے، غنیمت ہے؛ مگر ظاہر میں زمانہ سازی سے کہا: فُرقت تمھاری گوارا نہیں، رُوکنے کا یارا نہیں، جلد آنا۔ ساحرہ اِس کلمے سے بہت خوش ہو چل نکلی۔ اُس کے جانے سے باغ سُنسان، ویران، وحشت انگیز، ہُو کا مکان ہُوا۔ تنہا شاہ زادہ باخیالِ دِل بَر پھر تو بے تکلّف ہو، جی کھول کے، مِیر:

غمِ دل کو زبان پر لایا (2)

آفتِ تازہ جان پر لایا

کہا: ہم سا بھی بدنصیب، دُور اَز حبیب دوسرا نہ ہوگا؛ جس کا یار نہ مددگار، جس سے دل کا درد کہیے، تاتسکین ہو۔ صحبت اُن کی ملی ہے

جنھیں دیکھ چُپ رہیے کہ عشق اَور کا نہ اُن کے ذِہن نشیں ہو۔ ایک جانور جو رَہ بَر تھا، یوں اُڑا۔ وزیر زادہ جو لڑکپن سے جاں نثار اور یاوَر تھا، وہ یوں چھُٹا۔ ہَوَس :

(1)
سوائے اَندُوہ و یاس و حرماں، ہُوا نہ حاصل جہاں سے ہم کو
اُٹھائیں کاندھے پہ بارِ ہستی، سفر ہے بہتر یہاں سے ہم کو

نہ رفیق ہے نہ شفیق۔ حیران و پریشاں، بے سروساماں ہوں۔ خیالِ دوست ہے اور میں نیم جاں ہوں۔ شعر:

(2)
اِس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا، عوض اپنے مدام

اِسی سوچ میں۔ چھ گھڑی دن باقی رہا، جادوگرنی چمکی چمکائی آئی۔ جانِ عالَم کو اُس کی صورت دیکھ کے رُونا آیا لیکن ڈر کے مارے جو ہنسنے لگا، نالہ گلے میں پھنسنے لگا۔ پھر وہی اَکل و شُرب کا چرچا مچا۔ جب نصف شب گزری، لَہو ولَعِب سے فرصت ملی۔ وہ تو سُو رہی؛ اِن کو بیداری، اَختر شُماری نصیب ہوئی۔ فَرد :

(3)
شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مُصحفی کی

اِسی انداز سے دُو مہینے گزرے۔ جانِ عالَم کا رُوز کی کُوفت سے یہ عالَم ہوا کہ سوکھ کے کانٹا ہوگیا۔ بدن، ڈھانچا ہوگیا۔ اُستاد :

(4)
ہوں کاہ سے کاہیدہ، بس زار اِسے کہتے ہیں
عیسیٰ سے نہ ہوا اچھا، بیمار اِسے کہتے ہیں
بِن ہاتھ لگے دس کے، جا سے نہیں ہلتا میں
لاغر اِسے کہتے ہیں، تیار اِسے کہتے ہیں
تصویرِ مُرقّع ہوں، سکتے کا سا عالَم ہے
جُنبش ہی نہیں، نقشِ دیوار اِسے کہتے ہیں

قضارا ، ایک روز وقتِ رُخصت ساحرہ بولی : جانِ عالم! تیری تنہائی کا اکثر خیال بلکہ مجھے ملال رہتا ہے ۔ تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا ، باغ خالی کاٹے کھاتا ہوگا ۔ مجبور ہوں ، کوئی تیرے دل بہلانے کی گوں نہیں ، جسے چھوڑ جاؤں ۔ یہ رنڈیاں بدسلیقہ ہیں ، ان کو کہاں تک آدمیت سکھاؤں ۔ ہنوز انھیں نشست برخاست کا قرینہ نہیں آیا ، اِن سے تو اور برخاستہ خاطر ہوگا ۔ شہ زادے نے کہا، ہم کیا گھبرائیں گے! دل بہلانے والا کہاں سے لائیں گے! تنہا پیدا ہوئے، تمام عمر اکیلے رہے ۔ ہماری قسمت میں دوسرا لکھا نہیں ۔ ہم صحبت ہمارا خدا نے خلق کیا نہیں ۔ لیکن یہ اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے : کوئی ہمیں مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹی خراب رہے ، تم سے کون جا کر کہے ۔ ہنسی کی جا ہے ، رونے والا ناپیدا ہے ۔ وہ بولی : یہ مکانِ طلسم ہے ، بادِ مخالف کا گزر محال ہے ، تیرا کدھر خیال ہے ! شہ زادے نے کہا : اگر کوئی جادوگر یہ قصد کرے ، اُسے کون روکے؟ فریفتہ بہ شدت تھی ، بند ہوئی ۔ وہم یہ ہوا کہ میرے بعد کوئی جادوگرنی آئے اور اِس پر عاشق ہو جائے ؛ مار ڈالنا کیسا ، یہاں سے اُڑائے ، تو تو کہاں پائے ! سب محنت برباد جائے ! فرطِ محبت ، نشۂ الفت میں انجام کار نہ سوچی ؛ بے تامل نقشِ سلیمانی ، جو بزرگوں کی امانت اور نشانی تھی ، صندوق سے نکال اُس کے بازو پر باندھا ، کہا : اب نہ تاثیرِ سحر ، نہ دیو کا گزر ، نہ پری سے ضرر ہوگا ۔ دل کا کھٹکا مٹا ، مزے اُڑا ۔ یہ کہہ کے ، وہ تو بہ دستور چلی گئی ، جانِ عالم کے بسر پر خرابی آئی ؛ وہی بلبلاتا ، شور مچاتا ، باغ

کو سر پر اٹھانا۔ اور گاہ انجمن آرا کے تصوّر سے یہ کہنا، مؤلف :

لکھا ہوا یہی قسمت کا تھا، سُو جان، مِلا — کہ میری، خاک میں، محنت دے آسمان، مِلا

ہزار صدمے پہ دل نے ہمارے اُف بھی نہ کی — جو اک رفیق ملا، وہ بھی بے زبان ملا

نہ ہم نے چین بہ زیرِ فلک کبھی پایا — عنایتِ ازلی سے عجب مکان ملا

تری تلاش میں در در بھٹکتے پھرتے ہیں — ملا نہ تو ہی، تو جوتی سے، گو جہان ملا

نہ کہ تو پیرِ فلک! پر، کہے گی ساری خلق — کہ خاک میں ترے جوروں سے کیا جوان ملا

بہت جہان کی کی سیر اے سُرورِ حزیں — یہ بے خزاں نہیں کوئی بوستان ملا

ایک دن عالمِ تنہائی میں جانِ عالم کو یہ خیال آیا: اِس نقش کی تعریف اُس نے بہت کی تھی؛ کھولو تو، شاید عُقدۂ کارِ بستہ کھلے۔ یہ سوچ کے اُسے کھولا۔ اُس کا یہ نقشہ تھا: بِست دَر بِست کا نقش، ہر خانے میں اَسمائے اِلٰہی مع ترکیب و تاثیر تحریر تھے۔ دیکھتے دیکھتے خانۂ مطلب میں نظر پڑی۔ لکھا تھا کہ کوئی شخص اگر کسی ساحر کی قید میں ہو؛ یہ اِسم پڑھے، نجات پائے۔ یا مکانِ طِلِسم میں پھنسا ہو؛ اِسے پڑھتا، جدھر چاہے چلا جائے۔ اور جو کوئی سِحر کرتا ہو، اُس پر دَم کر پھونک دے؛ اُسی دم اِس کی برکت ساحر کو پھونک دے۔

یہ سانحہ اُس میں دیکھ کے، قریب تھا شہزادہ شادیِ مرگ ہو۔ جلد جلد وہ سب اِسم یاد کر، نقش بازو پر باندھا۔ اِس عرصے میں جادوگرنی موجود ہوئی، جانِ عالم کے تیور بُرے دیکھے، پوچھا: مزاج آج کیسا ہے؟ وہ بولا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ بہت اچھا ہے۔ دیر

سے تیرا مُنتَظِر تھا۔ لے تجھے شیطانِ عَلَیہِ اللَّعَن کو سونپا، ہمارا اللہ نگہبان ہے۔ یہ سُنتے ہی روح قالب سے نکل گئی۔ سمجھی بیچ پڑا۔ جانِ عالَم چل نکلا۔ سحر سے رُوکنے لگی، تاثیر نہ کی۔ سر پیٹ کر کہا، سعدی :

کس نیاموخت علمِ تیر از من①
کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

یہ کہ کے ناریل زمین پر مارا۔ وہ پھٹا، ہزارہا اژدہا شُعلہ فشاں پیدا ہوا۔ شہ زادے نے کچھ پڑھا؛ وہ سب کے سب پانی ہوگئے، ہستی سے فانی ہوگئے۔ پھر تو مِنّت کرنے لگی، پاؤں پر سر دھرنے لگی۔ جادوگرنیاں سمجھانے لگیں کہ یہ شرطِ مُروَّت نہیں؛ جو اپنا والہ و شَیدا ہو، اُس سے دَغا کیجیے۔ شہ زادے نے کہا: گریبان میں مُنہ ڈالو، سوچو تو؛ ہم بھی کسی کے عشق میں خود رَفتہ، وحشی، عزیزوں سے جُدا، مُصیبت کے مُبتَلا، سَر بہ صحرا ہوئے تھے؛ ہمیں جبر سے قید کیا، ہزار طرح کا اَلَمِ مُفارَقت دیا۔ یہ احسان کچھ کم ہے، ہم نے طِلِسم دَرہَم و بَرہَم جو نہ کیا۔ وہ سمجھیں، یہ نہ ٹھہرے گا۔ عاشقی کا کام نصیحت و پَند، قید و بَند سے نہیں ہوتا۔ اور جبر کا کام اگر اِختیار کیا؛ حَباب آسا ناپایدار ہے، اُس کا کیا اِعتِبار ہے۔ حَسَن :

سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں②

اور یہ قَضِیّۂ اِتّفاقیہ ہے، مصرع :

ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے③

حسن: کبھی یوں بھی ہے گردشِ روزگار①
کہ معشوق، عاشق کے ہو اختیار

لیکن سوچو تو؛ لاکھ طرح کا راحت و آرام ہو، جہان کا چین صبح و شام ہو، جو جی نہ لگے تو کیا کرے۔ اُستاد: دولتِ کونین حاصل ہو تو اُٹھیے لات مار②
پھر نہیں لگتا ہے جی، جس جا سے ہو جس کا اُچاٹ

اَلغَرَض وہ سر پیٹتی رہیں۔ جانِ عالم نے بہ برکتِ اَسمائے اِلٰہی اُس طِلسم سے رہائی پائی، اپنی راہ لی۔ چند رُوز میں پھر اُس حَوض پر وارِد ہوا۔ دیکھا اسپِ وفادار پتھر سے سر مار مار مر گیا تھا۔ اُس کی لاش دیکھ کے دل پاش پاش ہوا، خوب رُویا۔ اب اور رنجِ پیادہ پائی کا قدم بوس ہوا۔ پاؤں اُٹھانا کالے کوس ہوا۔ سُبحانَ اللہ! کہاں وہ شہ زادہ پَرورَدۂ نِعَم و ناز، کہاں یہ پیادہ پائی کا سَفَرِ دُور و دَراز! ہر قدم خار، ہر گام آزار، مگر تصوّرِ یار پیشِ نظر۔ ہر قطرۂ اشک میں سَو سَو لختِ جگر۔ آہ و نالہ دَر دَہاں، یہ شعر ہر ساعت بَر زَباں، ناسخ:

مانِعِ صحرا نَوَردی، پاؤں کی ایذا نہیں③
دل دُکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

کیوں نہ کھٹکوں آسماں کو رات دن مَیں ناتَواں
آبلے کی شکل اُس میں، مجھ میں عالَم خار کا

رنگِ رُو فَق، دل میں قَلَق۔ سینہ فِگار، پا آبلہ دار۔ چھاتی غمِ دوری سے شق، کبھی حکایتِ شکایت بیر، گاہ نالۂ قیامت خیز۔ اور یہ غزل مؤلّف کی درد آمیز

پڑھتا چلا جاتا تھا، مؤلّف :

توڑ کر خُم اور پٹک کر آج پیمانے کو ہم
سوے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم

شمع رُو! محفل میں کب دیں بار پروانے کو ہم
ایک کیڑے سے بھی کیا کچھ کم ہیں جل جانے کو ہم

خواب سا کرتے ہیں ہم ایامِ عشرت کو قیاس
دھیان میں لاتے ہیں جس دم گزرے افسانے کو ہم

پر تلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم
چھانتے ہیں اب وہاں پر خاکِ پروانے کو ہم

اشکِ گل گوں کے نشاں چُھٹ، کچھ پتا ملتا نہیں
جب خزاں میں ڈھونڈھتے ہیں اپنے کاشانے کو ہم

جُرم کچھ صیّاد کا اپنی اسیری میں نہیں
روتے ہیں کُنجِ قفس میں آب اور دانے کو ہم

رشکِ زلفِ یار سب عُقدے ہیں میرے اے سُرور
اور اُلجھ اُٹھتے ہیں، بیٹھیں جب کہ سُلجھانے کو ہم

چشمِ تر، رنگ زرد، آہ سرد، دل میں درد۔ پاؤں کہیں رکھتا، آبلہ پائی سے کہیں اور جا پڑتا۔ نہ راہ میں بستی نہ گاؤں۔ نہ میل نہ سنگِ نشاں، راہ کا سر نہ پاؤں۔ دلِ صفا منزل میں عزمِ دردِ دل دار۔ آبلوں کو اُنسِ خار۔ سخت بدحواسی تھی۔ کانٹوں کی زبان تلووں کے خون کی پیاسی تھی۔ نہ کوچ کی طاقت، نہ یارائے مقام۔ گھبرا کے وہ ناکام یہ کہتا، مؤلّف :

الٰہی! تُو تو ربُّ العالمیں ہے
بدل دے اور دل اِس دل کے بدلے
اور اُس پر نقدِ جاں دے کر، بدل لیتا سُرور
گر دلِ بے رنج چڑھ جاتا کسی کا دھیان میں

اور جب ولولۂ شوق سے جوشِ جنوں ہوتا، آنکھوں سے موج زن دریائے خوں ہوتا؛ تو یہ غزل مؤلّف کی پڑھتا، مؤلّف :

قرار پاتی نہیں جانِ زار بِن تیرے   ستا رہا ہے دلِ بے قرار بِن تیرے
گھمنڈ تھا مجھے جن جن کا، سب وہ بھاگ گئے   حواس و ہوش، شکیب و قرار، بِن تیرے
سرورِ گشتۂ، محبوب، خاک شرح کرے   بسر جو کرتا ہے لیل و نہار بِن تیرے

خلاصۂ کار یہ کہ اِسی حالِ خراب اور دلِ بے تاب سے ہر روز سرگرمِ منزل تھا۔ دیدۂ دیدار طلب سے رواں خونابۂ دل تھا۔

رہا ہونا اُس گرفتارِ دامِ سحر کا جادوگرنی کے جال سے، اور ملاقات ہونی ملکہ مہر نگار صاحبِ حُسن و جمال سے۔ ملکہ کی طبیعت کا لگاو، تازہ شمشیرِ الفت کا گھاو۔ باہم کی چھیڑ چھاڑ، بناو کا بگاڑ۔ پھر ملکہ کے باپ سے ملنا، لوح لے کے چل نکلنا۔

عشق ہے تازہ کار، تازہ خیال   ہر جگہ اِس کی اک نئی ہے چال[1]
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے   کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
گہ نمک، اِس کو داغ کا پایا   گہ پتنگا، چراغ کا پایا
کہیں طالب ہوا، کہیں مطلوب   اِس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب

یہاں سے دشت نوردانِ وادیِ سخن، جگر افگار و غربت زدگانِ پُر محن و سینہ ریش با پائے زخم دار و دلِ خار خار بیان کرتے ہیں کہ وہ مسافرِ صحرائے اندوہ و حرماں، عازمِ سمتِ جاناں، بے توشہ و

زادِ راہ، ہر روز بادلِ پُرسوز کراہ کراہ؛ بادیہ گردی کرتا، جیتا نہ مرتا؛ ایک روز نواحِ دل کُشا و صحراے فرح افزا میں گزرا۔ دیکھا کہ باغبانِ قُدرت نے صفحۂ دشت گُل ہاے گوناگوں، مختلف رنگ، بوقلموں سے بہشتِ ہشتم، رشکِ صحنِ چمن بنایا ہے اور بوٹا پتّا گھانس کا بِہ از گُلِ باغِ اِرم، خجلت دِہِ نسرین و نسترن کر دکھایا ہے۔ گِرد جدولِ آبِ رواں۔ چشمہ ہر ایک چشمۂ حیواں۔ اور لکّہ ہاے ابر نے چھڑکاو سے عجب رنگ جمایا ہے۔ نسیمِ بہار اور درختِ گُل دار سے میدان رشکِ خُتن۔ و تاتار ہے۔ نہ کہیں گرد ہے نہ غُبار ہے۔ درختوں پر فیضِ ہوا اور ترشّح سے سرسبزی اور چمک کا جوبن ہے۔ گُل ہاے خودرُو سے جنگل نمونۂ گُلشن ہے۔

یہ تو مدّتوں کا مسافت دیدہ، مُسافرت کشیدہ تھا؛ وہ زمینِ خجستہ آئیں بہت پسند آئی۔ دل میں آیا: آج کی شب اِسی جا سحر کیجیے، قُدرتِ حق مدِّ نظر کیجیے۔ ایک سمت زمین ہموار، درخت گُنجان، چشمہ ہاے آبِ رواں دیکھ کے جا بیٹھا۔ جنگل کی کیفیت جی بے کل کرنے والی۔ جانوروں کی چہل بل، اُچھل کود کی دیکھا بھالی۔ خوش فعلی کی سیر۔ کلیل میں وحش و طیر۔ بوباس ہر برگ و گُل کی۔ دھوم دھام طائروں کے غُل کی۔ بوٹے پتّے کی نشو و نما۔ سرد سرد ہوا۔ کوسوں تک پہاڑ کی ڈانگ، اُس پر عجائب غرائب نقّاشِ ازل کے سانگ۔ ایک سمت ابرِ سیاہ گِھرا۔ سُرخ و سفید، اودی ساون بھادوں کی گھٹا۔ چرخِ کُہن نئے نئے رنگ بدلتا۔ کبھی بجلی چمک جاتی، آنکھ جھپک جاتی۔ رعد زور شور سے مے خواروں کو یہ سُناتا رہا، میر سوز:

کی فرشتوں کی راہ ، ابر نے بند[1]
جو گنہ کیجیے ، ثواب ہے آج

ندّیاں نالے چڑھے ، دریا بڑھے۔ جھیلیں ، تالاب لب ریز۔ ڈبرے موج خیز۔ پپیہے کا مستوں سے مخاطب ہونا، پی پی کہ کے آپی جان کھونا۔ کوئل کی کوکو اور توتو سے کلیجا منھ کو آتا تھا۔ مور کا شور، برق کی چمک، رعد کی کڑک، ہوا کا زور زور رنگ دکھاتا تھا۔ شام کا وقت، غروب آفتاب کا عالم، جانوروں کا درختوں پر بیٹھنا باہم۔ زمین پر فرشِ زمرّدیں یکسر بچھا۔ جہاں تک نظر جاتی، دھان لہریں لے رہا۔ آسمان میں رنگا رنگ کی شفق پھولی، شامِ اودھ کی سیر بھولی۔ ایک سمت قوسِ قزح، جسے دھنک کہتے ہیں، بہ صد جلوہ و شان فلک پر نمایاں؛ سرخ، سبز، زرد، دھانی لکیریں عیاں۔ بلبل کے چہچہے۔ درخت سرسبز، لہلہے۔ کوسوں تک سبزہ زار، پھولوں کی بہار۔ کہیں ہرن چرتے، کہیں پرند سیر کرتے۔ کسی جا طاؤسانِ طنّاز سرگرمِ رقصِ ناز۔ لبِ ہر چشمۂ آب مرغِ آبی و سرخاب۔ کبھی نمود ہونا ماہ کا؛ چکور کا دوڑنا، بھرنا آہ کا۔ دونوں وقت ملتے۔ اِس دید کی خراش سے دل پاش پاش، زخمِ جگر چھلتے۔ یہ سیر جو ہجرِ جاناں میں نظر سے گزر جائے؛ کیوں کر دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، چھاتی نہ بھر آئے۔ اُستاد:

کارِ اخگر کرتی ہے ہر بوند تن پر یارِ بن[2]
کیا عجب، گر ہوں ہرے داغِ جگر برسات میں

قاعدہ ہے جب آدمی کو سامانِ عیش و نشاط، اِس طرح کی سیرِ فرحت و اِنبساط مُیسّر ہوتی ہے؛ جسے پیار کرتا ہے، وہ یاد آتا ہے۔ شہزادے نے مُدّت کے بعد یہ فرحت وفضا جو دشت میں پائی، یار کی یاد آئی؛ آنکھیں بند کر کے کہا، شعر:

① میں وہ نہیں جو کروں سیرِ بُوستاں تنہا   بہشت ہو تو نہ مُنہ کیجے باغباں، تنہا

اِس سوچ میں بیٹھا تھا، ایک طرف سے سواری کا سامان نظر آیا۔ "ادب" اور "ملاحظہ" کا غُل، "تفاوُت" اور "قرینے"، "نگاہ رُو بہ رُو" کا شُور بلند پایا۔ غور جو کیا، رنڈیوں کا غُول سامنے آیا۔ یہ گھبرایا؛ دھوکا پا چکا تھا، جنگل میں غُوطہ کھا چکا تھا۔ سَنبھل بیٹھا اور اَسمائے رَدِّ سحر پڑھنے لگا، بہ مُوجِبِ مَثَل: دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیتا ہے۔ جب وہ آگے بڑھیں، غَور سے دیکھا: چار پانچ سے عورت پری زاد، حُور وش، غیرتِ سَرو، خجلت دِہِ شَمشاد، زَرّیں کمر، نازک تَن، سیم بَر، چُست و چالاک، کم سِن، اَلَّڑھ پنے کے دن، اچھلتی کودتی، مردانہ وار پیادہ؛ اور جَواہر نِگار ہَوا دار پر ایک آفتابِ محشر سوار، گِرد پریوں کی قطار، تاجِ مُرَصَّع کج سر پر، لباسِ شاہانہ پُر تکلّف دَر بَر، نیمچۂ سُلیمانی اُس بلقیس وَش کے ہاتھ میں، سیماب وَشی بات بات میں، صَید کرنے کی گھات میں۔ اور بندوقِ چقماقی خاص لندن کی، طائرِ خیال گرانے والی برابر رکھّے؛ شکار کھیلتی، سَیر کرتی چلی آتی ہے۔ حُسنِ خداداد بے مِثال، کاہشِ بدر، غیرتِ ہلال، عجب سِن و سال۔ میر حَسَن:

② برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن   جوانی کی راتیں، مُرادوں کے دن

طالِعِ بیدار یاوَر، اِقبال دَم ساز۔ غمزہ و عشوہ جِلَو میں۔ انداز و ادا رَو میں۔ آفتِ جانِ عاشق، سَرمایۂ ناز۔ جانِ عالم نے بہ آوازِ بلند کہا،

میر تقی :

کیا تنِ نازک ہے، جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے [1]

کیا بدن کا رنگ ہے، تہ جس کی پیراہن پہ ہے

یہ صدا، جو اہتمام سواری آگے آگے کرتی تھیں، اُن کے کان میں پڑی اور نگاہ جمالِ جانِ عالم سے لڑی؛ دفعۃً سب کی سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئیں۔ کچھ، سکتے کے عالم میں سہم کر جھجک گئیں۔ کچھ بولیں: اِن درختوں سے چاند نے کھیت کیا ہے۔ کوئی بولی: نہیں ری! سورج چھپتا ہے۔ کسی نے کہا: غور سے دیکھ، ماہ ہے۔ ایک جھانک کے بولی: یا اللہ ہے مگر چودھویں کا چاند ہے۔ دوسری نے کہا: اِس کے رُو بہ رُو وہ بھی ماند ہے۔ ایک نے غمزے سے کہا: چاند نہیں تو تارا ہے۔ دوسری چٹکی لے کے بولی: اُچھال چھکّا! تو بڑی خام پارا ہے۔ ایک بولی: سرو ہے یا چمنِ حسن کا شمشاد ہے۔ دوسری نے کہا: تیری جان کی قسم پرستان کا پری زاد ہے۔ کوئی بولی: غضب کا دل دار ہے۔ کسی نے کہا: دیوانیو! چپ رہو! خدا جانے کیا اسرار ہے۔ ایک نے کہا: چلو نزدیک سے دیکھ، آنکھ سینک کے دل ٹھنڈا کریں۔ کوئی کھلا کر کہہ اُٹھی: دور رہو، ایسا نہ ہو اسی حسرت میں تمام عمر جل جل مریں۔ ایک نے خوب جھانک تاک کے کہا: خدا جانے تم سب کے دیدوں میں چربی کہاں کی چھا گئی ہے، کیا ہوا ہے! یہ تو بھلا چنگا، ہٹا کٹا مرد وا ہے۔

سواری جو رُکی، ملکہ نے پوچھا: خیر ہے؛ سب نے ڈرتے ڈرتے دست بستہ عرض کی: قربان جائیں، جان کی امان پائیں تو زبان پر لائیں؛ ہمیشہ

سواری حضور کی اِس راہ سے جاتی ہے، مگر آج خلافِ معمول اِن درختوں سے ایک شکلِ دل چسپ ایسی نظر آتی ہے کہ، فرد :

سُنا یوسف کو، حسینانِ جہاں بھی دیکھے[1]

ایسا بے مثل طرح دار نہ دیکھا نہ سُنا

ملکہ متعجب ہو کے پوچھنے لگی : کہاں؟ ایک نے عرض کی : وہ، حضور کے سامنے۔ جیسے ملکہ کی نگاہ چہرۂ بے نظیر، صورتِ دل پذیرِ جانِ عالم پر پڑی، دیکھا : ایک جوان، رشکِ مہِ پیرِ کنعاں، رعنا، سروقامت، سہی بالا، بحرِ حسن و خوبی کا دُرِ یکتا، کاسۂ سر سے فرِ شاہی نمایاں، بادۂ حسنِ دل فریب سے معمور ہے۔ دماغِ کشورستانی ہے، اُٹھتی جوانی ہے، نشۂ شباب سے چکنا چور ہے۔ خمِ ابرو محرابِ حسیناں، سجدہ گاہِ پردہ نشیناں۔ چشمِ غزالی سُرمہ آگیں ہے۔ آہوئے رم خوردۂ کشورِ چیں ہے۔ چتون سے رمیدگی پیدا ہے۔ مستِ مےِ محبت ہے، اِس پر چوکنا ہے۔ دیدے کی سفیدی اور سیاہی لیل و نہار کو آنکھ دِکھاتی ہے۔ سوادِ چشم پر حور سُویداے دِل صدقے کیا چاہتی ہے۔ حلقۂ چشم میں کتنے ہمواز مردمِ دیدہ دھرے ہیں۔ صانعِ قدرت نے موتی کوٹ کوٹ کے بھرے ہیں۔ مژہ نکیلی اُس کماں ابرو کی دل میں دوسار ہونے کو لیس ہے۔ رشکِ لیلیٰ یہ غیرتِ قیس ہے۔ ناوکِ نگاہ سے سپرِ چرخ تک پناہ نہیں۔ دِل دُوزی بے گناہوں کی اِس کی ملت میں صواب ہے، گناہ نہیں۔ لوحِ پیشانی، تختۂ سیمیں یا مطلعِ نور ہے، یا طبا شیرِ صبح یا شمعِ طور ہے۔ کاکُلِ مشکیں سے

زُلفِ سُنبل کو پریشانی ہے۔ بُو باس سے خُتن والوں کے ہوش خطا ہوتے ہیں، حیرانی ہے۔ عنبر بس مؤیوں کو زِندگی وَبال ہے۔ بال بال پُر پیچ و خَم دار ہے۔ رُوئے تاباں بسانِ چشمۂ حیواں ظُلمت سے نمودار ہے۔ ہُما اپنے پَر و بال سے اِس صاحبِ اِقبال کا مگس راں ہے۔ رُخِ تابندہ کی چمک سے نَیّرِ اعظم لرزاں ہے۔ لبِ گُل برگِ تر پر سبزے کی نمود ہے، یا دُھواں دھار مُشتاقوں کے دل کا دُود ہے۔ نظر جھپکتی ہے، تجلّیِ قُدرتِ ربِّ وَدُود ہے۔ ہر حلقہ گیسوئے مُعَنبَر کا کمندِ گرہ گیر ہے؛ مگر بالوں کے اُلجھنے سے کُھلتا ہے کہ کسی کی زُلفِ پیچاں کا خود بھی اَسیر ہے۔ خندۂ دَنداں نُما ہے ہونٹ، لعلِ بَدَخشاں کا رنگ مٹاتا ہے۔ دانتوں کی چمک سے گوہرِ غلطاں بے آب ہوکر ٹوٹا جاتا ہے۔ معشوقوں کا اُن پر دانت ہے، دل و جاں وارتے ہیں۔ جو نظر سے پنہاں ہوں، ڈاڑھیں مارتے ہیں۔ دمِ تقریر دُرجِ دَہاں جو کھولتا ہے، سامع موتی رُولتا ہے۔ ہر کلمہ اِعجاز نُما ہے، بیمارِ محبّت کا مسیحا ہے۔ دونوں ہاتھ نہالِ اُلفت کی شاخِ باردار ہیں، دل کی دَست بُردی کو اور خزانۂ قارُوں بانٹ دینے کو سَرِ دَست تیار ہیں۔ کفِ دَست کی لکیریں۔ دَست آویزِ محبّت یدِ قُدرت سے تحریر ہے؛ سَر نوشت سے یہ کُھلتا ہے کہ سلسلۂ الفت میں کسی کے، رَگ و پے بستۂ زنجیر ہے۔ مرآتِ سینہ میں عکس اَفگن کوئی صاحبِ جمال ہے، مدِّ نظر کسی کا خیال ہے۔ کمرِ نازک جُستجو پر چُست باندھی ہے، گو بیٹھا سُست ہے؛ چلنے کو مثلِ صبا آندھی ہے۔ پاؤں وادیِ تلاش میں سَرگرمِ رفتار

ہیں۔ زیرِ قدم دَشت و کہسار ہیں۔ مگر قسمت اپنی بَرسرِ یاری ہے کہ ہمارے دام میں یہ ہُمائے اَوجِ شہریاری ہے۔

یہ تصوّر دل میں تھا کہ کارپَردازانِ محکمۂ ناکامی حاضر ہوئے اور مَشّاطۂ حُسن و عشق نے پیش قدمی کر مَتاعِ صبر وخرد، نَقدِ دل وجاں، اَثاثِ ہُوش وحَواس، تاب و تَوانِ ملکۂ جگرفگار اَرمغانِ رونُمائی میں نذرِ شہزادۂ والاتبار کیا۔ عقل و دانش گُم، صُمٌّ بُکمٌ کا نقشہ ہوا۔ حضرتِ عشق کی مدد ہوئی، سب بلا رَد ہوئی۔ شوقِ وصل دل میں پیدا ہوا، جی شیدا ہوا۔ دَفعتہً کیا تھا، کیا ہوا۔ میر تقی:

تھی نظر، یا کہ جی کی آفت تھی ۔۔۔ وہ نظر ہی وَداعِ طاقت تھی [1]
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ ۔۔۔ ہُوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
رنگ چہرے سے کر گیا پرواز ۔۔۔ دل پہ کرنے لگا تَپیدن ناز

ملکہ تھرتھرا کر ہَوادار پر غش ہوئی۔ خَواصوں نے جلد جلد گلاب اور کیوڑا، بیدِمُشک چھڑکا۔ کوئی نادِعلی پڑھنے لگی۔ کوئی سورۂ یوسف دَم کرنے کو آگے بڑھنے لگی۔ کسی نے بازو پر رومال کھینچ کر باندھا، تلوے سہلانے لگی۔ کوئی مٹّی پر عطر چھڑک کر سُنگھانے لگی۔ کوئی بیدِمُشک سے ہاتھ مُنہ دھوتی تھی۔ کوئی صدقے ہُوہُو رُوتی تھی۔ کوئی بولی: چہل کُنجی کا کٹورا لانا۔ کسی نے کہا: یَشب کی تختی دھو کے پلانا۔ کسی نے کہا، بلا رَیب آسیب ہے۔ کوئی بولی، اُسی کے دیکھنے سے دل ناشکیب ہے۔ کوئی بولی: یہ تو عجب چمک کا ماہ پارہ ہے؛ اِس کا دیکھنا یہ رنگ لایا، گویا چاندنی نے مارا ہے۔ کوئی سمجھی: یہ شخص ہم جنس نہیں، قسمِ جن سے ہے۔ کوئی بولی: دیوانیو! یہ غشی

تقاضائے سن سے ہے۔

غرض کہ دیر میں ملکہ کو اِفاقہ ہوا؛ مگر دل مُضطرِب، تپاں۔ خواہش اُسی طرف کشاں۔ جذبِ عشق سے مقناطیس و آہن کا عالَم۔ کَشِشِ محبّت سے کاہ و کہربا اُسی دَم ہو گئی۔ رنگِ رُو طائرِ پَرپدہ۔ صبر و ضبط دامن کَشیدہ۔ مَشورہ ہُوا سواری اِدھر سے پھیرو، ملکہ کو بیچ میں گھیرو؛ لیکن تابِ تحمّل، یارائے جبر ملکہ کو بالکل نہ رہا، اُس بدحواسی میں کہا تو یہ کہا: دیوانیاں ہو؛ یہ کوئی مسافر بے چارہ، خانماں آوارہ، غُربت کا مارا تھک کر بیٹھ رہا ہے، اِس سے ڈرنا کیا ہے! قریب چلو، حال پوچھو۔ ناچار، وہ سب فرماں بردار چلیں؛ مگر جھجکتی، ایک دوسرے کو تکتی۔ جوں جوں سواری قریب جاتی تھی، ملکہ کی چھاتی دَھڑکتی تھی، دل میں تڑپ زیادہ پاتی تھی۔ اگرچہ جمالِ پری تمثالِ ملکہ مہر نگار بھی سحرِ سامری کا نمونہ، نہ وہ مہر سے چمک دمک میں دُونا، عابد کُش، زاہد فریب تھا؛ جانِ عالَم بھی بے چین ہوا، مگر دامنِ ضبط دستِ اِستقلال سے نہ چھوڑا۔ جس طَرح بیٹھا تھا، جُنبش نہ کی، تیوَر پر مَیل نہ آیا۔

ایک خَواصِ خاص بہ اِشارۂ ملکہ آگے بڑھی، پوچھا: کیوں جی میاں مُسافر! تمھارا کدھر سے آنا ہوا؟ اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے، سوائے اللہ کی ذات، ہَیہات، کوئی سنگ نہ ساتھ، اِس جنگل میں وارِد ہو؟ شہ زادے نے مسکرا کر کہا: مُصیبت، خَیلا، تجھ پر پڑی ہوگی۔ معلوم ہوا یہاں آفت زَدے آتے ہیں، ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ کہو تو تم سب کی کیا کم بختی، ایّاموں کی گردِش، نصیبوں کی سختی ہے؛ جو خاک پھانکتی، مسافروں کو تاکتی جھانکتی، چُڑیلوں کی طَرح ناکام سَرِشام

پھرتی ہو! سوکھے میں مسافروں پر پھسل پھسل کے گرتی ہو۔

ملکہ یہ کلمہ سُن کے پھڑک گئی اور ہَوادار آگے بڑھا خود فرمانے لگی: واہ واصاحب! تم بہت گرما گرم، تُند مزاج، حاضر جواب، پا بہ رکاب ہو۔ حال پوچھنے سے اِتنا دَرہَم بَرہَم ہوئے، کڑا فقرہ زَبان پر آیا۔ اِس مُردار کے ساتھ، تھُو تھُو، منھ چُھٹ سب کو پچھل پائیاں بنایا۔ جانِ عالَم نے کہا: اپنا دستور نہیں کہ ہر کَس وناکَس سے ہم کلام ہوں۔ دوسرے، مُردار سے بات کرنا مَکرُوہ ہے؛ مگر خَیر، دُھوکے میں جیسا اُس نے سوال کیا، ویسا ہم نے جواب دیا۔ اب تمھارے مُنھ سے مُردار نکلا، ہم سمجھ گئے، چُپ ہو رہے۔ ملکہ نے ہَنس کر کہا: خوب! یک نہ شُد دو شُد۔ صاحب! جُوبَنج سنبھالو، ایسا کلمہ زَبان سے نہ نکالو۔ کیا میرے دُشمن دَرگُور مُردار خُور ہیں؟ آپ بھی کچھ زُور ہیں! بھلا وہ تو کہ کے سُن چکی، مَیں آپ سے پوچھتی ہوں: حضورِ والا کس سَمت سے رونق اَفروز ہوئے، دولت سَرا چھوٹے کے روز ہوئے؟ اور قُدُومِ مَیمنَت لُزُوم سے اِس دشتِ پُرخار کو کیوں رشکِ لالہ زار کیا، بارِ گرانِ سفرِ غُربت کب سے سر پر لیا؟

جانِ عالَم نے کہا: چہ خوش! آپ دَر پَردہ بناتی ہیں، بگڑ کر طنز سے یہ سُناتی ہیں۔ ہم حضور کاہے کو، مزدور ہیں۔ آپ اپنے نزدیک بہت دور ہیں۔ جیتے جی چار کے کاندھے چڑھی کھڑی ہو، بے شک حضور ہو۔ عارِضی جاہ و حَشَم پر مغرور ہو۔ جُو جُو جَلیسیں تھیں، بولیں: ملکۂ عالَم! آپ کس سے گفتگو دُو بدُو کرتی ہیں! یہ مَردُوا تو لٹھ ہے، سخت مُنھ پھٹ ہے۔ ملکہ بولی: چُپ رہو، اِن باتوں میں دَخل نہ دو۔ اگر یہ بدمزہ ہو جائے گا تو صَلواتیں سُنائے گا۔ وہ سب ہٹیں، آپس میں کہا: خُدا خَیر کرے! آج جنگل میں گُل پھولا چاہتا ہے، یہ پردیسی پَنچھی راہ

بھولا چاہتا ہے۔ پھر ملکہ بولی: اے صاحب! خُدا کے واسطے کچھ مُنہ سے بولو، سر سے کھیلو۔ نذر، بھینٹ جو درکار ہو، لے لو۔ جانِ عالَم نے کہا: اَمرائیت کو کام نہ فرماؤ، نیچے آؤ۔ یہ ہمیں معلوم ہوا تم بڑی آدمی ہو۔ سواری مانگے کی نہیں۔ خَواصیں بھی تمھاری ہیں، جو ہمراہِ سواری ہیں۔ خاک نشینوں کی ہم بستری اِختیار کرو، تکلّف تہ کر رکھو۔ طبیعت حاضر ہو گی تو تمھارے بیٹھنے سے، کچھ کہ اُٹھیں گے۔ آپ ہَوادار کیا، ہَوا کے گھوڑے پر سوار؛ فقیر بسترِ خاک پر سایہ وار۔ حافظ:

ببیں تفاوتِ رہ از کُجاست تا بکُجا①

ملکہ نے کہا: مُدّت العُمر میں ایسا مسافر جَریدہ، دَہَن دریدہ تمھارے سوا، بہ خُدا، نہ دیکھا نہ سُنا۔ اُستاد:

زَباں سنبھالو، یہ مُنہ زُوریاں غریبوں پر②
خُدا کی سوں کوئی تم سا بھی بدلگام نہیں

زُورچیز ہو، کتنے بے تمیز ہو۔ یکّہ و تنہا، ٹٹّو نہ گھوڑا؛ پیادہ پائی میں لحاظ پاس پاس نہیں، سب کو چھوڑا۔ گٹھری نہ بُقچہ، ننگا لُچّا۔ وہی مَثَل ہے: رہے جھونپڑے میں، خواب دیکھے محلوں کا۔ ہر بات میں ٹھنڈی گرمیاں کرتے ہو۔ جو یہی خوشی ہے تو لو؛ یہ کہہ کے ہَوادار سے اُتر، زمین میں شہزادے کے برابر بیٹھ گئی۔

خَواصوں نے بہت بھیانک ہو کے کہا: لو بی بی، یہ مُوا کیا سحر بیاں، جادو کا انسان ہے! ملکہ سی پری کو، گالیاں دے دے کے، کیسا شیشے میں اُتار لیا! بیٹھے بٹھائے میدان مار لیا۔ ایک بولی: تجھے اپنے دیدوں کی قسم، سچ بولیو؛ ایسا جوان رَنگیلا، سَجدار، نکیلا، ٹھٹھول،

طرّار، آفت کا پرکالہ، دُنیا سے نرالا؛ تو نے یا کبھی تیری ملکہ نے دیکھا بھالا تھا؟ اری دیوانی، نادان! خوب صورتی عجب چیز ہے۔ اِس کا دوست طالِب، دشمن کا مطلوب ہے۔ حُسنِ خوب سب کو مرغوب ہے، جہان کو عزیز ہے۔ غرض کہ جب ملکہ بیٹھی، جانِ عالم دَم سرد بھر کے بول اُٹھا، لااَعلَمُ:

چہ گویم از سر و سامانِ خود، عُمریست چوں کاکُل①
سیہ بختم، پریشاں روزگارم، خانہ بردوشم

مُؤَلِّف: سَراسَر دل دُکھاتا ہے، کوئی ذکر اور ہی چھیڑو
پتا خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو آشیانے کا

گرفتارِ رنج و اَلَم، خوشی سے دور، مُبتَلائے غم، بے یار و مددگار، دوست نہ غم خوار، آفت کا مارا، خانُماں آوارہ، ہمہ تن یاس، باختہ حَواس۔ تُوشۂ راہ بجُز غمِ جاں کاہ نہیں۔ اور رہ بَر سوائے دلِ مُضطر ہمراہ نہیں۔ گو پاؤں میں طاقتِ رفتار نہیں، لیکن اِیڑیاں رگڑنا بھی اِس راہ میں ننگ و عار نہیں۔ یہ حال ہے، وہ سب نام ہیں؛ کوہ و دَشت اپنے مَسکَن، مقام ہیں۔ آدمی مجھ سے رَم کرتے ہیں، جانور رام ہیں۔ اور حال یہ ہے، میر سوزؔ:

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں
پر، یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں، کہاں ہوں②

اے ساکِنانِ دُنیا! آرام دو گے اک شب
بچھڑا ہوں دوستوں سے، گُم کردہ کارواں ہوں

ہاں اہلِ بزم! آؤں میں بھی، پر ایک سن لو
تنہا نہیں ہوں بھائی، با نالہ و فغاں ہوں
سوراخ، چاک لاکھوں، داغوں کی کون گنتی
گلشن دل و جگر ہے، گو صورتِ خزاں ہوں
نام و نشاں نے یارب، رسوا کیا ہے مجھ کو
جی چاہتا ہے، حق ہو، بے نام و بے نشاں ہوں
سر مانگتا ہے قاتل، قاصد! شتاب لے جا
اتنی سبک سری پر کاہے کو سر گراں ہوں
قاتل پکارتا ہے، ہاں کون کشتنی ہے!
کیوں سوز چپ ہے بیٹھا، کچھ بول اُٹھنا ہاں ہوں

یہ پڑھ کے چپ ہو رہا۔ ملکہ سمجھی: یہ مقرر شاہ زادۂ عالی تبار ہے، مگر کسی کا عاشقِ زار ہے۔ بات میں یہ تاثیر ہے کہ ہر کلمہ، ناوک کا تیر ہے۔ دل میں آیا: کسی طرح گھر لے چلیے، پھر مفصل حال معلوم ہو جائے گا، کہاں تک چھپائے گا۔ بہ منت و سماجت کہا: اے عزیز! یہ سرزمیں ہمارے علاقے میں ہے۔ تم مسافرانہ، اتفاقاتِ زمانہ سے وارِد ہو؛ مہمانی ہم پر واجب ہوئی۔ چند گام اور قدم رنجہ کیجیے، غریب خانہ قریب ہے۔ آج کی شب استراحت فرمائیے، نانِ خشک کھائیے۔ صبح اختیار باقی ہے، اتنی مشتاقی ہے۔

جانِ عالم نے تبسم کر کے کہا: پھر دَرپردہ اِمارت کی لی۔ یعنی، ہم تو

یہاں کے مالک ہیں، آپ بھوکے پیاسے سالِک ہیں۔ چلو، یہ فِقرہ کسی فقیر کو سُناؤ۔ محتاج کو کرّ و فر، جاہ وحَشَم سے دَبکاؤ۔ جادۂ اِعتدال سے زَبان کو باہر گام فرسا نہ فرماؤ۔ یہاں طبیعت اپنی اپنے اِختیار میں نہیں۔ اور رَدا رَوی سے فُرصت قَلیل ہے۔ مکان پر جانا، دعوت کھانا جَبر ہے؛ آنے جانے کی کون سی سَبیل ہے۔ ملکہ نے اَفسُردَہ خاطِری سے کہا: دعوت کا رَد کرنا مَنع ہے؛ آیندہ آپ مُختار ہیں، ہم مجبور و ناچار ہیں۔ جانِ عالم نے دل میں خَیال کیا: برسوں کے بعد ہَم جِنسوں کی صُحبت مُیَسَّر آئی ہے اور یہ بھی شاہ زادی ہے؛ اِس کا آزُردَہ کرنا، نری بے حیائی ہے۔ آدمیّت کا لحاظ، اِنسانیت کا پاس، اپنی بے اِعتِنائی کا حِجاب کر کے کہا: کھانے پینے، سونے بیٹھنے کی ہَوَس دل سے اُٹھ گئی ہے؛ مگر دل شِکَنی کسی کی، اپنے مذہب میں گُناہِ عظیم ہے، خُدا اِس بات کا علیم ہے۔ شعر:

عِوَض ہے دل شِکَنی کا بہت مُحال، اے یار ①
جو شیشہ ٹوٹے، تو کیجے جواب شیشے کا

لیکن اِتنی رُکھائی اور یہ کَج اَدائی جو ظُہور میں آئی؛ مُعاف کیجیے، اِس کا یہ سبب تھا، شعر:

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

دل فِگاروں کی صُحبت سے انسان کو ملال حصُول ہوتا ہے۔ غمگیں کا ہَم نَشِیں ہمیشہ مَلوُل ہوتا ہے۔ میر دَرد:

نہ کہیں عیش تمھارا بھی مُنغَّص ہوئے دوستو! دَرد کو محفل میں نہ تم یاد کرو ②

اور جو یوں ہی مرضی ہے، تو بسم اللہ۔ یہ کہہ کے اُٹھا۔ ساتھ ساتھ، ہاتھ میں ہاتھ، پیادہ پا باتیں کرتا چلا۔ بس کہ شاہ زادہ لطیف و ظریف تھا؛ کوئی فقرہ نوک جھوک، رمز و کنایہ، ذو معنی سے خالی زبان پر نہ لاتا تھا۔ ملکہ کا ہر بات پر دل پگھلا جاتا تھا؛ مگر دل سے کہتی تھی کہ اے ناکام و بخت نافرجام! ایسا نہ کرنا کہ ہاتھ ننگ و ناموس سے دھونا پڑے۔ بیٹھے بٹھائے الم مفارقت میں رونا، جان کھونا پڑے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی کا عاشقِ زار ہے، نشۂ محبت میں سرشار ہے۔ دوسرے، غریب الوطن۔ بہ قولِ میر حسن:

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت[1]
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

مگر تپشِ دل متّصل ترقی میں تھی۔ خواہش، جی کی کاہش میں۔ بے قراری کو اِس پر قرار تھا کہ خدا کے کارخانے میں کبھی کسی کو دخل نہیں ہوا۔ اے نادان! جو دمِ وصل ہے، اُسے غنیمت جان۔ آغازِ عشق میں انجامِ کار سوچنا سراسر خلاف ہے۔ اِس میں شرع کی تکلیف معاف ہے۔ مؤلف:

غنیمت جان لے یہ صحبتیں آپس کی اے ناداں
دگرگوں حال ہو جاتا ہے اک دم میں زمانے کا

القصہ تا درِ باغ با خاطرِ فراغ پہنچے۔ دروازہ کھلا، اندر قدم رکھا۔ جہاں فضائے صحرا وہ تھی، وہاں کے باغ کا کیا کہنا! اگر ایک تختے کی صفت تحریر کروں، ہزار تختۂ کاغذ بہ خطِ ریحاں اُس گلزار کی تعریف نہ لکھ سکوں۔ دمِ تسطیر

قلم میں برگ نکلتے، لکھنا بار ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بالکل پھولتے ہیں، صَفحۂ قرطاس پر گُل پھولتے ہیں؛ حاسد شاخسانے نکالتا ہے، خار ہوتا ہے۔ صریرِ خامہ میں بلبل کے چہچہے پیدا ہوتے ہیں، باغبان کو حالت حال کی ہوتی ہے۔ اور سطرِ پیچاں میں طائرِ مضموں پھنستے ہیں، بعینہٖ کیفیت صیّاد کے جال کی ہوتی ہے۔ بہت آراستہ و پیراستہ۔ عرض مربّع میں۔ چاروں کونوں پر چار بنگلے، گرد سبزۂ نوخاستہ۔ دروازہ عالی شان۔ نفیس مکان۔ زیرِ دیوار خندق پر کیلے؛ اکیلے نہیں، قطار در قطار۔ تختہ بندی کی بہار۔ رَوش کی پٹڑیاں قرینے کی۔ منہدی کی ٹٹیوں میں رنگت مینے کی۔ گُل منہدی سرخ، زرد پر افشاں۔ عبّاسی کے پھولوں سے قدرتِ حق نمایاں۔ نرگس دیدۂ منتظِر کی شکل آنکھیں دِکھاتی تھی۔ گُلِ شبّو سے بھینی بھینی بو باس آتی تھی۔ میوہ دار درخت یک لخت جُدا۔ بار کے بار سے ٹہنیاں جھکیں، درخت سرکشیدہ۔ پھل لطیف و خوش گوار۔ پھول نازک و قطع دار۔ رَوِشیں بلّور کی۔ نہریں نور کی۔ حوض و نہر میں فوّارے جاری۔ چمنوں میں بادِ بہاری۔ موسم کی تاک میں، تاک کا مستوں کی رَوِش جھومنا۔ غنچۂ سربستہ کا مُنہ تاک تاک کے، نسیم کا چومنا۔ انگور کے خوشوں میں دلِ آبلہ دار کا پتا۔ زربفت کی تھیلیاں چڑھیں، نگہبانی کو گوشوں میں باغبانیاں المست کھڑیں۔

ہر تختہ ہرا بھرا۔ رَوِشں کے برابر چینی کی ناندوں میں درختِ گُل دار معنبر و معطّر۔ بیلا، چنبیلی، موتیا، موگرا، مدن بان؛ جوہی، کیتکی، کیوڑا، نسرین و نسترن کی نرالی آن بان۔ ایک سمت تختوں میں لالہ خوفِ خزاں سے بادِلِ داغ دار؛ گرد اُس

کے نافرمان کی بہار۔ سَرو، شمشاد لبِ ہر جو، فاختہ اور قُمری
کی اُس پر کوکو، حق سِرّہٗ۔ شاخِ گُل پر بلبلِ شوریدہ کا شور۔ چمن
میں رَقصاں مور۔ کہیں خندۂ کبکِ دری، کہیں تدرو بر سرِ جلوہ گری۔
نہروں میں قاز بلند آواز، تیز پرواز۔ کسی جا بَط اپنے ولولے میں خود غلط۔ ایک طرف
قرقرے۔ دو رویہ درخت گل و بار سے بھرے۔ سیب سے زنخِ گُلِ عِذاروں کی کیفیت
نظر آتی۔ ناشپاتی اور بہی آسیبِ دستِ باغباں سے بَری۔ ہر شاخ ہری۔ سُنبُلِ مُسلسل میں
پیچ و تابِ زُلفِ مہ وشاں کا ڈھنگ۔ سوسن کی اُداہٹ مِسی لب خوب رؤیوں
کا جوبن دکھاتی۔ داؤدی میں صنعتِ پروردگار عیاں۔ صد برگ میں
ہزار جلوے نہاں۔ آم کے درختوں میں کیریاں زمرّد نگار۔ مولسری
کے درخت سایہ دار۔ باغبانیاں خوب صورت سرگرمِ کار۔ خواجہ سرا
اَمرَد اُن کے مددگار۔ حور و غلماں کا عالَم۔ بیلچے، کُھرپیاں جواہر نگار،
مُرصّع ہاتھوں میں باہم۔ درخت اور روِشوں کو دیکھتی بھالتی،
گُل و بار چمن سے چُنتی؛ گلا برگ، سڑا بار، جھڑا پڑا اخار صحنِ
چمن سے نکالتی پھرتی تھیں۔

بیچ میں بارہ دری پُرشوکت و با رِفعت و شان، پرِستان کا سا
مکان۔ ہر کمرا سجا سجایا، صنّاعِ نادِر دست کا بنایا۔ غلام گردش کے
آگے چبوترا سنگِ مَرمَر کا۔ حوض مُصفّیٰ پانی سے چھلکتا۔ فرش یک لخت
اَفشاں پتھر کا۔ شامیانہ تمامی کلستابلم سفید بادلے کی جھالر، کلابتون
کی ڈوریاں، سراسر مُغرّق بنا۔ چودھویں رات، اَبر کُھلا، آسمان

صاف، شبِ ماہ؛ سامان اِس تکلّف کا، برسات کی چاندنی،
سُبحانَ اللہ! فوّاروں کے خزانے میں بادلا کٹا پڑا، ہزارے
کا فوّارہ چڑھا۔ پانی کے ساتھ بادلے کی چمک، ہوا میں پھولوں
کی مہک۔ فوّارے نے زمین کو ہمسرِ آسماں بنایا تھا؛ سِتاروں کے
بدلے، بادلے کے تاروں کو چھپایا تھا۔ بڑی چمک دمک سے ملکہ
کے مکان پر چاندنی دیکھنے کا سامان تھا۔ شہ زادے کے آنے کا کسے
گُمان تھا۔

غرض کہ جانِ عالم کو لے جا، شامیانے کے تلے مسندِ جواہر نگار
پر بٹھایا۔ شرابِ ارغوانی و زعفرانی کی گلابیاں کشتیوں میں لے کر،
وہ وہ زنِ پری پیکر زیب دِہِ انجمن ہوئی کہ بَطِ مَے رشک و
خجالت سے بحرِ ندامت میں غوطہ زن ہوئی۔ ایک طرف جام و سبو،
ایک سمت نغمہ سرایانِ خوب رُو و خوش گلو۔ سفید سفید صُوفیانی
پُوشاک، سر سے پاؤں تک اَلماس کا زیور، دو رویہ صف باندھ کر
کھڑی ہوئیں۔ اِن کے بیٹھتے ہی گانا ناچ شُروع ہوا۔ سارنگی کے
سُر کی زُوں ٹُوں کی صدا چرخ پر زُہرہ کے گوش زد ہوتی تھی۔ طبلے
کی تھاپ، پائیں کی گُمک خُفتگانِ خاک کا صبر و قرار کھوتی تھی۔ ہر
تان اُپج تانسین پر طعن کرتی۔ باز بہادر اور نِکپسا کے ہوش پرّاں تھے۔
چھجّو خاں کو غش تھا، غلام رسول حیراں تھے۔ زمزمے اور تحریر،
گٹکری پر شوری زور شور سے ہاتھ ملتا تھا۔ ہر پسے فقرے اور سُر

کے پلٹے پر الٰہی بخش پوربی کا جی نکلتا تھا۔

ناچنے کو ایسے ایسے برق وَش آئے اور اِس تال وسَم سے گھنگرو بجائے کہ للّو جی شرمائے۔ کتھک جو بڑے اُستاد اَتھک تھے، اُنھوں نے سَم کھائے۔ ٹھوکر، مُردہ دِلوں کی مسیحائی کرتی تھی۔ گَت کے ہاتھ پر یہ گَت تھی کہ مجلس کفِ افسوس ملتی تھی اور دَمِ سرد بھرتی تھی۔

جب ہنگامۂ صحبت بہ ایں نوبت پہنچا کہ راجا اِندر کی محفل کا جلسہ نظر سے گِر گیا، بہشت کا سامان پیشِ چشم پھر گیا؛ اُس وقت ملکہ مہر نگار نے گلاس شراب سے بھر کر شہ زادے کو دیا، کہا: اِسے نُوش کر دیجیے، تا رنجِ سفر خاطرِ انور سے دور ہو، مجھے اِستفسارِ حال ضَرور ہے۔ جانِ عالم نے بہ اَسبابِ ظاہر انکار کیا۔ مہر نگار نے کہا: آپ دل شکنی بُری جانتے ہیں، اِس پہلو تہی کرنے میں ملالِ خاطر کے سِوا کیا مُتصوّر ہے؟ شہ زادے نے مسکرا کر ساغَر ہاتھ میں لیا، یہ شعر پڑھ کر باطَبعِ شگفتہ پیا، انشا:

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے [1]
زاہد نہیں میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

پھر جانِ عالم نے جام لبالب اپنے ہاتھ سے بھر کے ملکہ کو دیا۔ دَورِ جام بے دَغدغۂ نیرنگیِ ایّام چل نکلا۔ دو چار ساغرِ آبِ آتش رنگ جوانی کی ترنگ میں پے بہ پے و مُتواتر جو پیے، دونوں کو گُونہ سُرور ہوا۔ رنجِ سفر اِدھر سے، تمیز و خیالِ خیر و شر اُدھر سے دور ہوا۔ اُس وقت

جانِ عالَم نے کہا، میر دَرد:

ساقیا! یہاں لگ رہا ہے چَل چلاؤ ①

جب تلک بس چل سکے، ساغَر چلے

یہ سُن کر، وہی خَواصِ گرماگرم، جس نے شہ زادے سے پہلے گُفتگو کی تھی، ملکہ کی بہت مُنہ لگی تھی، آنکھ ملا کر بولی، بقاؔ:

لطفِ شبِ مہ اے دل! اُس دم تجھے حاصِل ہو ②

اک چاند بغل میں ہو، اک چاند مُقابِل ہو

ملکہ نے بہ حسرت فرمایا کہ مُردار! ہم تیری چھیڑ چھاڑ سب سمجھتے ہیں؛ کیا کریں، افسوس کی جا ہے! حال اپنا مُوافِقِ قَولِ سودا ہے، رفیع سوداؔ:

جو طبیب اپنا تھا، دل اُس کا کسی پر زار ہے ③

مُژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

جانِ عالَم نے یہ سُن کر، اُسی خَواص کو سُنا کے مُتَنَبِّہ کیا، اُستاد:

میں مسافر ہوں، مجھ سے دل نہ لگا ④

کیا بھروسا مرا، رہا نہ رہا

ملکہ ٹال کر حال پوچھنے لگی، کہا: تم کو قسم ہے پروردگارِ عالَم کی، سچ کہو، تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کس کی تلاش میں خود رَفتہ، گھبرائے ہو؟ اُس وقت جانِ عالَم کو بجز راستی، مَفَر نظر نہ آیا، کہا: ملکہ! میں شاہ فیروز بخت کا بیٹا ہوں، جانِ عالَم نام ہے۔ سَرزمینِ خُتَن وطن ہے فُسحَت آباد بَیتُ السَّلطنت کا مَقام ہے۔ میں نے ایک تُوتا مُول

لیا تھا؛ بہت طرّار، سحر گفتار۔ اُس کی زبان سے شہرۂ حسنِ انجمن آرا سُن کے؛ نادیدہ دیوانہ وار بے قرار، بیاباں مرگ، آوارہ وطن، موردِ رنج و محن ہوا ہوں۔ پھر توتے کا راہ میں اُڑ جانا، وزیر زادے کا پتا نہ پانا، شمّہ بیانِ گرفتاریِ طلسم اور اپنی خواری، جادو گرنی کا نقشِ سُلیمانی دینا اور اپنا رستہ لینا کہہ کر، کہا: بے مُلکِ زرنگار پہنچے نہ جان کو چین ہے نہ دل کو قرار ہے، زیست بے کار ہے۔ اور یہ غزل پڑھی، مؤلّف:

بہ سوزِ شمع رویاں، اِس طرح کا سینہ سوزاں ہوں
کہ رفتہ رفتہ آخر جلوۂ سروِ چراغاں ہوں
نسیمِ صبح ہوں، یا بوے گُل، یا شمعِ سوزاں ہوں
میں ہوں جس رنگ میں پیارے، غرض دم بھر کا مہماں ہوں
نہ پھل پایا لگانے کا، بجز افسوس و حسرت کے
میں نخلِ بے ثمر کس مرتبہ مردودِ دہقاں ہوں
عبث تدبیر ہے گور و کفن کی اُس کے کوچے میں
میں ننگِ دو جہاں، ننگے ہی رکھ دینے کا شایاں ہوں
نہ مرتے مرتے مُنہ پھیرا محبّت سے کبھی میں نے
جفائیں کس قدر جھیلیں، وفا پر اپنی نازاں ہوں
تنی رہتی ہے اکثر چادرِ مہتاب تربت پر
کہ تا معلوم ہو سب کو، قتیلِ مہ جبیناں ہوں

سُرورِ غم رسیدہ ہوں، مجھے طوفانِ محشر میں
ترا نا تو ہی خاوندا! غریقِ بحرِ عصیاں ہوں

ملکہ نے جب سُنا کہ یہ فریفتۂ جمالِ پری تمثالِ انجمن آرا ہے؛ آہِ دِل دُوز، نعرۂ جاں سوز کھینچ کر رُونے لگی، اُمید قطع ہوئی۔ جانِ عالم نے بے قرار ہوکے کہا کہ اَیں ملکہ مہر نگار، خیر باشد! ملکہ نے اُسی بے تابی میں جواب دیا، اُستاد:

مائل اُس فتنۂ عالم پہ کیا جو مجھ کو ①
سوئے بیداد مگر مرضیِ دَوراں آئی
چاکِ دل تک تو کچھ اے دستِ جُنوں، پردہ تھا
یہ کُھلا اب تو کہ نوبت بہ گریباں آئی

اے شہ زادۂ والا تبار، غارت گرِ کشورِ دل، عاشقِ زار! میرا حال سُن،

مصرع: عجیب واقعہ وطُرفہ ماجرایے ہست

باپ میرا بھی شاہنشاہ تھا، بہت سے تاج دار باج گزار تھے؛ مگر اِبتدا سے طبیعت مُتوجّہِ فقر، اور عبادت کی عادت تھی۔ آخر کار، کارخانۂ دُنیا سے دوُں ہیچ و پُوچ جان کے، عزمِ وارستگی ٹھان کے، بَرزباں ہر آن تھا، سوز: جب ہیچ ہی ہم بوجھ چکے وضعِ جہاں کو②
غم ہیچ، الم ہیچ، طرب ہیچ، عطا ہیچ

اور حکومت کا بکھیڑا چھوڑا۔ مُعاملۂ سلطنت بے کار جان اور بے ثباتیِ جہانِ گُذراں مدِّ نظر کر؛ دُنیا سے ہاتھ اُٹھایا، بادشاہت کو مٹایا، آبادی سے مُنہ موڑا، اِس صحرائے پُرخار میں مکان بنا کے بیٹھ رہا۔

ہر چند مجھے شادی کو اِرشاد کیا؛ میں نے بہ سببِ مُفارَقت، انکار کیا۔ اب دَفعۃً آفتِ آسمانی، بلاے ناگہانی مجھ پر ٹوٹ پڑی کہ بہ یک نگاہ عاشق کیا، دیوانی ہوگئی، ہوش و حواس سے بے گانی ہوگئی۔ میر:

رُسوا ہوا، خراب ہوا، مبتلا ہوا①
کیا جانیے کہ دیکھتے ہی مجھ کو کیا ہوا

اور تو اُس کا عاشق و طلب گار ہے، جس کا نظیر اِس زمانے میں ہاتھ آنا بہت دشوار ہے۔ میر:

محمِل نشیں ہیں کتنے خُدّامِ یار میں یہاں②
لیلیٰ کا ایک ناقہ، سو کس قطار میں یہاں

اب بجز مرگ کیا چارہ! میں ننگِ خانماں، خراب کُنندۂ خانداں، فقط ذِلّت و خواری ماں باپ کی اور گریہ و زاری اپنی چاہتی تھی۔ صُبح تو کہاں، میں کہاں! یہ صُحبتِ شب خواب ہوجائے گی۔ نمودِ سَحَرِ مُفارَقت شامِ غُربت کا رنگ دکھائے گی۔ دامنِ سَحَر کی طرح گریبانِ صبر چاک ہوگا، ہمارے سر پر آفت و خرابی آئے گی۔ انصاف کیجیے، کس سے کہوں گی: بے قراری ستاتی ہے؛ جانِ عالم کی جُدائی سے روح بدن سے جُدا ہوتی ہے، جان جاتی ہے۔ ہم صُحبتیں طعنے دیں گی۔ اَنِیسیں چھیڑ چھیڑ کر جان لیں گی۔ جب لونڈیوں پر خفا ہوں گی؛ بڑبڑائیں گی، زبان پر یہ کلمہ لائیں گی: ملکہ عاشقی

کا رنج و ملال یوں درپردہ نالتی ہیں۔ شہ زادہ چلا گیا، نہ رک سکا؛ اُس سے تو بس نہ چلا؛ ہم جو بے بس ہیں، بس غصے کی جھانجھ ہم پر نکالتی ہیں۔ باپ پر حال کُھلا تو خجالت ہوگی۔ ماں نے گر سُنا، تو ندامت سے کیا حالت ہوگی! رُسوائی کے خوف سے دل کھول کر نہ رو سکوں گی۔ بدنامی کے ڈر سے جی نہ کھو سکوں گی۔ جب دلِ بے تاب ہجر سے گھبرائے گا، فرمائیے کون تسکین فرمائے گا؟ کیا کہہ کے سمجھائے گا؟ آپ اُدھر تشریف لے جائیں گے، ہم اِدھر غمِ فُرقت سے گُھٹ گُھٹ کر مر جائیں گے۔ ہماری سَرنوِشت پر رونا روا ہے۔ ماجرا ہمارا عبرت اور حیرت افزا ہے۔ ہر چند ظِلِّ سُبحانی عاملِ بے بَدَل، ساحرِ بے مِثل ہیں؛ عُلوی، سِفلی سب کچھ پڑھا لکھا؛ ہماری پیشانی اور لوحِ جبیں کی تحریر نہ دیکھی کہ کیا پیش آنی ہے! اور خطِّ شکستہ سے ایسے نستعلیق نے کیا بُرا لکھا ہے! افسوس، صد افسوس! مؤلف:

وہ بھی ہوگا کوئی، اُمید بر آئی جس کی
اپنے مطلب تو نہ اِس چرخِ کُہن سے نکلے

یہ باتیں کر، دل پر ہاتھ دھر رونے لگی۔ دامن و گریباں آنسوؤں سے بھگونے لگی۔ شہ زادے کو ثابت کیا، یقین ہوا: ملکہ بہ شدّت فریفتہ و شیدا ہے، بات سے حُزن و ملال پیدا ہے۔ دل دُکھنے کے مزے سے زبان لذّت پا چکی تھی، جان ہجر کے صدمے اُٹھا چکی تھی؛ بے چین ہو کر بولا، زبان کو تسکین کی باتوں میں کھولا، کہا:

آپ کا کدھر خیال ہے، بندہ فرماں بردار بہ ہر حال ہے۔ جو کہو گی، بجا لاؤں گا۔ بارِ اِطاعَت سے سر نہ اُٹھاؤں گا؛ مگر برائے چندے صَبر، دل پر جَبر ضرور ہے۔ اگر اُس کی جُستجو میں نہ جاؤں گا، تمھیں میری کیا اُمّید ہو گی، ہم چشموں سے آنکھ کیوں کر ملاؤں گا؟

سُبحانَ اللہ! وہ وقت دیکھا چاہیے کہ معشوق، عاشق کی تسکین کرے۔ اپنی اِطاعَت اُس کے ذِہن نَشیں کرے۔ خوش قسمتوں کو ایسے بھی مل جاتے ہیں کہ عاشق کے رنج کا غم کھاتے ہیں، دِل داری کر کے سمجھاتے ہیں۔ اِس کا لوگ رشک کرتے ہیں، آتشِ حَسَد سے جل مرتے ہیں۔

ملکہ یہ سُن کر دل میں شاد، بَندِ فکرِ غم سے آزاد ہوئی۔ یہ بات اِمتحان کی ہے: جسے جی پیار کرتا ہے، وہ اگر جھوٹ بھی بولے، عاشق کو سچ کیا، بہ منزِلۂ حدیث و آیت ہو جاتا ہے؛ مگر یہ کہا، مُصحفی:

عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صَبر و تحَمّل ①
وہ کام تو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو

لیکن خَیر، ہم تو اِسے بھی جھیل لیں، یہ کھیل بھی کھیل لیں؛ اگر ہماری یاد تمھیں فَراموش نہ ہو، وحشت کا جُوش نہ ہو۔ جانِ عالَم نے قسمیں شَدید کھائیں، اِختِلاط کی باتیں درمیان میں آئیں کہ اِس میں سَرِ مُو فرق نہ ہو گا۔ اور مُژدۂ وَصل سے مسرور کیا، خَیالِ مُفارَقَت ملکہ کے دل سے دور کیا، کہا: اب ہنسی خوشی کی باتیں کرو، یہ بکھیڑا

جانے دو۔ جُدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے؛ رات تھوڑی، کہانی بڑی ہے۔
فَلَکِ سِفلَہ پَروَر جفا کیش ہے، عاشق و معشوق کا بداَندیش
ہے۔ اُستاد:

بہ شبِ وصل شکوہ ہا مکنید[1]
شب کوتاہ و قصّہ بسیار است

مگر شبِ وَصل اَزَل سے کوتاہ ہے، خدا گواہ ہے۔ دو کلمے ہنسی کے
خوشی سے نہ ہونے پائے، فلک نے رونے کے سامان دکھائے۔ یکایک مُرغِ سَحَر
"بیدار باش" پکارا۔ زاہد ندائے اَللّٰہُ اَکبَر سنا کے للکارا۔ گَجَر کی آواز
بھی دونوں کے کان میں آئی۔ یَساوُلانِ سُلطانِ خاوَر نے صُبح کی
دھوم مچائی۔ ملکہ پریشان ہوکر بولی، مُؤَلِّف:

وَصل کی شب چونک اُٹھے ہم، سُن کے زاہد کی صدا
یاں دمِ تکبیر ہی، اللہ اکبر ہوگیا

وَلَہٗ:

زاہد بھی تیسرا ہے شبِ وصل میں حَرِیف
مشہور گو جہان میں صُبح و خُرُوس ہے

جانِ عالم نے نمازِ صُبح پڑھ کر، کمر بہ عَزمِ سفر چُست کی۔ ملکہ سَہم کر،
آبدیدہ ہو، یہ شعر پڑھنے لگی، جُرأت:

نہ آیا اور کچھ اِس چرخ کو، آیا تو یہ آیا[2]
گھٹانا وصل کی شب کا، بڑھانا روزِ ہجراں کا

جب شاہ زادے نے چلنے کا قصد کیا، ملکہ نے کہا: اگر حرج متصوّر نہ ہو، میرے والد سے ملاقات کر لو۔ یہ امر فائدے سے خالی، لاابالی نہ ہوگا۔ جانِ عالم نے کہا: بہتر ہے۔ پھر وہی خواص ہمراہ ہوئی۔ جب قریب پہنچا، دیکھا: مکان پاکیزہ، بوریائے بے ریا بچھا ہے، مصلّے پر ایک مردِ مہذّب، بہ ذکرِ حق مشغول، با دلِ ملول بیٹھا ہے۔ یہ رسمِ سلام بجا لایا۔ اُس نے دُعائے خیر دے کر ہاتھ بڑھایا، چھاتی سے لگایا۔ قریب بٹھا کے فرمایا: ماجرائے شبِ تیرۂ ملکہ، فقیر پر روشن ہے۔ ایسی بدقسمت دوسری، خلق میں نہیں ہوئی۔ ہمارے کہنے سے انکار کیا؛ بڑے بول کا سر نیچا ہوا، تو تم سے کیا کیا دار و مدار کیا۔ جو تم اتنی تسکین نہ کرتے، اُس کا زندہ رہنا محال تھا، اِسی طرح کا دل پر صدمہ اور ملال تھا۔ اگر ایفائے وعدہ کرو گے، اللہ بھلا کرے گا؛ وگرنہ یہ رنج بڑا ہے، دیکھیے اُس کا حال کیا کرے گا۔ دل داری جگر فگاروں کی، عیادت مرضِ محبّت کے بیماروں کی جواں مردوں پر فرض ہے۔ یہ سمجھنا: ساحل را از خس و خاشاک گذار و گُل را از صحبتِ خار ننگ و عار نمی باشد۔

شہ زادے نے سر جھکا عرض کی: آپ کیوں محجوب فرماتے ہیں، مجبور ہوں۔ اِس عزم میں گھر چھوڑا۔ عزیزوں، یگانوں سے ترک کر، شہر سے منہ موڑا۔ نہ جانے میں وہ جانیں گے: سخت کم ہمّت و بے جرأت تھا، راہ میں آسایش ملی، بیٹھ رہا۔ خوف سے جا نہ سکا، جھوٹا تھا،

ناحق عشق کا دَم بھرا۔ پیرمرد نے فرمایا: مَرحَبا! جزاکَ اللہ!
یہی شرط جواں مردی و ثابت قدمی کی ہے۔ ہمیں بھی، تمھارے اِس
عَزم سے، ایفائے وعدہ کی اُمّید ہوئی۔ پھر ایک لَوح عِنایَت
کی اور کہا: جب کوئی مُہِمّ سخت رُو بہ کار ہو؛ بہ طَرزِ فال، اُس
حال میں اِسے دیکھنا۔ جو نکلے، اُس پر عَمَل کرنا۔ اللہ تعالیٰ وہ
مشکلِ سخت ایک آن میں آسان کرے گا۔ تو، بہ حِفظِ حافِظِ حقیقی
سِپُردَم۔ وَاللہُ مَعَکُمْ اَیْنَ مَاکُنْتُمْ۔ فَرد:

بسفر رَفتَنَت مبارک باد
بسلامت روِیّ و باز آیی

شہ زادہ رخصت ہوا۔ لَوح لے کے ملکہ کے پاس آیا، اُس رُوشن ضمیر
کا ارشاد سُنایا اور یہ زَبان پر لایا، مُؤلِّف:

کوچ کی اپنے اب تیاری ہے
تیرا حافظ جنابِ باری ہے

ملکۂ ناکام گردشِ اَیّام دیکھ اور یہ کلمۂ جاں کاہ سُن کر، کلیجا تھام،
سَرِ شوریدہ کو دُھن کر یہ شعر پڑھنے لگی، اُستاد:

میں مر گئی، سُن اُس کے سَرانجام سفر کا
آغاز ہی دیکھا نہ کچھ انجام سفر کا [1]
کہتے ہیں وہ اب جاتا ہے، ایسی ہی دُعا کر
مَسدُود ہو رستہ دلِ ناکام، سفر کا

مت جان نکمّا مجھے اے جان، لیے چل
کرتی چلوں گی ساتھ ترے کام سفر کا
میں کِشورِ ہستی ہی سے اب کوچ کروں گی
آگے نہ مرے لیجیو تو نام سفر کا
چلنے کی صلاح اُس کے ٹھہرتی نہیں اب ساتھ
موقوف نوازش ہوا آرام سفر کا

آخر جبراً قہراً رُخصت کیا۔ کہا : خُداحافظ، امام ضامن ثامن کے حفظ میں سونپا۔
مصرع : ترا موسیٰ رضا ضامن، ترا اللہ والی ہے ①
جس طَرح بیٹھ دِکھاتے ہو، اِسی صورت اللہ تمھارا مُنہ دِکھائے، غمِ دوری ہمارا دور ہو جائے۔ جانِ عالم یہ سُن کر روانہ ہوا۔ یہاں تپشِ دل کو بہانہ ہوا۔ دریاے سَرِشک چشمِ خوں پالا سے موج زَن ہوا، غَرِیقِ لُجّۂ مُفارَقَت جان وتن ہوا۔ جَلیسیں بولیں : ملکہ! کیوں جی کھوتی ہو! کس واسطے بِلَک کر روتی ہو! مسافر کے پیچھے رُونا زبُوں اَز حَد ہے۔ بی بی خیر ہے! یہ شُگُونِ بد ہے۔ وہ دن بھی اللہ دِکھائے گا، جو وہ پردیسی صحیح سلامت خَیر سے پھر آئے گا؛ تو اُن کو وہ غم کی ماری یہ سمجھاتی، سوز :

چشم کا کام، اشک باری ہے ‏ ‏ ‏ چشمۂ فیض ہے کہ جاری ہے ②

مُؤَلِّف :

بے درد کوئی اِتنا سمجھتا نہیں ہے ہَے! ‏ ‏ ‏ دل دُکھے تو کس طَرح سے فریاد نہ ہووے

وَلَہٗ :

مجھ کو رُونے کو نہ تم مَنع کرو ہم نَفَسو! غمِ دل کرتی ہوں مَیں دیدۂ تَر سے خالی

اور جب آنسو کمی کرتے، تو دل اور جگر سینے میں بَرہَمی کرتے؛ اُس وقت گھبرا کر یہ کہتی، مُؤَلِّف :

مدد اے سُوزِ جگر! تاکہ نہ ہووے خِفّت نُوکِ مِژگاں ہوئی پھر لَختِ جگر سے خالی

پھر نہ مُنہ اُس نے کیا میری طرف، ہے ظالم! سخت تم بھی مرے نالو، ہو اثر سے خالی

نہ لگا اُس کو، مری بات کو تو مان سُرُور! دل کا لگنا، نہیں اے یار، ضَرر سے خالی

غَرَض کہ جوں جوں شہ زادے کی مُفارَقَت بڑھتی تھی، ملکہ صدمۂ ہجر سے دُوں وُوں گھٹتی تھی۔ بَدر سا چہرہ کاہیدہ ہو کے ہِلال ہوا۔ تَپِ جُدائی سے عجب حال ہوا۔ کبھی کہتی تھی: واے ناکامی! اگر دل کا حال کہوں، شَرم آتی ہے؛ جو چُپ رہوں، جان جاتی ہے۔ یہ سب کہتے ہوں گے: ملکہ کو غیرت نہیں آتی، راہ چلتوں سے بیٹھی ہوئی دل لگاتی ہے؛ آپ رُوتی ہے، ہمیں مفت رُلاتی ہے۔ اُس سمجھانے والے کو کہاں سے لاؤں، جسے دل کا حال سُناؤں۔ زیست اِسی میں ہے جو مر جاؤں۔ اب کون آنسو پُونچھ رُونے کو منع کرے گا! کون میرے دَمِ گرم پر آہِ سرد بھرے گا! پیار سے سر چھاتی پر دھرے گا!

جب ملکہ کا یہ حالِ بَتَر، چُپکے چُپکے جی سے باتیں کرنا دیکھ کر، لوگ گھیرتے، دستِ شَفقت سَرِ وَحشت انگیز پر پھیرتے اور پوچھتے کہ اے جی کی دُشمن! ہمیں تُو بتا، دل کا حال کیا ہے؟ تو وہ

کہتی : اور تو کچھ جانتی نہیں، پر یہ نقشہ ہے : ہاتھ پاؤں سنسناتے ہیں، خود بہ خود غش چلے آتے ہیں۔ دم سینے میں بند ہے، گھبراتا ہے، مکان کاٹے کھاتا ہے۔ باغ ویران، گُل و بوٹا خار معلوم ہوتا ہے۔ گھر زِنداں، بات کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے۔ جان بے قرار ہے، بند بند ٹوٹتا ہے۔ دامنِ صبر دستِ اِستقلال سے چھوٹتا ہے۔ جنگل پسند ہے۔ ویرانے کا جی خواہش مند ہے۔ دَشت کا سنّاٹا بھاتا ہے، بلبل کا نالہ دل دُکھاتا ہے۔ خدا جانے کس کی جُستجُو ہے، دل کو مرغوب قُمری کی کُوکُو ہے۔ تنہائی خوش آتی ہے، آدمیوں کی صورت سے طبیعت نفرت کھاتی ہے۔ سینہ جلتا ہے، دل کو کوئی مَسوس کر مَلتا ہے۔ آنکھ ظاہر میں بند ہوئی جاتی ہے، مگر نیند مُطلق نہیں آتی ہے۔ ہاتھ چاہتے ہیں سرِ دَشت چاکِ گریباں دیکھیں۔ پاؤں چل نکلے ہیں کہ بیاباں دیکھیں۔ نَل دَمَن کی مثنوی سے رَبط ہے۔ لیلیٰ و مجنوں کا قصہ پڑھتی ہوں، یہ کیا خَبط ہے۔ دِل کی تمنّا ہے کہ بے قراری کر۔ آنکھیں اُمڈی ہیں کہ اَشک باری کر۔ جہان کی بات سے کان پریشان ہوتے ہیں، مگر جانِ عالَم کا ذِکر دل لگا کر سُنتی ہوں۔ جو کوئی سمجھاتا ہے؛ رُونا چلا آتا ہے، سر دُھنتی ہوں۔ ناکامی، مجھ خستہ و پریشاں کا کام ہے۔ آہ، مجھ بے سَروساماں کا تکیہ کلام ہے۔ مُنہ کی رونق جاتی رہی، زردی چھا گئی، بہارِ حُسن پر خزاں آ گئی۔ ہر دم لب پر آہِ سرد ہے، ایک دل ہے اور ہزار طرح کا درد ہے۔ جان جانے کا

وَسواس نہیں، بزرگوں کا لحاظ و پاس نہیں۔ زیور طَوق و سَلاسِل ہے، زِیب و زینت سے بَدمزگی حاصل ہے۔ دل و جگر میں گھاو ہے۔ بِگاڑنا، بَناو ہے۔ بسترِ نرم خار خار ہے؛ ارے لوگو، یہ کیا آزار ہے! سب سے آنکھ چُراتی ہوں، ہَم صُحبتوں سے شرماتی ہوں۔ اب صدمے اُٹھانے کا یارا نہیں۔ بے موت اِس بکھیڑے سے چھُٹکارا نہیں۔ عجیب حال ہے، اکثر یہ خَیال ہے، مُؤَلِّف:

افسوس! یہ حال ایک عالم دیکھے ایسا نہ ہوا کہ جانِ عالم دیکھے

اگر اِسی کا عشق و عاشِقی نام ہے؛ تو مَیں در گُزری، میرا اسلام ہے۔ جو لوگ عشق کرتے تھے، کیوں کر جیتے تھے؟ بتاؤ تو، کیا کھاتے تھے، کیا پیتے تھے؟ دو دن سے کچھ نہیں کھایا، مگر پیٹ بھرا ہے۔ کھڑی ہوں، جی بیٹھا جاتا ہے۔ پہلے مجھے نہ منع کیا، ہَے ہَے! میری جان کے دشمنو، یہ کیا کیا! اللہ کی مرضی، جیسا کیا ویسا بُھگتیں گے، کسی کا کیا بگڑا۔ میری قسمت کا لکھا، جو کیا، وہ اچھا کیا۔

یہ سن کے ایک کھیلی کھائی، عشق کے نیرنگ دیکھی، وصل کے ہجر میں صدمے اٹھائی، قریب آئی، کہا: قربان جاؤں، واری، ابھی سلامتی سے نَو گرِفتاری ہے جو اِتنی آہ و زاری اور بے قراری ہے۔ سہتے سہتے عادت ہو جائے گی، تو تسکین آئے گی۔ اِن باتوں کے سننے سے چوٹ سی لگی۔ ملکہ کا دل جو بھر آیا، بے اختیار خونابۂ دل، لَخْتِ جگر چشمِ تَر سے مُتَّصِل بہانے لگی۔ دیدۂ دیدار طَلَب سے سمندر کی لَہر لہرانے لگی۔ نَظْم میں دل کا

حال سُنانے لگی، مؤلّف:

حالت ہے اِس کی پارے کی، برق و شرار کی
کیا کیا تڑپ سُناؤں دلِ بے قرار کی

پھوٹے تپش سے دل کی یہ سب آبلے مرے
مِنّت کشی نہ کرنی پڑی نوکِ خار کی

دل اپنا قبر میں بھی جلے گا اِسی طرح
حاجت رہے گی ہم کو نہ شمعِ مزار کی

وعدے کی شب کو، دیدۂ اختر جھپک گئے
دیتے مثَل ہیں لوگ مرے انتظار کی

لے جائیو اُدھر سے جنازہ مرا سُرور
حسرت بھری ہے دل میں مرے کوے یار کی

رُخصت ہونا جانِ عالم کا ملکہ مہر نگار سے اور پہنچنا ملکِ زرنگار، مملکتِ دلدار کا۔ ملاقات خواجہ سرا کی، دریافت ہونا حالِ پُر ملال جادوگر کا۔ پھر اُس کو قتل کر کے، لانا اُس ماہ پیکر کا۔

بیت : یہاں کا تو قصہ یہ چھوڑا یہاں
سُنو پھر اُسی غم زدے کا بیاں [1]

طِلسم کُشایانِ گنجینۂ سُخن، فخرِ سامری و رَہ نوَردانِ اِقلیمِ حکایتِ کُہن، مشّاقِ جادو و شُعبدہ گری؛ رَسامانِ جفاکَش و محنت کَشیدہ؛ سِحر سازانِ سَخُن سنج، دَریں سَرائے سِپَنج رُوئے راحت نہ دیدہ؛ گوسالۂ سَخُن کو دَیرِ خراب آباد میں یوں گُویا کرتے ہیں کہ ملکہ مہرِ نگار کے باغ سے چالیس منزل مُلکِ زَرنگار، کِشورِ آفتِ رُوزگار تھا۔ شہ زادۂ دل اَز کف دادہ، یکّہ و تنہا، صُعوبَتِ سفر کا مُبتلا، پاؤں میں چھالے، لب پر آہ و نالے، گرتا پڑتا، کئی مہینے کے بعد اُس زمینِ خجستہ آئیں میں پہنچا اور جو جو پتے تُوتے نے بتائے تھے، وہ سب اُس جَوار میں پائے۔ واقعی عجب نَواحِ شگُفتہ و شاداب، ہر سِمت چشمہ ہائے آب۔ جنگل سب سبزہ زار، گُل بوٹے خود رُو کی انوکھی بہار۔ ہَوا فرحت انگیز، بُو باس مُشک بیز، جُنوں خیز۔ جانِ عالم خوش و خُرّم جلد جلد قدم اُٹھاتا چلا جاتا تھا۔

ایک روز دو چار گھڑی دن رہے، کیا دیکھتا ہے کہ ایک شَے مِثلِ آفتاب، بہ صد آب و تاب شِمال کی سِمت یہ دَرَخشاں ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی، عقل حیراں ہے۔ دل سے کہا: آثارِ حَشر نمُود ہوئے۔ یہ کیا قیامت ہے، ہم مُشاہدۂ جمالِ جاناں سے محروم رہے۔ مشرق و مغرب کو چھوڑ، سورج شِمال کی طرف جا نکلا۔

افسوس، صد افسوس! اب تک نہ دل کا مُدّعا نکلا جب قریب پہنچا، دیکھا تو دروازہ ہے عالی شان، سر بہ اوجِ فلک کشیدہ، دیدۂ رُوزگار نہ دیدہ۔ بس کہ مُطلّا ہے اور لعل و یاقوت اِس کثرت سے جڑے ہیں کہ جوہریِ وہم و گُماں حیران کھڑے ہیں۔ شُعاعِ آفتاب سے یک رنگیِ خورشید حاصل ہے۔ شرمندہ اُس کے رُو بہ رُو بَدرِ کامل ہے۔ یقین ہوا، اب بَر سرِ مطلب پہنچا۔ یہ وہی دروازہ ہے بابِ اُمید، جس کا ذِکر وہ سُرخ رُو، زمرّد لباس کرتا تھا۔ سجدۂ شُکر بہ درگاہِ منزل رسانِ راہ گُم کردگاں کیا اور خوش ہو کر دوڑا۔ فرد:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک   آتشِ شوق تیز تر گردد

غرض اُفتاں و خیزاں دَرِ شہر پناہ پر آیا۔ دروازۂ جواہر نگار رِفعتِ فلک دِکھاتا، دیوار و دَر جگمگاتا، بلّور کی اینٹیں، یاقوت کی تحریر، ہر خشت مُصفّیٰ و مُطلّا، دَرِ بہشت کی طرح وا۔ حِصنِ حصیں بہ صد فر و تمکیں بنا۔ جا بہ جا بُرج۔ برنجی و آہنیں ڈھلی ہوئی توپیں چڑھیں۔ گولنداز جوان جوان، بنفشئی بادلے کے دگلے پہنے، گُلنار اِک پیچے سجے، چُست و چالاک توپوں کے بائیں دہنے ٹہل رہے۔ زمین و آسماں اُن کی ہیبت سے دہل رہے۔ گلی کوچے صاف، خس نہ خاشاک، کثافت سے پاک۔ دروازے پر پانچ ہزار سوار، لاکھ پیادے؛ کچھ جا بہ جا چوکی پہرے پر، کچھ جنگ کے آمادے۔ چھاونی کے طور لینیں بنیں۔ پیدل

بگڑے دِل جو تھے، اُن کی چھولداریاں تنیں۔

جانِ عالم نے اُن سے پوچھا: اِس شہر کا کیا نام ہے اور حاکم یہاں کا کون ذی اِحترام ہے؟ اُنھوں نے دیکھا: ایک جوان سَرو قامت، قَمر طَلعت، خسوفِ سفر، خاکِ رہ گُذر میں نہاں ہے؛ مگر دَبدَبۂ شَوکت وصَولَت، نشانِ جُرأت چہرۂ انور سے عَیاں ہے۔ وہ خود کہنے لگے: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ شہ زادے نے کہا: بھائی! سوال دیگر، جواب دیگر۔ آخر ایک شخص نے کہا: قبلہ! اِس ملک کو زَرنگار کہتے ہیں، بڑی چمک دمک کے لوگ اِس میں رہتے ہیں۔ سُنتے ہی، چہرہ بَشاشَت سے کُندَن کی طَرح دَمکنے لگا۔ جَوریت کا ذرّہ تھا، اَفشاں کی صورت مُنہ پر چمکنے لگا۔ دل سے کہا: یہ خواب ہے یا بیداری! طالعِ گَردِش دِہ سے اُمیدِ یاری و مددگاری نہ تھی۔ ایسی قسمت رَہ بَر ہماری نہ تھی۔ پھر کچھ نہ پوچھا، یہ کہتا چلا، مُؤَلِّف: لِلّٰہِ الحَمد ٹھکانے لگی محنت میری

طَے ہوئی آج کی منزل میں مَسافت میری

دروازے سے آگے بڑھا۔ شہر دیکھا قَطع دار، ہموار، قرینے سے بازار۔ کُرسی ہر دُکان کی کمر برابر۔ مکان ایک سے ایک بہتر و برتر۔ بیچ میں نہر، جا بہ جا فوّارے۔ سب عمارات شہر پناہ کے میل کی، جَواہِر نِگار، سانچے کی ڈھلی۔ ہاتھ کا کام معلوم نہ ہوتا تھا، کام اُس کا معمارِ عقل کے ہوش کھوتا تھا۔ نہ کہیں بَلندی نہ پستی، ہموار بَسی ہوئی بستی۔ ایک کا جواب دوسری طرف۔ اِدھر

بَزّاز، تو اُدھر بھی۔ صَرّاف کے مُقابِل صَرّاف۔ بازار کا صَحْن نفیس، شَفّاف۔ جَوہَری کے رُو بہ رُو جَوہَری۔ زَر و جَواہر کا ہر سِمْت ڈھیر۔ نَقْد و جِنْس سے ہر شخص سیر۔ کوئی شَے، کسی طَرَح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اُس بازار میں نہ تھا۔ مغرب و مشرق کی اَشیاے نادِرہ کا ہر جا اَنْبار تھا۔ جَنوب و شِمال کا خریدار تھا۔ حلوائی، نان بائی، کُنجڑے، قَصائی۔ سَقّوں کے کٹوروں کی جھنکار۔ میوہ فروشوں کی پُکار۔ دَلّالوں کی بول چال۔ جہان کا اسباب و مال۔ نَہر کی کیفیت جُدا، قَدِ آدم آبِ مُصَفّیٰ۔ فَوّاروں سے کیوڑا، گلاب اُچھلتا، بازار مہک رہا، مسافر ہر ایک بہک رہا۔ ہر طَرَف دھوم دھام، خَلقَت کا اِزْدِحام۔ چلنے پھرنے والوں کے کپڑے، لُٹتے ہوئے جاتے تھے۔ وَہم و گُماں کشمکش سے بار پاتے تھے۔

جانِ عالم قُدرتِ حق دیکھتا جاتا تھا، ہوش برجا نہ آتا تھا۔ دل سے کہتا تھا: اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیْر۔ کیا مُلک، کیا سلطنت، کیا شہر و بازار ہے! کیا بیوپاری ہیں، کیسا کیسا خریدار ہے! ہر شخص کو آرام و راحت ہے، کیا بَنْد و بَسْت با اِنتظام ہے، کیا حکومت ہے! جب چَوک میں آیا، پوچھا: اَیوانِ جہاں پناہ، دَولت سَرائے شاہ کی کدھر راہ ہے؟ لوگوں نے کہا: دَسْتِ راست سیدھے چلے جائیے۔ پیاس لگی ہو تو شربت حاضر ہے۔ بھوک ہو تو جس شَے پر رغبت ہو، کھائیے۔ مَدِ نظر مسافر نوازی ہے، جو چیز ہے گرما گرم، تازی ہے۔ اَلغَرَض بازار طَے کر قریبِ عِماراتِ بادشاہی جب آیا، اُن مکانوں کو نِرا طِلِسْم پایا۔ عقل کام نہ کرتی تھی۔ ہر کُنگُرہ اَیوانِ فلک سے

اونچا۔ بُرج ہر ایک جہاں نُما، خورشید سا چمکتا۔ لیکن جو لوگ درباری یا مُلازمِ سرکاری آتے جاتے دیکھے، سب سیاہ پُوش، غَم خانۂ اَلَم کے جُرْعَہ نُوش۔ اِس کا ماتھا ٹھنکا، پاؤں ہر ایک کئی مَن کا ہوگیا۔ ہر شخص کا مُنہ تکتا تھا، قدم اُٹھ نہ سکتا تھا، گویا سکتہ تھا۔ کہتا: خُدا خیر کرے! شگُونِ بد ہے، دل کو بے قراری اَز حَد ہے۔ چند قدم اور بڑھا۔ سواری کا سامان سامنے آیا "بچو، بڑھائیو" کا شُور بلند پایا۔ دیکھا: ایک خواجہ سَرا پُرانا، زِیرَک و دانا، محبوب علی خاں نام، نوّاب ناظِرِ سَرا پردۂ شاہی بااِحترام؛ وہ بھی باخاطِرِ حَزِیں، غمگیں، سِیہ پُوش، حَواس باخْتہ، ہُوش فَرامُوش، اَندُوہ یاد، رنج سے ہم آغوش۔

جانِ عالم نے سلام کیا۔ وہ جواب دے کر شہ زادے کو دیکھنے لگا، حیران و شَشْدَر، مُتحیّر سا؛ اور سواری رُوکی، کہا: سُبحانَ اللہ وَبِحَمدِہٖ! کیا تیری قُدرت کی شان ہے! جِنْسِ بَشَر میں کس کس طَرح کا پری پیکر خَلْق کیا ہے کہ چشم کو تابِ جمال، زبان کو صِفَت کی مجال نہیں۔ نہایت مُتوَجِّہ ہوکر پوچھا کہ اے شَمشادِ نَورُستہ، چمنِ جہاں بانی و سَرْوِ نوخیز بُوستانِ سلطنت و حُکم رانی! حُضور کہاں سے رَونق بَخش اِس شہرِ نحوست اثر کے ہوئے؟

شہ زادے نے کہا: میاں صاحِب، خَیر ہے! ہم فَقَط اِس شہر اور یہاں کے شَہر یار کے شوقِ دید میں وطن سے بَعِید ہو، خَستہ و خراب، بادِلِ مُضطَر و جانِ بے تاب یہاں پہنچے ہیں۔ برائے خُدا، یہاں کی نحوست، اپنی سِیہ پُوشی کی عِلّت بیان کیجیے۔ خواجہ سَرا نے

یہ سُن کر نعرہ مارا، بے چین ہو کر پکارا کہ اے جوانِ رَعنا! تو نے یہ قصّہ سُنا ہوگا: زینتِ تختِ سلطنت، رَونقِ شہر، موجِدِ آبادی، صاحبِ جاہ و حشمت، مالکِ عفّت و عصمت انجمن آرا یہاں کی شہ زادی تھی۔ شُہرۂ جمالِ بے مثال اُس حوُرطَلعَت، پری خصال کا اَز شَرق تا غَرب اور جنوب سے شمال تک زبان زَدِ خلقِ خُدا تھا۔ اور ایک جہان حُسن کا بیان سُن کر، نادیدہ اُس کا مُبتَلا تھا۔ آج تک چشم و گوشِ چَرخِ کَج رفتار نے، بہ ایں گردشِ لَیل و نَہار، ایسی صورت دیکھی نہ سُنی تھی۔ مُرقّعِ دَہر سے وہ تصویر چُنی تھی۔ بہت سے شاہ اور شَہر یار، اُس کے وادیِ طَلَب میں قدم رکھ کر تھوڑے عرصے میں آوارۂ دَشتِ اِدبار، پتھروں سر مار مار، مصرع: رہ رَوِ اقلیمِ عَدَم ہو گئے۔

اب پانچ چار روز سے ہمارے طالعِ بیدار جاگتے جاگتے دَفعَۃً سو گئے۔ ایک ساحِرِ مکّار، جفا کار، بہ زورِ سحر اُسے محل سے اُٹھا لے گیا۔ داغِ غمِ فرقت دے گیا۔ ہنُوز یہ جُملۂ غم ناتمام تھا کہ جانِ عالَم کا کام تمام ہوا۔ آہِ سرد کھینچ کر بہ حالِ خستہ و پریشاں، مثالِ قالِبِ بے جاں زمین پر گر کے بہ حسرت و یاس پکارا، شعر:

جی کی جی ہی میں رہی، بات نہ ہونے پائی [1]
حَیف ہے، اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اے گردُونِ جفا پَرداز و اے فَلَکِ عَربَدہ جو! یہ کیا تیری خو ہے! اِتنی دور لاکر ناکام رکھا۔ مؤلّف:

عشرت کدے جہاں میں ہوئے سیکڑوں، وَے
اک دل ہمارا تھا کہ وہ ماتم سرا رہا
تاثیرِ آہ دیکھی، نہ گریے میں کچھ اثر
ناحق مَیں اِس اُمید پہ کرتا بُکا رہا
کیا دیکھتا ہے سینے کو میرے تو اے سُرورؔ
جُز یادِ یار، اِس میں نہیں دوسرا رہا

شعر: یہ کہہ کر وہ اِس طَرح غش کر گیا کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا [1]

خواجہ سَرا سخت گھبرایا، سمجھا: یہ شخص بھی گرِفتارِ محبّت، اَسیرِ دامِ اُلفت اُسی کا ہے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، دَفعَۃً خبرِ بد سُنانی نہ تھی، آفت اِس کی جان پر جان کر لانی نہ تھی۔ ہر چند گُلاب، کیوڑا چھڑکا؛ ہوش نہ آیا۔ بدحواس، بادشاہ کے حُضور میں حاضر ہوا، رُو کر عرض کی: آج ماتمِ انجمن آرا تازہ ہوا۔ بادشاہ نے فرمایا: کیا ماجرا ہے؟ اُس نے عرض کی: کسی ملک کا شہ زادہ اُس کی محبّت میں سلطنت سے ہاتھ اُٹھا، فقیرانہ سج بنا یہاں تک پہنچا ہے۔ مجھ سے جادوگر کے اُٹھا لے جانے کی خبر سُن کر، آہ کھینچ زمین پر گرا ہے۔ اب تک ہوش نہیں آیا تھا۔ عجب صدمہ دل پر دھر گیا ہے! خدا جانے جیتا ہے یا مر گیا ہے! خلق کا اَنبوہ اُس کے سر پر ہے، بازار لوگوں کی کثرت سے بھر گیا ہے۔ کیا عرض کروں! غلام کی نظر سے اِس سج دھج کا پری پیکر آج تک از قسمِ بشر نہیں گزرا۔ اگر اِن دونوں کی صورت آئینۂ چشم میں بہم نظر آتی، قِرانُ السَّعدَین

کی کیفیت کُھل جاتی۔ جو حُضور ملاحظہ فرمائیں گے، شہ زادی کو بھول جائیں گے۔

بس کہ بادشاہ غمِ مُفارقَتِ انجمن آرا سے بے قرار تھا، اَرکانِ سلطنت سے کہا: جلد جاؤ، جس طرح ہو اُسے لاؤ۔ لوگ دَوڑے، مُردے کی صورت اُٹھالے گئے۔ اِس عرصے میں شام ہوئی۔ بادشاہ نے ہاتھ مُنْہ دُھلوا، بید مُشک چھڑکا، کیوڑا مُنْہ میں چُوایا، لَخْلَخہ سُنگھایا۔ جانِ عالم کو ہوش آیا، گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ دیکھا: ایک شخص تاجِ خُسرَوانہ بَرسَر، چارقَبِ مُلوُکانہ دَر بَر، سِن رَسیدہ، لَیل و نَہار دِیدَہ، بڑے کَرّ و فَر سے تخْت پر جلوہ گر ہے۔ اور چار ہزار غلامِ زَرّیں کمر باشمشیر و خنجر، اُوپَچی بنا، دَست بَستَہ رُو بہ رُو کھڑا ہے۔ گِرد امیر، وزیر، سِپہ سالار، پہلوان، گُردانِ گردن کَش، ایک سے ایک بہتر جوان اپنے اپنے قَرینے سے زیب دِہِ کُرسی و دَنگل ہے۔ تہمتنوں کا جنگل ہے۔ جانِ عالم اُٹھا، بہ طَورِ شاہ و شَہریار و شہ زادہ ہاے عالی تبار رسمِ سلام بجالایا۔ سب تعظیم کو اُٹھے۔ بادشاہ نے گلے لگا پاس بِٹھایا۔ جب سے بادشاہ کی نظر پڑی تھی، مَحوِ حُسنِ دل فَریب، مَفتُونِ چہرۂ مِہر وَش و صورتِ پُر زیب ہو گیا تھا۔ اور حُضّارِ مجلس بھی سب دنگ تھے، سکْتے کے ڈھنگ تھے۔ سب کو صدمۂ تازہ یہ ہوا کہ ایسا وارِثِ تاج و تخْت ہاتھ آئے اور محروم پھر جائے۔ اُس وقت کا رنج و قَلَق شہ زادے کا کوئی فراق کَشیدَہ سمجھے، بہ قولِ مرزا حسین بیگ صاحب، شعر:

حسرت پر اُس مسافرِ بے کس کی رُوئیے ⁽¹⁾   جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

مگر باعثِ شرم وحیا کہ لازمۂ شُرفا و نُجبا ہے، خاموش، سینے میں غم کا جوش و خروش۔ بادشاہ نے اِستفسارِ وطن اور نامِ جدّ و آبا کیا۔ یہاں فرطِ الَم، کثرتِ غم سے گلا گھٹ رہا تھا؛ مگر ضبط کو کام کر کے، حسب و نسب اور مُلک کا پتا بتایا۔ پھر سر جُھکا شہ زادی کا حال پوچھا۔ بادشاہ نے فرمایا: اے گرامی اخترِ سپہرِ شہریاری! مدّت سے ایک جادوگر اِس فکر میں تھا۔ یہاں بہ مرتبہ نگہبانی ہوتی تھی، لیکن وہ دُھوکا دے کر لے گیا۔ آج تک محل میں نہیں گیا ہوں۔ وہ محل، جو عِشرت کدۂ خاص تھا، ماتم سرائے عام ہے۔ ہر سُو شورِ رِقّت، ہر سمت نالۂ پُر آفت بلند ہے۔ کھانا پانی حرام، چھوٹا بڑا مُبتلائے آلام ہے۔ جانِ عالم نے کہا: کچھ یہ بھی ثابت ہوا کہ کدھر لے گیا۔ بادشاہ نے فرمایا: پانچ کوس تک پتا ملتا ہے۔ آگے قلعہ ہے سر بہ فلک کشیدہ، آگ سب بھری ہے، شعلہ سرگرم تا چرخِ چنبری ہے اور انگاروں کا انبار تا کُرۂ نار ہے۔ وہاں کا حال نہیں کُھلتا ہے، عقل بے کار ہے؛ مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سحر کا کارخانہ ہے۔ آگ کا بہانہ ہے، ہمیں سُلگا کے جلانا ہے۔ شہ زادے نے کہا: خیر، اگر حیاتِ مستعار باقی ہے، بہ مددِ ایزد کہاں جانے پاتا ہے؛ اُس ملعون کو جہنّم واصل کر کے، شہ زادی کو فدوی زندہ لاتا ہے۔

یہ کہہ کر اُٹھا کہ قبلہ، خُدا حافظ! بادشاہ لپٹ گیا، کہا: بابا! خدا کے واسطے اِس خیالِ مُحال سے درگزر۔ طائرِ خیال کے اُس دشت میں پر جلتے ہیں۔ پیکِ صبا کے پاؤں میں چھالے نکلتے ہیں۔

دوسرے، مجھے مُفارَقت تیری کب گوارا ہے۔ ایک کو دھوکے میں کھویا،
تجھے دیدہ و دانستہ جانے دینے کا کہاں یارا ہے۔ ایسی آفت میں تجھ سے
جوان کو جانے دوں! بُڑھاپے میں بد نامی لوں! سلطنت حاضر ہے،
بِسْمِ اللّٰہ حُکم رانی کر۔ میں ضعیف ہوں، گوشے میں بیٹھ اللہ اللہ
کروں۔ شہ زادے نے عرض کی: یہ تخت و سلطنت حُضور کو مُبارَک
رہے۔ بندہ آوارہ خانماں، ننگِ خانداں، گھر کی حکومت و ثَروَت چھوڑ،
عزیزوں سے مُنہ موڑ، خراب و خستہ، سَرگرداں، دردر حیران و پریشاں ہو
یہاں تک پہنچا؛ اب یہ کلمہ ہَتک اور ذِلّت کا سُننے کو جیتا رہوں، مُلک
بیگانے میں بادشاہت کروں۔ لوگ کہیں: جادو گر تو شہ زادی کو لے گیا؛
یہ شخص بے غیرت تھا، جیتا رہا، سلطنت کرنے لگا۔ جواں مردی سے
بعید ہے۔ عاشق کو معشوق کی راہ میں جان دینا عید ہے۔ لا اَعْلَم:

تا سَر ندہم، پا نکشم از سَرِ کویش
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

پَگ آگے، پَت رہے اور پَگ پا چھے، پَت جائے۔ قَدَمِ عشق پیشتر بہتر۔
جس مددگار نے ہزار بلا سے بچا کے یہاں تک زندہ و سالِم پہنچایا ہے،
وہی وہاں سے بھی مُظفّر و منصور آپ سے ملائے گا۔ نہیں تو یہ صورتِ
نَحس لوگوں کو دکھانی کیا ضَرور ہے۔ گو بَشَر مجبور ہے؛ لیکن اِس زیست
سے آدمی مرنا گوارا کرے، بے مَوت مرے۔ پہلے جب عقل و عشق سے
مَعرکہ اَٹکا تھا، میرا دل کھٹکا تھا۔ عَقْل کہتی تھی: ماں باپ کی مُفارَقت

اِختیار نہ کرو ، سلطنت سی شے نہ چھوڑو۔ عشق کہتا تھا : ماں باپ کس کے ! آزاد ہو، بادشاہت کیسی! سَرِشتۂ اُلفتِ غَیر توڑو۔ کوچۂ دل دار کی گدائی، سلطنتِ ہفت اِقلیم ہے ، اگر مُیسّر آئے۔ بے یار خدا کسی کی صورت نہ دِکھائے۔ عقل کہتی تھی : آبرو کا پاس کرو ، ننگِ خانداں نہ ہو۔ غریبُ الوَطنی سے عار کرو ، صحرا نَوَردی نہ اِختیار کرو۔ عشق کہتا تھا : یار کے ملنے میں عزّت ہے ، بادِیَہ پَیمائی میں بہار ہے۔ تَشنۂ خونِ آبلۂ پا مُدّت سے صحرا کا خار ہے۔ عقل کہتی تھی : یہ لباسِ شاہی ، قَبائے فرماں رَوائی چاک نہیں کرتے۔ دانش مند جادۂ راستی سے خلاف قدم نہیں دَھرتے۔ عشق کہتا تھا: لباس ، عُریانی ہے۔ عقل دیوانی ہے۔ یہ وہ جامہ ہے جسے اِحتیاجِ شُست وشُو نہیں۔ کیسی ہاتھاپائی ہو ، چاک نہ ہو، کسی آلایش سے ناپاک نہ ہو؛ اَصلاً کارِ سُوزَن و رَفو نہیں۔ نہ بار برداری اِس کو چاہیے ، نہ چُور کا ڈر ، نہ راہ زَن سے خَطَر ہے۔ پانی سے بھیگے نہ آگ سے جلے ، سڑے نہ گلے ، گلے سے کبھی جدا نہ ہو۔ نہ بند بندھے ، نہ وا ہو۔ نہ کوئی اِس کو لے سکے ، نہ خود کسی کو دے سکے۔ نہ دستِ وحشت میں اِس کا تار آئے ، نہ اِس کے دامن تک سَرِ خار آئے۔ نہ اِس کا جسمِ لاغَر پر بوجھ ہو ، نہ کسی کے بدن پر بار ہے۔ مسافرِ صحرائے محبّت کو یہی درکار ہے۔ آتشؔ :

تن کی عُریانی سے بہتر نہیں دُنیا میں لباس ①

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

آخر کار بہ صد تکرار عقل کو شکستِ فاش ہوئی ، کوچۂ دِلبر کی تلاش

ہوئی۔ نام سے نفرت، ننگ سے تنگ ہو، نشانِ ہوش و حواس مٹایا۔ سلسلۂ دیوانگی ہاتھ آیا۔ طبیعت عشق کی محکوم ہوئی۔ وحشت کی ترقی میں سر اور پتھر کا مقابلہ ہوا، لڑکوں کی دھوم ہوئی۔ دامانِ غیرت، گریبانِ حیا چاک ہوا۔ ننگ و ناموس کا قصّہ بکھیڑا پاک ہوا۔ ایک پرندہ، کہ توتا تھا، رہ بر و مددگار ہوا۔ دوسرا دِرندہ، وہ وزیر زادہ تھا، تنہائی میں غم گُسار ہوا۔ پھر تو سلطنت اور وطن چھوڑ، عزیز اور یگانوں سے رشتۂ محبّت توڑ، رہ نوردِ بادیۂ حرماں اور گام فرسائے دشتِ اِدبار ہوا؛ لیکن اُن کا ساتھ بھی نہ سزاوار ہوا، فلک درپئے آزار ہوا۔ پہلی بسم اللہ یہ غلط ہوئی کہ منزلِ اوّل میں توتا اُڑ گیا۔ وزیر زادہ ہرن کے ملنے سے چھٹ گیا۔ وہ جو اثاث ظاہر کی دل لگی کا تھا، لُٹ گیا۔ تنہائی ہمراہ ہوئی۔ مُمدِّ دمِ گرم سرد آہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد طِلسم میں پھنسایا۔ ہمیں رُلا کے دشمنوں کو ہنسایا۔ تھوڑی سی آفت اُٹھا کے رِہائی پائی۔ سمتِ مطلوب کی راہ ہاتھ آئی؛ مگر نہ سنگِ نشاں دیکھا، نہ میل نظر آیا۔ نہ گردِ کارواں دیکھی، نہ صدائے زنگ و جرس سُنی۔ نہ راہ بر ملا، نہ کفیل نظر آیا۔ سواری چھٹی، پیادہ پائی ملی، فکرِ غیر سے رہائی ملی۔

جب اِس منزل میں حضرتِ عشق نے آزمایا، باوجودِ آبلہ پائی اور خَلشِ خارِ صحرا ثابت قدم پایا؛ دوسرے مرحلے میں اِمتحان مدِّ نظر ہوا، پریوں کے اکھاڑے میں گزر ہوا۔ ایک مہ سیما کو اِس جانب میلان ہوا، پھر وہی عیش و نَشاط کا سامان ہوا۔ بہت سے نیرنگ دِکھائے، ہر شب عجب دن آگے آئے۔ للہِ الحمد کہ شیشۂ عِصمت

سنگِ ہَوا و ہَوَس سے سالِم رہا۔ وحشتِ دل کا یہ دستور عالَم رہا۔ رُخصت میں مَصلحَت جانی، جوان و پیر کی بات نہ مانی۔ اب گھر پہنچ کر دُھوکا کھانا، جان بوجھ کر بھول جانا کس مِلّت میں روا ہے؟ یہ نِرا وَسوَسہ ہے۔ مجھ سے وحشیِ بےخود سے ایسی ہوشیاری دُور ہے۔ جیتے جی مرگ منظور ہے۔

اِس گُفتگو کی خبر محل میں پہنچی کہ آج اِس طَرح کا مہ جَبیں، حَسیں، انجمن آرا کا عاشق وارِد ہوا تھا؛ وہ بھی حرارتِ مَحبّت سے اُسی آگ میں جلتا ہے۔ جو دیکھتا ہے، آنسو بہاتا ہے۔ انجمن آرا کی ماں دَرِ دَولت سَرا پر چلی آئی۔ خواجہ سَرا دوڑے، بادشاہ سے عرض کی: جلد شہ زادے کو لے کر محل میں رونق فرما ہوجیے۔ بادشاہ جانِ عالَم کو ہمراہ لے آرام گاہ میں تشریف لایا۔ وہ بھی ہزار جان سے نِثار ہو، دیر تک پروانہ وار اُس شمعِ انجمنِ سلطنت کے گِرد پھری۔ رنڈیوں نے گھیر لیا، سب کو قلَق ہوا۔

غرض کہ بہ ہزار سَعی بادشاہ نے بہ مِنّت صُبح کی رُخصت پر اُس شب رُوکا۔ پہر بجے خاصہ طلب ہوا۔ شہ زادے نے انکار کیا۔ وہی نوّاب ناظِر حاضر تھا؛ پاؤں پر گرا، گِرد پھرا، سمجھایا: پیر و مُرشِد! کئی دن سے محل میں کھانا پانی سب کو حرام ہے؛ جو آپ کچھ بھی نُوش فرمائیں گے، تو یہ سب کھائیں گے۔ ناچار باخاطِرِ فگار دو چار نوالے پانی کے گھونٹ سے حلَق میں اُتارے۔ پھر ہاتھ مُنہ دُھو، نیند کا بہانہ کر پلنگ پر جا لیٹا؛ مگر نیند کس کی اور سُونا کیسا! مُؤلِّف:

وا دَرِ دیدہ سدا رہتا ہے تیری یاد میں
آنکھ جب سے لگ گئی، رُوتے ہیں سُو جانے کو ہم

پھر لیٹے لیٹے انجمن آرا کا تصوّر کر، دمِ گرم و آہِ سرد سینے سے بھر کر، یہ پڑھنے لگا، اَبیات:

①
تجھ بِن ہے خراب زندگانی ہے مجھ کو عذاب زندگانی
اِتنا تو نہ چھپ، کہ لے کفن کا گھبرا کے نقاب، زندگانی

جب کروَٹیں بدلتے بدلتے پَسلیاں دُکھ جاتیں اور بے قراریاں ستاتیں؛ تو دلِ بے تاب کو مُستَعِدِ ضَبط، آمادۂ جَبر و صَبر کر یہ کہتا، نظم:

②
کمالِ ضبط کو عاشق کرے اگر پیدا کہاں کی آہ، کرے بات بھی اثر پیدا
ہزار رنگ زمانے نے بدلے، پر افسوس کہیں ہوئی نہ شبِ ہجر کی سحر پیدا
کرے گی ہمسری نالے کی میرے تو بلبل! شعور اِتنا تو کر جا کے جانور پیدا
ہمیشہ ہاتھوں سے اِن کے رہا ہوں میں جلتا یہ زُور گرم ہوئے تھے دل و جگر پیدا
یہ دل میں ذوقِ اسیری ہے جو قفس میں مُدام میں نوچتا ہوں، جو ہوتے ہیں بال و پر پیدا

آخرِش بہ صد نالہ و آہ، کراہ کراہ صُبح کی۔ بعدِ فراغِ نمازِ پُر سُوز و گُداز مرنے پر کمر باندھی۔ شب کو یہ خبر عام ہوئی تھی کہ کل جادوگر کی لڑائی کو، شہ زادہ آمادہ ہو، جائے گا۔ دیکھیے فلک کیا تماشا دکھائے گا! پہر رات رہے سے مجمعِ عام دَرِ دیوانِ خاص پر تھا۔ یکایک روشنی آئی، بادشاہ تخت پر سوار، برابر شاہ زادۂ والا تبار، برآمد ہوا۔ چشمِ مُشتاقاں میں نورِ طُور نزدیک و دور تجلّی کر گیا۔ ہر شخص رُو بہ قبلہ ہو، دُعائے فتح و ظفر اُس ماہ پیکر کی مانگنے لگا۔ اَلقِصّہ جہاں تک

لوگ آتے جاتے تھے، بادشاہ ساتھ آیا، آگے بڑھنے کی تاب نہ لایا۔ جانِ عالم نے قسمیں دے کر رُخصت کیا۔ ناچار، بادلِ داغ دار و خاطرِ فگار قلعے میں داخل ہوا؛ مگر وہاں سے ڈیوڑھی تک صدہا ہرکارۂ صبادَم مُتعَیَّن کیا کہ ہردم کی خبر حضور میں پہنچے۔ جانِ عالم پھر اکیلا باحسرت و یاس رہا۔ غمِ دلبر رفیقِ قدیم پاس رہا۔ یہ شعر پڑھتا آگے چلا، مُصحفیؔ:

اے غمِ یار! میں بندہ ہوں رفاقت کا تری
نہ کیا تو نے گوارا مری تنہائی کو

آگ کا قلعہ سامنے تھا۔ آسمان سے تا زمیں بجز شعلۂ جوّالہ یا بُرجِ آتشیں اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شہ زادہ غور سے دیکھنے لگا۔ ایک ہِرن اُس آگ سے نکلا، اُچھل کود کر پھر اُس میں غائب ہوا۔ جب مکرّر آمد و رفت کی، جانِ عالم نے لَوح پیرمرد کی دیکھی۔ اُس میں معلوم ہوا: اگر یہ اِسم پڑھ کے، کچھ بڑھ کے ہِرن کو تیر مارا اور خطا نہ کی، طِلِسم ٹوٹ جائے گا۔ وَگر نشانہ چوکا، خود آماج گاہِ خدنگِ قضا ہوا؛ کوئی راکھ کے سوا پتا نہ پائے گا۔ شہ زادے نے کہا: جو ہِرن مارا، تو میدان مارا، لطفِ زندگی ہے۔ نہیں، حیلۂ مرگ خوب ہے۔ بے یار جینا مَعیوب ہے۔ یہ سوچ، لَبِ سوفار چلّے سے جوڑ، شِست و مُشت برابر کر اِسم شروع کیا۔ اُدھر ہِرن نکلا، اِدھر تیر کمان سے سَرگوشی کر کے چلا۔ بس کہ یہ قدر اَنداز تھا، اُس کی قضا دامن گیر؛ تیر دوسار ہوا۔ فِردوسیؔ:

فلک گفت اَحسَن، مَلَک گفت زِہ [1]

ہِرن زمین پر گرا، آسمان سے دار و گیر کا غُل اُٹھا: ہاں ہاں، لیجیو گھیریو! جانے نہ پائے! قریب تھا خوف سے جی نکل جائے۔ زمانہ تیرہ و تار، صحرا پُر غبار ہوا۔ گھڑی بھر میں وہ تاریکی دور ہوئی، آفتاب نَمودار ہوا؛ نہ آگ رہی، نہ قَلعَہ۔ برابر سَطحِ میدان، انسان نہ حیوان؛ مگر چبوترے پر لاش جُھلسی ہوئی پاش پاش دیکھی۔ یعنی وہ جادوگر کَرِیہ مَنظَر، سِینڈُور کا ٹیکا ماتھے پر، زرد زرد دانت ہونٹوں کے باہَر، مُنہ مُہری سے گندہ، نُطفۂ حرام، شیطان کا بندہ، بالوں کی لَٹیں لٹکتیں، ہڈیاں، کھوپڑیاں گلے میں پڑیں، کالا بھُجنگا، گانڑ سے ننگا؛ تیر سے چِھد کر جَہنَّم واصِل وہ اُلّو کا پٹّھا، حواصِل ہوگیا ہے شُکر کا سجدہ بجا لایا، قدمِ ہمّت آگے بڑھایا۔

ہرکارے یہ ماجرا دیکھ، فَوراً حُضور میں حاضِر ہوئے۔ بعدِ دُعا و ثَنا عرض کی: اے شَہریارِ ذَوِی الاِقتِدار! فَتحِ مُبارَک۔ شہ زادہ بَلا کا پُتلا ہے؛ ایک تیر میں وہ آگ کا قَلعَہ ٹھنڈا کر، سَرگرمِ راہ ہوا، جادوگر کا گھر تباہ ہوا۔ بادشاہ یہ مُژدۂ فرحت افزا سُن کے خوش ہوا، فرمایا: یقینِ کامل ہے کہ جانِ عالم حَسبِ دِل خواہ مُراجعَت کرے گا، فتح و فیروزی شامل ہے، ہونہار بِروے کے چِکنے چِکنے پات۔ خبرداروں کو خِلعَت و انعام مُوافِقِ قَدر و مَنزِلت مَرحَمت کر، پھر روانہ کیا۔

اِس عرصے میں شہ زادہ وہ وادیِ پُرخطَر، میدانِ سراسر ضَرَر کو طے کر، مُتّصِلِ قَلعۂ ساحِر، جہاں انجمن آرا قید تھی، پہنچا۔ وہ عجیب

مُعلّق قلعہ تھا۔ زمین سے چار پانچ گز بلند بہ رُوئے ہَوا ایک تختہ کُمھار کے چاک کی طرح بہ ایں سُرعت گردِش میں تھا کہ نگاہ کام نہ کرتی تھی۔ آنکھ کی پُتلی اِتنا جلد نہ پھرتی تھی۔ بلند ایسا کہ دیکھنے میں پگڑی گرتی تھی۔ جانِ عالم وہاں ٹھہرا، وہ قلعہ بھی حرکت سے ساکت ہوا۔ اُس وقت مُفصّل نقشہ معلوم ہوا کہ قلعہ جواہر نگار ہے، زیب و زینت بے شمار ہے۔ دروازے چار ہیں۔ بُرج گنے نہیں جاتے، ہزار در ہزار ہیں۔ کمندِ فکر اُس کی بلندی کے رُو بہ رُو کوتاہ ہے۔ ہر طرف سے سحر بند، مسدُود راہ ہے۔ جہاں جانِ عالم کھڑا تھا، زَمُرّد کا بنگلا نظر آیا، اُس میں سے آواز آئی کہ اے اَجَل رسیدہ! کیوں مَلَکُ الْموت کو چھیڑتا ہے، زندگی سے مُنہ پھیرتا ہے؟ مجھے تیرے حُسن و صورت پر رَحم آتا ہے۔ جلد یہاں سے جا۔ خطاے اوّل، عِوضِ خوبیِ شکل و شمائل مُعاف کی؛ وگرنہ بہ ایں شدائِد و خواری قتل کروں گا کہ آسمان تیرے حالِ پریشاں پر خون روئے گا۔ ساکنانِ زمیں کو گوشت پوست، ہڈیوں کا پتا نہ ملے گا، بادشاہ تیرے غم میں جان کھوئے گا۔ اِس دشت کی خاک تیرے لَہو سے رنگین ہوئے گی۔ روح بھی تا حشر خوابِ مرگ میں آرام سے نہ سوئے گی۔

شہ زادے نے ہنس کر کہا: اے مادر بہ خطا! تو کیا ہماری خطا مُعاف کرے گا، کہاں تک لاف و گزاف کا دَم بھرے گا۔ اِنشاءَ اللہ تعالیٰ اور تو کیا کہوں، تجھے بھی اُسی کی پائنتی بھیجتا ہوں۔ یہ

سُن کر وہ جھلّایا۔ بنگلے سے سر نکال، تھوڑے ماش اُس بدمعاش نے
اور کالا دانہ نکالا۔ اُس وقت چرخ چکّر میں آیا اور زمین تھرّائی، جب
سرسوں میں بنولے اور رائی ملائی؛ پھر تیتا ییتا اور ٹونا چماری کو نمک حرام نے پکارا،
اُن دانوں کو اُس احمق نے آسمان کی طرف پھینک مارا۔ دفعتہً ابرِ
تیرہ و تار گھر آیا، شہ زادے پر پتھّر اور آگ کا مینہ برسایا۔ یہ بھی
اسمائے ردِّ سحر پڑھتا تھا، آگے بڑھتا تھا۔ جب آگ قریب آتی،
پانی ہو کر بہ جاتی۔ اور پتھّر بھی ہر ایک خاک تھا، ایسا وہ اِسمِ
پاک تھا۔

جادوگر خفیف ہو کر سحرِ تازہ کی فکر میں تھا۔ جانِ عالم نے لَوح
کو دیکھا، اُس میں نکلا: کسی طرح لَوح کو قلعے کی دیوار سے لگادے،
پھر قدرتِ خالق کا تماشا دیکھ لے۔ شہ زادے نے بہ جرأتِ تمام تَر
اُچک کر لَوح دیوار سے لگائی۔ اُس پر آفت آئی، مرتبۂ اوّل سے
زیادہ چکّر میں آیا؛ پھرتے پھرتے اِس طرح کی صدا ہیبت ناک آئی کہ ہزار توپیں ایک بار
چھٹیں تو ایسی نہ ہو۔ سامری کی روح زیرِ زمیں گھبرائی۔ یہ درجہ مُہیب تھی کہ
گاوِ زمیں کا کلیجا ہِل گیا۔ خورشید بُرجِ اسد میں چھپ کر دہل گیا۔
زمانے کا رنگ دِگرگوں ہوا۔ جنگل گرد برد ہو گیا، وہ ناری سرد
ہو گیا، لرزاں کوہ و ہامُوں ہوا۔ میدان سیاہ، بلند صدائے نالہ و آہ
ہوئی۔ چار گھڑی میں وہ تاریکی دور ہوئی، شہ زادے کی طبیعت مسرور
ہوئی۔ نہ قلعہ نظر آیا، نہ مکانات کا نشان پایا؛ لیکن رِیت کا ٹیلا،

سر کنڈے گڑے اور کچّا سوت نیلا پیلا اُن پر لپٹا، کچھ پھندے پڑے؛ اُس میں وہ ماہِ شبِ چاردہ، حور کی صورت، نور کا عالم؛ پریشان، بدحواس، سراسیمہ، متحیّر، کوئی آس نہ پاس، ہر سمت حیران ہُوہُو دیکھ رہی تھی۔

جانِ عالم نے پہچانا۔ تاب نہ رہی، جی سینے میں رُعبِ محبّت سے سنسنایا۔ اکیلا دیکھ کے کلیجا مُنہ کو آیا۔ ہر چند ضبط کیا، نہ ہو سکا۔ تھرّاتا، دم چڑھا جاتا، دوڑ کر گرد پھرنے لگا، لڑکھڑاہٹ سے گرنے لگا۔ انجمن آرا نے شرما کر، سر کو جھکا کر کہا: سنبھلو صاحب! کچھ پاس لحاظ بھی کسی کا نہیں! یوں بے باکانہ پاس چلے آنا حرکتِ مجنونانہ ہے۔ لوگ کہیں گے، دیوانہ ہے۔ مگر اِس گفتگو میں آنکھ بھی چار ہو گئی۔ سِنانِ اُلفت اِدھر تو گڑی ہی تھی، اب دوسار ہو گئی۔ شہ زادہ خنجرِ عشق کا زخمیِ قدیم تھا؛ وہ تازہ شمشیرِ محبّت کی گھائل ہوئی، طبیعت اُدھر مائل ہوئی، بدن تھرّایا۔ جانِ عالم نے یہ سُنایا، میر سوز:

(1) جس کو نہ ہو شکیب، نہ تابِ فغاں رہے — تیری گلی میں وہ نہ رہے تو کہاں رہے
آہستہ رَو تو منزلِ مقصود کو گئے — رفتار گرم تھے، سو ہمیں درمیاں رہے
بندہ نواز! حال پہ میرے کرو نگاہ — ہے جائے گریہ یہ کہ پسِ کارواں رہے

یہ کہہ کر گر پڑا، غش آ گیا۔ عشق کی نیرنگیاں نہاں نہیں، حاجتِ اِظہار و بیاں نہیں۔ کشش اِس کی چھوٹے بڑے پر آشکارا ہے، ہزاروں کو اِس نے فریب سے مارا ہے۔ انجمن آرا کو دلِ مضطرب

نے تڑپ کر سمجھایا، بے قراری میں اِس پر قرار آیا کہ یہ مُعتَبَر عاشقِ صادق ہمارا ہے، جو ایسی بلا سے نہ ڈرا۔ سر کو بیچ کر اِس وادی میں پاؤں دَھرا۔ وگرنہ اِتنے دن گزرے؛ بے کسی کے سوا کوئی ہَمدَم، شریکِ زِندانِ غم نہ تھا۔ دل قبضۂ اِختیار سے جاتا رہا۔ حِجاب ہرچند مانع آتا رہا، مگر جانِ عالم کا سر سَرکا، زانو پر رکھا، چہرے کی گرد جھاڑی۔ غَشی تو کبھی آنکھ سے دیکھی نہ تھی، گھبرا کر رُونے لگی، اِس طَرح رُوئے یار دُھونے لگی۔ اور یہاں جو بوند آنسو کی مُنھ پر پڑی اور دِماغ میں خوش بوئے کنارِ دِل دار چڑھی، لَخلَخے کا کام کر گئی؛ گُلاب، کیوڑا چھڑکنے کی حاجت نہ رہی، آنکھ کھول دی۔ سُبحانَ اللہ! سَرِ خاک اُفتادہ کنارِ یار و زانوئے دِل دار پر پایا۔ ناز و نیاز نے دِماغ عرشِ اعلیٰ پر پہنچایا۔ اَور پاؤں پھیلایا، یہ اِترایا۔ انجمن آرا نے جھجک کر گھٹنا سَرکایا۔ جانِ عالم نے چشمِ نیم وا سے شہ زادی کا مُنھ دیکھا اور کہا: ہماری بے ہوشی ہُشیاری سے اچھی تھی! مُؤلِّف:

میں جو چَونکا، تو وہ بھی چَونک پڑا
ہوئی غفلت، جو ہوشیار ہوا

یہ کہ کے آنکھیں بند کر لیں کہ پھر ہمیں غَش آیا، کیوں تم نے زانو سَرکایا۔ انجمن آرا نے کہا: کیا خوب! اِتنا اِختِلاط میری چڑ ہے۔ میں نے تیری محنت و مَشقّت پر نظر کر کے یہ اِنسانیت کی حرکت

کی تھی ؛ تم چل نکلے ۔ خدا جانے دل میں کیا سمجھے ۔ اپنی راہ لیجیے ؛ چلتا دھندا کیجیے ۔ واہ وا ! نیکی برباد ، گُنَہ لازِم ۔ جانِ عالم نے یہ جواب دیا ، اُستاد :

خاک ہی اپنی اُٹھے تو اِس مکاں سے اُٹھ سکے

ہم جہاں جوں نقشِ پا بیٹھے ، نہ واں سے اُٹھ سکے

اِلّا ، چُور کی ڈاڑھی میں تنکا ۔ میں تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا ، نہ معشوقوں کے دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا ۔ انجمن آرا نے کہا : چہ خوش ! بھلا دل تو بہلا لو ۔ کچھ ہو یا نہ ہو ، زبان کا مزہ نکالو ۔ یہ تو وہی مَثَل ہوئی : مان نہ مان میں تیرا مہمان ۔ تمھارا بِعَینِہٖ یہ حال ہے ، فَرد :

چہ خوش گفتست سعدی در زلیخا

اَلَا یَا اَیُّہَا السَّاقی اَدِرْ کاساً وَّ نَاوِلہا

عشق و عاشقی کی باتیں میری بَلا جانے ۔ رَمز و کِنایہ کسی اَور سے جا کے کرو ، اپنا چُو چُلا تہ کر رکھو ۔ اپنی صورت تو غور سے دیکھو ، تم نے سُنا نہیں شاید ، مَثَل : حلوا خوردن را روی باید ۔ جانِ عالم نے کہا : میں بے چارہ خَستہ تَن ، غُربَت زَدَہ ، دور اَز وطن ، مِہنَت پَیَن کہاں سے لاؤں ! کیوں کر ویسی صورت بناؤں ! کوئی خَندَہ پیشانی ہے ، کوئی نصیبوں کو رُوتا ہے ؛ کُفر اور اسلام میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ تمھیں ابھی تک مُوہن بھُوگ کا ذائِقہ نہیں بھولا ہے ، دَمِ تقریر زبان پر حلوا ہے ۔ ہم نے آپ کے واسطے جُوگ لیا ، سلطنت کو تَج دیا ؛ اب مُراد

پوری ہوئی، دڈر دڈری ہوئی۔

انجمن آرا پتے کی سُن کر کھسیانی ہوگئی، کہا: چلو صاحب! وہ مُوا قُربان کیا تھا؛ اپنی چونچ بند کرو، کٹی جلی کی ہنسی اپنے گھر جاکر کرو۔ سِحر جادو، زُور ظُلم، مکر و فریب سے اِنسان ناچار ہے؛ اِس میں کِس کا اِختیار ہے۔ مگر خیر، اور جو چاہے کہ لیجیے۔ در پردہ کیا، صاف صاف گالیاں دیجیے۔ یہ باتیں قسمت کی گردِش سنواتی ہے۔ دیکھوں، ابھی تقدیر آگے کیا کیا دِکھاتی ہے۔ اگر خُدا ہمارا گھر بار چھُڑا موذی کے بس میں نہ پھنساتا، تو ہر ایک راہ چلتا ہمیں کاہے کو ایسی باتیں سُناتا۔

جانِ عالم یہ سُن کر ڈر گیا۔ رنگ زرد ہوگیا، خجالت سے مرگیا۔ سہم کر، آبدیدہ ہو کہنے لگا: میری کیا مجال جو آپ کو کچھ کہوں! میں تو خانماں آوارہ، مُسافر ہوں۔ انصاف تو کرو، تم کتنی ہٹ دھرم، اِحسان فَراموش ہو! ہنسی میں رو دیا، ہمیں دونوں جہان سے کھو دیا۔
انجمن آرا نے دیکھا: اِس کے آنسو جاری، ہچکی طاری ہے؛ مسکرا کر کہا: ایک بات مطلب کی کہی، مگر، مصرع:

سچ ہے، اُوچھے کا بھی احسان بُرا ہوتا ہے

خاطِر جمع رکھ؛ اپنے گھر چل کر تجھے مال و زر سے لاد دوں گی کہ تو چل نہ سکے گا، بوجھ سے ہِل نہ سکے گا۔ شہ زادے نے کہا: آخر سلطنت کا گھمنڈ آیا! ہمیں محتاج جان کے یہ فقرہ سنایا! ہم بھی کبھی

حاجت رَوائے عالَم مشہور تھے ، مگر اُلفت سے مجبور تھے ۔ اگر پر تم عاشق نہ ہوتے ؛ کیوں سلطنت کھُوتے ، سر پر ہاتھ رکھ کر رُوتے ۔

یہاں یہ نُوک چُوک ، چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی ؛ وہاں خبرِ فتح و ظفر ہرکاروں نے بادشاہ کو پہنچائی ۔ وہ تو ہمہ تن گوش تھا ، اُسی وقت مَع اَرکانِ سلطنت روانہ ہوا۔ ہمراہِ رکاب یگانہ و بے گانہ ہوا۔ ایک سُکھپال ہمراہ لیا ، صبا وار سنّاٹے میں آ پہنچا ۔ جو جو نزدیک تھے ، دور کھڑے رہے ۔ کہارِیاں بادشاہ کا تخت قریب لائیں ۔ انجمن آرا منہ چھپا کر بیٹھ گئی ، جانِ عالَم پاس سے سَرکا ۔ بادشاہ تخت سے اُترا ، جانِ عالَم کو گلے لگایا ، جُراُت کی تعریف کی ، ہمت پر تحسین و آفریں کہی ۔ پھر بیٹی کو چھاتی سے لگا ، سُکھپال میں سوار کیا ، شہ زادے کو برابر تخت پر بِٹھا لیا ۔ ترقّی خواہانِ دولت ، مُلازِمانِ قدیم نزدیک آئے ؛ زرِ سُرخ و سفید تخت اور سُکھپال پر نِثار کیا ۔ اِس قدر اَشرفی ، روپیہ تصدّق ہوا کہ آج تک جو محتاج ، مسافر اُدھر جاتے ہیں ؛ چاندی سُونا پاتے ہیں ، نصیب جاگتے ہیں ؛ ڈھیر کے ڈھیر لے بھاگتے ہیں ۔

بادشاہ کے پھرتے پھرتے ، جلوسِ سواری ، نَوبت نِشان ، فوج اور سب سامان پہنچا ۔ اَہلِ شہر یہ خبر سُن کر ہزاروں دَوڑے ۔ شادِیانے بجاتے ، مُبارَک سلامت کا غُل مچاتے شہر میں داخل ہوئے ۔ مُلک کی رونق گئی ہوئی پھر آئی ۔ خَلقت نے جانِ تازہ پائی ۔ محل میں انجمن آرا رونق اَفروز ہوئی ، سب کو شادیِ نورُوز ہوئی ۔ محل والیوں

نے کُہرام مچایا۔ بادشاہ نے فرمایا: یہ خوشی کا وقت ہے، نہ ہنگامِ غم؛ اِسی طَرَح سب بِچھڑے خدا کی عِنایت سے باہَم ہوں۔ انجمن آرا کے، ماں، گرِد پھرتی تھی، دَم بہ دَم سجدہ کرنے کو زمین پر گرتی تھی۔ کہتی تھی: اللہ نے، میرے، بدولتِ جانِ عالم دن پھیرے۔ انجمن آرا جب یہ نام سُنتی، خوش کیا، کِھل جاتی؛ اِلّا، لوگوں کے سُنانے کو، تجاہُلِ عارِفانہ کرکے یہ سُناتی: صاحِبو، خَیر ہے! یہ کیا بار بار کہتی ہو! جو میرا مُقدّر سیدھا نہ ہوتا، تو وہ کون تھا جو دِن پھیرتا!

ہم صُحبتیں، مزاج داں اِس رُکھائی سے تاڑ گئیں کہ آپ کی بھی آنکھ پڑی، طبیعت لڑی۔ جب اُس کی ماں سَرکی، وہ سب پاس آ آ کہنے لگیں: ہَے ہَے! ہم تو تیری مُفارَقَت میں مرتے تھے۔ زندگی کے دن، گھڑیاں گِن گِن بھَرتے تھے۔ یہ صورت اللہ نے دکھائی، یا جانِ عالم کی جوتیوں کے صدقے سے نظر آئی۔ جس طَرَح ہمارے مطلبِ دِلی ملے، خالق اُس کے بھی جی کی مُراد دے۔ انجمن آرا غُصّے کی شکل بنا، تیوری، بھوں چڑھا کہنے لگی: تم سبھوں کی شامت آئی ہے! کیا بیہودہ بَک بَک مچائی ہے! چُوچلے کی خوبی، بُزرگی خُردی سب ڈوبی! واہ وا! تم نے میری چِڑ نکالی، اپنی دانِست میں دیوانی بنالی! خدا جانے یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے! سبھوں نے میرا مَغز کھایا ہے۔ اُسے تو کیا کوسوں، وہ تو مسافر بے چارہ ہے؛ جی میں آتا ہے اُس کا مُنہ نُوچوں جس جس نے یہ نَخرا بگھارا ہے۔ اور بھئی،

مجھے چھیڑو گی تو رُو دوں گی، اپنا سر پیٹ لوں گی۔ یہ کہہ کر مُسکرانے لگی، ہونٹ چبانے لگی۔ آپس میں رَمز و کنایے رہے۔

تمام مُلازِمانِ بادشاہ، مَع رُؤسا ے ترقّی خواہ نذریں لے کر حاضر ہوئے۔ شہر میں مُنادی ہوئی کہ جتنے ساکِنانِ قلمرو بادشاہ ہیں، فقیر سے ہفت ہزاری، بڑے آدمی سے بازاری تک؛ آج کاروبار موقوف کر کے ناچ دیکھیں، خوشی کریں۔ اور جسے مقدُور نہ ہو، سرکار سے لُو۔ تمام شہر میں عیش و نشاط، راگ رنگ کی مجلس بافرحت و اِنبساط ہوئی۔ بادشاہ نے جشنِ جمشیدی کیا۔ تمام شب بادۂ گُل گوں کا دَور رہا۔ ناچ گانا، صُحبتِ بے تکلّفانہ؛ یہ طَور رہا۔ دَمِ صُبح شاہِ کیواں جاہ دیوانِ عام میں رونق اَفزا ہوا۔ دَرِ خزانہ و قید خانہ وَا ہوا۔ اِس قدر زَر و جَواہِر محتاج، فقیروں کو عنایت و اِمداد ہوا کہ کاسۂ گدائی اُن کا، جام و صُراحی سے مُبدّل ہوگیا۔ محل میں برمحل رَت جگے، صَحنک، جا بہ جا کُونڈے، حاضِری، دَونے، پُڑیاں منّتوں کی جس جس نے مانی تھیں؛ کرنے، بھرنے، دینے لگیں۔ اور ڈُومنیاں تَرّاق پَرّاق، پری وَش، خوش گُلو، با انداز مَع سامان و ساز حاضر ہوئیں۔ مُبارک سلامت کہہ کر "شادی مبارک" گانے، چہچہے مچانے، نئی مُبارک باد سُنانے لگیں، مُؤلّف:

شادی و جشنِ سزاوار مبارک ہووے
آج شہ زادی کا دیدار مبارک ہووے

صَدوسی سلامت رہے با اَمن و اَماں
حُسن کی گرمیِ بازار مبارک ہووے

وہ بھی دن آئے جو سہرا بندھے سر پر اس کے
سب خوشی سے کہیں ہر بار: مبارک ہووے

بعد شادی کے، خدا دے کوئی فرزندِ رشید
ہم کہیں آکے: یہ دِل دار مبارک ہووے

خار کھاتے رہیں کم بخت جو دشمن ہوں سُرور
دوستوں کو گُل و گُلزار مبارک ہووے

بیانِ جلسۂ شادی اُس وطن آوارہ کا۔ انکار کرتا اُس مِہر سِیما، ماہ پارہ کا۔ ماں کا سمجھانا، اُس کا شرما کے سِر جُھکانا۔ پھر سامان برات کا، مزہ لوٹنا پہلی رات کا۔

①
کدھر ہے تو اے ساقیِ گُل عِذار
مرا، غم سے، دل ہو گیا خار خار

پلا دے کوئی ساغرِ لالہ رنگ
جوانی کی لائے جو دل میں ترنگ

کہے کتنے صَحرا نوَردی کے رنج
بھلا کچھ تو شادی کا ہوں نغمہ سنج

سُرودسَرایانِ بزمِ شادی و نغمہ پَردازانِ محفلِ عَروسی و دامادی، انجمنِ بیاں میں یہ زَمزَمہ سَنج ہوئے ہیں کہ جب جلسۂ عیش و طَرب سے فرصت سب کو ہوئی؛ ایک روز بادشاہِ جَم جاہ محل سرائے خاص میں جلوہ بخش تھا؛ بی بی سے خَلوت میں فرمایا کہ حُقوق اور اِحسان جیسے جانِ عالَم کے ہمارے ذِمّۂ ہمّت ہیں، تمام عالَم جانتا ہے اور یہ بھی نزدیک و دور مشہور ہے کہ عشقِ انجمن آرا میں نادیدہ مُبتَلا ہو، سلطنت کھو، یہاں آیا ہے اور کس مردانگی سے جادوگر کو مار، اُس کے پھندے سے چُھڑایا ہے۔ اِس کے قَطعِ نظر؛ صورت، سیرت، خُلق، مُروّت، ہمّت، جُرأت؛ یہ جتنی صِفَتیں ہیں، سب خالق نے عطا کی ہیں۔ حَسَب: عالی، نَسَب: والا۔ حُسن میں مِہر و ماہ سے نرالا۔ مُناسب کیا، ضرورت ہے کہ جلد سامانِ شادی درست کر، مُنعَقِد کرو۔ خدا جانے آج کیا ہے، کل کیا ہو! کارِ اِمروز را بہ فردا مَگُذار۔ اُس نے عرض کی: جو رائے اَقدَس میں گزرا، یہی میرا عَین مطلب تھا۔ بادشاہ نے فرمایا: آج انجمن آرا سے یہ مُقدّمہ اِظہار کر کے، جوابِ باصَواب حاصل کرلو؛ کل سے سَرگرمِ سامانِ شادی ہو۔

یہ کہہ کے، بادشاہ دیوانِ عام میں رَونق اَفزا ہوا۔ انجمن آرا کو ماں نے طلب کیا اور دو چار مُغلانیاں، اَنّو سِن رَسیدہ، محل دارِیں جہاں دیدہ، قدیم جو تھیں، اُنھیں بُلایا۔ شہ زادی کی جَلیسیں بھی، یہ خبر سُن کر، بے بُلائے آئیں۔ اُس نے پہلے بیٹی کو گلے سے

لگایا، پیار کیا، پھر کہا: سُنو پیاری! دُنیا کے کارخانے میں یہ رَسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک، بیٹی کسی کی، ماں باپ پاس ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور غیرت دار کے گھر میں لڑکی جوان، ہر وقت رنج کا نشان، خِفّت کا سامان ہے۔ اور خُدا و رسول کا بھی حُکم یہی ہے کہ جوان کو بِٹھا نہ رکھو، شادی کر دو۔ وَراے اِن باتوں کے، ایک شخص نے تمھارے واسطے گھر بار چھوڑا۔ سلطنت سے ہاتھ اُٹھا، کسی آفت سے مُنہ نہ مُوڑا۔ جی پر کھیل گیا، کیا کیا بلائیں جھیل گیا۔ سر کھپی اور جان جُوکھوں کی؛ جب تم نے ہم کو دیکھا، ہم نے تمھاری صورت دیکھی۔ شکل میں پری شمائل، فَرخُندہ خو، فرشتہ خصائل۔ تمام شہر عاشقِ زار ہے۔ چھوٹا بڑا اُس پر فریفتہ و نِثار ہے۔ ہر چند، تم پارۂ جگر، نورِ نظر ہو؛ مگر واری، جو انصاف ہاتھ سے نہ دو تو تم میں اُس میں بڑا فرق ہے! تمھیں اللہ نے عورت بنایا ہے، وہ مردِ میدانِ نبرد ہے۔ رنڈی، مرد کا بہت تفاوُت مشہور ہے۔ آگاہ نادان و ذی شعور ہے۔ اِلّا، جانی! ہمارا کہنا، آرسی مُصحف میں نظر پڑے گا۔ دیکھیے گا، جو دکھائی دے گا۔

انجمن آرا نے یہ سُن کر سر جُھکا لیا، رُونے لگی۔ کہا: حضرت! صورت شکل کا مذکور یہاں کیا ضرور تھا۔ یہ اللہ کی قدرت ہے: کسی کو بنایا، کسی کو بِگاڑا۔ بہت سے لولے لنگڑے، کانے کھدرے، گونگے بہرے ہیں؛ وہ، چاہیے نہ جییں۔ کہیں نور ہے، کہیں نار ہے؛

گُل کے پہلو میں خار ہے؛ یہ سب صَنعتِ پَروَردگار ہے، دُنیا میں کون سی شَے بے کار ہے۔ بلکہ بُروں سے اچھوں کی تمیز ہے؛ یوں تو بادشاہِ مصر، غلامِ عزیز ہے۔ اور جو بارِ احساں سے دب کر فرماتی ہو کہ ایسا کرو؛ تو دُنیا، عالَمِ اَسباب ہے؛ ایک کا کام دوسرے سے ہوتا آیا ہے۔ یہ شخص نہ آتا اور میرے مُقدّر میں رِہائی ہوتی؛ کچھ ایسا سامان نکل آتا، اَور کوئی اللہ کا ولی پیدا ہوجاتا، میری بند چھڑاتا۔
لِمُؤَلِّفِہٖ:

نیک و بدِ زمانہ نہیں اِختیار میں
ہوتا وہی ضَرُور ہے، جو سَرنَوِشت ہو

میری قسمت کم بَخت بُری ہے؛ ایک مصیبت سے چُھڑا، دوسری آفت میں پھنسایا۔ ہر دم کے طعنے اپنے بیگانے کے سُننے پڑے کہ یہ آیا، مجھے قید سے چُھڑایا۔ خُدا جانے وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے! اپنے مُنہ سے میاں مٹھو، شہ زادہ ہونے کا سب میں غُل مچایا ہے۔ مَیں آپ کی لونڈی ہوں، بہ ہر صورت فرماں بَردار؛ اگر کُنوِیں میں جھونک دو، چاہ سے گِر پڑوں، اُف نہ کروں؛ مگر جو آپ اِس کی صورت شکل پر رابجھ، محنت اور مَشقّت کو سمجھ بوجھ یہ مُقدّمہ کیا چاہتی ہیں؛ تو میں راضی نہیں۔ اگر مزدوری کی اُجرت، خدمت کا انعام منظور ہے؛ کہ بادشاہوں کے نزدیک احسان کسی کا اُٹھانا، بہت دور ہے؛ تو روپیہ، اَشرَفی، جاگیر عنایت کرو کہ اُس کا بھلا ہو، کام ہو، آپ کا نام ہو۔

یہ فقرہ سُن کے وہ بہت ہنسی، کہا: شاباش بچّی! اُس کی جاں فشانی کی خوب قدر دانی کی! واقعی وہ بے چارہ تمھارے ملک کا یا روپے پیسے کا محتاج ہے! اری نادان! وہ تو خود صاحبِ تخت و تاج ہے۔ اِس بات پر ہم سِنوں نے قہقہہ مارا، کہا: حضور! بس اِن کا یہ شعور ہے۔ اِن کے نزدیک وہ شاہ زادہ نہیں، مزدور ہے۔ انجمن آرا نے جھنجھلا کے کہا: روپیہ وہ شَے ہے اور مُلک وہ چیز ہے کہ اِس کے واسطے اِسفَندیار سا رُوئیں تَن مارا گیا، فَریدون و اَفراسیاب کا سر اُتارا گیا۔

وہ جو دائی، دَدا، آتو، مُغلانیاں پُرانی پُرانیاں حاضر تھیں، بولیں: قُربان جائیں، واری، ماں باپ کی عُدُول حُکمی میں خُدا و رسول کی نافرمانی ہوتی ہے؛ تمھیں انکار مناسب نہیں۔ اور خُدانخواستہ یہ کیا تمھاری دشمن ہیں، جو راہ چلتے کے حوالے، کسی کے کہے سُنے سے بے دیکھے بھالے کر دیں گی۔ آدمی رُوز بہ رُوز عقل و شعور سیکھتا ہے۔ نَشیب و فَراز، بات کا مَحَل مَوقَع سوچتا سمجھتا ہے۔ تم، سلامتی سے، ابھی تک وہی بچپنے کی باتیں کرتی ہو۔ کھیلنے کودنے کے سوا قدم نہیں دھرتی ہو۔

انجمن آرا نے جواب نہ دیا، سر زانو پر رکھ لیا؛ لیکن وہ جو امیر زادیاں اُس کی ہم نَشیں، جَلیس تھیں؛ جن سے راتوں کو اِسی دن کے رُوز مشورے رہتے تھے، بولیں: ہَے ہَے، لوگو تمھیں کیا ہوا ہے! آتو جی صاحِب! بے اَدَبی مُعاف، آپ نے دھوپ میں چُونڈا سفید کیا ہے۔

خَیر ہے صاحبو! دُلھن سے صاف صاف کہوایا چاہتی ہو! دُنیا کی شرم و حیا نگوڑی کیا اُڑ گئی! اِتنا تو سمجھو، بھلا ماں باپ کا فرمان کسی نے ٹالا ہے، جو یہ نہ مانیں گی۔ اَلْخامُوشی نِیم رَضا۔ بوڑھے بڑے کے رُو بہ رُو اور کہنا کیا۔ یہ سُن کے آتُو قدیم، جس نے انجمن آرا کو ہاتھوں پر کِھلایا تھا، پڑھایا لکھایا تھا؛ بِسمِ اللہ کہہ کے اُٹھی، انجمن آرا کی ماں کو نَذر دی، مُبارک باد کہہ کے ہنسنے لگی۔ محل میں قہقہے مچے، شہ زادی بناوٹ سے رُونے لگی۔ نوّاب ناظِر، بیگم کی نَذر لے کر بادشاہ کے حُضور میں حاضر ہوا۔ نَذر دی، خِلعَت مَرحَمت ہوا۔ یہاں تو اَرکانِ سلطنت اِسی دن کے رُوز مُنتظِر رہتے تھے؛ یہ مُژدۂ فرحت اَفزا دریافت کر کے اُٹھے، بہ مَراتب نَذریں گُزریں۔ تُوپ خانوں میں شَلَّک کا حکم پہنچا۔ نوبت خانوں میں شادِیانے بجنے لگے۔ تمام شہر آگاہ ہوا کہ اب بیاہ ہوا۔ مُبارک سلامت کی صدا زمین و آسماں سے پیدا ہوئی۔ شعر:

فلک پر یہ مبارک باد ہے اب کس کے ملنے کی ①
یہ ایسا کون بختاوَر ہے، جس کا بخت جاگا ہے

بادشاہ نے وزیرِ اعظم سے اِرشاد کیا: جانِ عالم یہاں مُسافِرانہ وارِد ہے؛ تم اُمُوراتِ محل میں مُستَعِد رہو، ہم اُس کا سامان سَر انجام کریں۔ وزیر آداب بجا لایا؛ خِلعَتِ فاخرہ ملا، ہاتھی، پالکی سے سَرفَراز ہوا۔ جانِ عالم کا یہ نقشہ تھا: چہرے پر بَشاشَت سے سُرخی، باچھیں تا بُنا گوش کِھلیں، فرحت کے باعِث بَندِ قَبا ٹوٹے جاتے تھے، پھولے نہ سماتے تھے؛ مگر شرم کے باعث

آپ سر نہ اُٹھاتے تھے۔

بادشاہ نے رَمّال، نُجومی، پنڈت، جَفَر داں؛ جو جو علمِ ہیئت اور ہِندَسہ اور نُجوم میں طاق، شُہرۂ آفاق تھے؛ طَلَب کیے اور ساعتِ سعید کا سوال کیا۔ کسی نے قُرعَہ پھینکا، زائچہ کھینچا، شکلیں لکھیں۔ کسی نے پوتھی کھولی۔ کوئی حرفِ مُفرَد لکھ کر حساب کرنے لگا۔ کوئی تُلا، برِچھک، دَھن، مَکَر، کُمبھ، مِین، مِیکھ، بِرَکھ، مِتھُن، کَرک، سِنگھ، کَنیّاں گن کر بِچار کرنے لگا۔ کوئی مُشتَری، مِرّیخ، شَمس، زُہرہ، عُطارِد، قمر، زُحَل کا حال مَعِ گردِشِ بُرج کہ کے؛ حَمَل، ثَور، جَوزا، سَرطان، اَسَد، سُنبُلَہ، قَوس، عَقرَب، جَدی، دَلو، حوُت، میزان کی میزان دے کر، شُمار کرنے لگا۔ کہا: بعدِ مُدّت قمر اور مشتری کا، بہ طرزِ خِلاف، حَمَل میں قِران ہے؛ اِس ہفتے کا دن رات سَعدِ اکبر ہے۔ اور بِالاِتّفاق ایک رُوز مقرّر کیا۔ حُضور سے، بہ قدرِ علم و کمال، خِلعَت اور اِنعام عِنایَت ہوا اور بعدِ جلسۂ شادی، بہ اُمّیدِ دیگر و اِمدادِ وافر اُمّیدوار کیا۔

اَلقِصّہ بہ مُوجِبِ اَحکامِ اختر شَناسانِ بَلند بیں، فلک سیَر، ماضی مستقبل کے حال داں، باریک خیال و مُنَجّمانِ صَدر نشینِ مسندِ گُذشت و دیر، حُکمِ رَوایانِ خوش فال؛ مانجھے کا جُوڑا دُلھن کے گھر سے چلا۔ مزدور سے تا فیل نَشیں، زَن و مرد فَرد فَرد بالباسِ رنگیں۔ پُکھراج

کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے۔ سنہرے خوانوں میں پنڈیاں: مُقوّی، مُفرِح، ذائقہ ٹپکتا، خوان تک بسا۔ اور دودھ کے واسطے اشرفیوں کے گیارہ توڑے۔ طلائی چوکی۔ جواہر جڑا زمرد نگار کٹورا بٹنا ملنے کا۔ کنگنا بہ از عقدِ ثریا، دُرِ یکتا بڑا بڑا۔ لُنگی ملتان کی تھی، بیل بوٹے میں گلستاں کی تھی۔ بٹنا اور تیل بے میل جو عطرِ کشمیر پر خندہ زن ہو، معطر دماغِ انجمن ہو۔ کنٹروں میں عطرِ سہاگ، مہک رہی: ایجادِ نصیر الدین حیدری، از گنجۂ محمد شاہی۔ فتنے کی بو چار سو۔ زعفران کا سا تختہ کھلا، کوسوں تک خوان سے خوان ملا۔ نوبت نشان۔ گھوڑوں پر شہنا نواز، نقارچی جوان جوان۔ سکھپال اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں، اُن کے بناؤ کی تیاریاں۔ کہاریاں پری چھم، برقِ درخشاں کا عالم، باہم قدم قدم۔

اِس سامان سے وہ سب مانجھالے کے، درِ دولتِ نوشاہ پر جو بس گئے، شہر کے کوچہ و بازار بس گئے۔ وہاں دوھا، یہاں دُلھن نے مانجھے کے جوڑے پہنے۔ مبارک سلامت سب لگے کہنے۔ منادی نے ندا کی: جو سفید پوش نظر آئے گا، اپنے خون سے سرخ ہو گا؛ یعنی گردن مارا جائے گا۔ بادشاہ نے خود ملبوسِ خاص رنگین زیبِ جسم کیا، رنگ کھیلنے لگا۔ تمام خلقت ہولی کی کیفیت بھولی۔ شہر میں شہاب اور زعفران کے سرخ و زرد نالے بہے۔ گلیوں میں عبیر، گلال کے ٹیلے ٹیکرے رہے۔ کوچہ ہر بازار کا زعفران زارِ کشمیر تھا۔ ایک رنگ میں ڈوبا امیر و فقیر تھا۔

پھر بہ تاکیدِ تمام خاص و عام کو حکم ہوا کہ آج سے چوتھی تک،

سِوائے اَہلِ حِرْفَہ، اپنے اُمُورِ ضَروری مَوقُوف کر، گھروں میں ناچ دیکھو، جَشْن کرو۔ جو کچھ اِحتِیاج ہو، سرکار سے لو۔ اور ہر رئیسِ محلّہ، سردارِ قوم سے فرمایا: جو جو تم سے مُتَعَلِّق ہوں؛ اُن کی فَرد درست کر، حُضور میں گزرانو، سب کو ہمارا مہمان جانو۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان، خواہ ہندو ہو یا مسلمان، حُضور سے ملے گا۔ اور اَرْبابِ نَشاط کے داروغہ کو اَحکام مِلا: جس کی جیسی لِیاقت ہو، یا جس کا جو شائق ہو، بہ شرطے کہ اُس کے لائق ہو؛ بہ رضامندیِ طَرَفَین، وہ ویسا طائفہ وہاں بھیج دو۔

دُکان داروں کو اِرشاد ہوا: دن رات دُکانیں کھلی رہیں، قریب قریب ناچ ہو۔ اُن کے کھانے کا صَرف، تَصَرُّفی باورچی خانے میں ٹھہرا۔ ہندو کو: پوری، کچوری، مٹھائی، اَچار۔ مسلمان کو: پُلاو، قَلْیہ، زردہ، قُورمہ؛ ایک آبی، دوسری شِیرمال؛ قِرنی کا خوانچہ؛ تَشتری کباب کی، بہت آب و تاب کی۔ شہر میں گلی گلی عَیش و طَرَب، خوشی میں چھوٹے بڑے سب، نہ کسی کو کسی سے غَرَض نہ مطلب۔ پکّا پکایا کھانا کھانا، دُکانوں میں بیٹھے ہر وقت ناچ دیکھنا، سرکار کا کام بنانا، بَغلیں بجانا۔ بَیت:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد①
کسے را باکسے کارے نباشد

اور اِس سے پہلے بہ تعَیُّنِ روزِ شادی؛ نامے بادشاہوں کو، فرمان، راجا بابو کو، صوبے داروں کو شُقّے، عامِلوں کو پَروانے

جا چکے تھے۔ دو چار منزل گرد پیش، سرِ راہ دو دو کوس کے فاصلے سے باورچی اور حلوائی کھانا، مٹھائی گرما گرم تیار کیے بیٹھے رہتے تھے کہ اِس عرصے میں جو مسافر گزرے، یا طَلَبِیدَہ بادشاہ آئے؛ بھوکا نہ جائے۔ اور مُژدَۂ شادی راہ چلتوں کو سُنا، شہر میں بھیج دیتے تھے کہ یہ جلسہ قابلِ دید ہے۔

غَرَض کہ دو منزل، چار منزل بلکہ دس بیس دن کی راہ سے، تَماش بین بے فکرے لکھنؤ والوں سے، سَیر دیکھنے کو آئے۔ اور ساچق کا دن آیا۔ اگر سب سامان بیان کروں، کہانی ناتمام رہ جائے؛ مگر وہی مُشتے نمونہ از خَروارے۔ پچاس ہزار چوگھڑے: رُپہلے، سُنہرے، جواہر نِگار، نُقْل اور میوے سے لَبالَب۔ لاکھ خوان: بہ حُسن و خوبیِ بِسیار، پُر تکلّف سب؛ پچاس ہزار میں مصری کے کُوزے، باقی میں میوہ۔ اور قَند کی چھبڑِیاں مُرَصَّع کاری کی، بڑی تیّاری کی۔ نُقرَئی دَہی کی مَٹکی، گلے میں مَچھلیاں ناڑے سے بندھیں۔ آرایِش کے تخت بے حساب، اِس رَوِش کے جن کے دیکھنے سے صَنّاعی صانِعِ حقیقی کی یاد آئے۔ گُل بوٗٹا اِس سَج دَھج کا، جو نَقْل کو اَصْل کر دکھائے۔ آتَش بازی کے ٹوکرے قِطار در قِطار، بے پایاں۔ سَرْو، جھاڑ، درختِ میوہ دار ہزار در ہزار، لابَیان۔ بہت تُزُک، بڑا سامان۔ آرایِش کے گُلدستوں سے چَمَنِ رَواں ساتھ تھا۔ سرِ دَشت یہ باغ ہاتھوں ہاتھ تھا۔

اِس انداز سے ساچق گئی۔ مہندی کی شب ہوئی۔ وزیرِ درست تدبیر نے خوب تیاری کی۔ نارنول کی مہندی ہزار ہا مَن، بو باس میں دُلھن پن۔ وہ رنگین جس کی دید سے، دستِ نظّارہ مثلِ پنجۂ مرجاں رشکِ عقیقِ یمَن ہوجائے، سُرخ رُو ہمہ تن ہوجائے۔ ایک بار لگائے، لال ہو؛ تمام عُمر کفِ افسوس ملتا رہے، نہ ہاتھ لگنے کا ایسا ملال ہو۔ بہ ظاہر سَر سبز، ہری؛ جگر میں سُرخی کوٹ کوٹ کے بھری۔ جَڑاؤ سینیوں میں حنا، شمعِ مُومی و کافوری اُس پر رُوشن۔ ملیدے کے خوانوں پر جوبن۔ آرایش اور آتَش بازی ہمراہ۔ سب کے لب پر واہ واہ۔ بہت چمک دمک سے مہندی لایا اور یہ رنگ ڈھنگ حُسنِ تدبیر سے دکھایا کہ تمام ہم چشموں میں سُرخ رُو ہوا۔

برات کی رات کا حال سُنو: دیوانِ خاص سے دلھن کا مکان چار پانچ کوس تھا۔ یہاں سے وہاں تک دونوں طرف بِلّور کے جھاڑ آدمی کے قد سے دو چند، سَو سَو بتّی کے سَر بلند، پانچ چھے گز کے فاصلے سے رُوشن۔ اور دس گز جُدا نُقرئی، طلائی پنج شاخہ جلتا۔ اُن سے کچھ دور ہزاروں مزدور ٹھاٹھروں پر روشنی کرتے۔ جھاڑ رشکِ سَروِ چراغاں، چمکتے۔ جا بہ جا ترپولیے اور نَوبت خانے بنے؛ کتھک اتھک اُن پر ناچتے، نَوبت بجتی، مُغرّق شامیانے تنے۔ اِس کے قریب دو رُویہ آتَش بازی گڑی، خلقتِ خدا تماشا دیکھنے کو کھڑی۔ رُوشنی یہ رُوشن تھی کہ چیونٹی سوار کو بہ ہیئتِ مجموعی، مُفصّل معلوم ہوتی تھی۔

غرض نوشہ سوار ہوا، شور و غُل یک بار ہوا۔ کسی نے کہا: سواری جلد لانا! کوئی پٹکا، شملہ سنبھال، خدمت گار کو پُکارا کہ ہاتھی بٹھانا!

پلٹنیں آگے بڑھیں، عربی باجے بجنے لگے۔ کوس و کور گرجنے لگے۔ نوبت و نشان، ماہی مراتب، جلوس کا سامان۔ سواروں کے رسالے دورُویہ باگیں سنبھالے۔ خود اسپے، اِکّے، بیش قرار در ماہے دار۔ پھر ہزار بارہ سے تختِ رواں، تمام تمامی سے منڈھا؛ اُن پر رنڈیاں جوان جوان، شادی مبارک گاتیں؛ سج دھج دِکھا، طبلے بھڑبھڑاتیں۔ بہت سے سانڈنی سوار تیز رفتار۔ خاص بردار: خاصیاں کندھوں پر، دولھا کے برابر۔ اُن کے قریب برچھے والے، بان دار، چوبدار۔ رُوشن چوکی والے: شہنائیں پُرتکلّف، سُر نرالے۔ ہزاروں غلام زرّیں کمر، سُنہری رُپہلی انگیٹھیاں ہاتھوں میں؛ جھولی میں عنبرِ سارا، عودِ غرقی بھرا، سارا شہر مہکتا۔ گرد ہزارہا پنج شاخہ جھنکتا، سونے چاندی کی دستیاں رُوشن، ہُتموں پر جوبن۔ قورمیں چالیس بادشاہ پُرشوکت وجاہ۔ پیچھے بارہ ہزار ہاتھیوں پر امیر وزیر، ارکانِ سلطنت، ترقّی خواہ۔ خواصی میں انجمن آرا کا بھائی، جانِ عالم کا سالا بجائے شہ بالا۔ آہستہ آہستہ، قدم قدم خوش و خرّم چلے۔ کوچہ و بازار بوباس سے مُعطّر تھا۔ چرخِ گرداں دیدۂ دیدبانِ چارُم سے تماشائی تھا، یہ سامان تھا۔ دشت کا وحش و طیر حیران تھا۔

پہر رات رہے دُلھن کے دروازے پر پہنچے۔ ماما، اصیلیں دوڑیں؛ پانی کا تشت ہاتھی کے پاؤں تلے پھینکا۔ کسی نے کچھ اور ٹوٹکا کیا۔ دولھا اُتر کر مجلس میں داخل ہوا۔ بارہ سے طائفہ رنڈیوں کا؛ سوائے بھانڈ، بھگتیے، ہیجڑے، زنانے، کشمیری قوّال، بین کار،

رَبابِیے، سَرُودِیے کے؛ حاضر تھا۔ ناچ ہونے لگا۔ قریبِ صُبح قاضی طَلَب ہوا۔ بہ ساعتِ مُعَیّن کئی سلطنت کے خِراج پر مَہر بندھا۔ طالب و مطلوب کو سِلکِ اِزْدِواج میں مُنْسلِک کیا۔ مُبارَک سَلامت کا غُل مچا۔ میر سوزؔ:

فلک، شب کتخُدائی دیکھ اُس کی، سوزؔ! یوں بولا ①
تجھے یہ رات، اے رشکِ مَہِ انور مُبارک ہو

سب طائِفے ساتھ کھڑے ہو، ایک سُر میں مبارک باد گانے لگے۔ حوصلے سے زیادہ انعام پانے لگے۔ دولھا زَنانے میں طَلَب ہوا؛ وہاں رسمیں ہونے لگیں۔ وہ بھی عجب وقت تھا: آرسی مُصحَف رُو بہ رُو، محبوبِ دل خواہ دُو بہ دُو؛ سُورَۂ اِخلاص کھلا، آئینہ رُونُمائی میں مزے لُوٹتا، سلسلۂ محبّت مُستَحکَم ہورہا۔ ڈومنیوں کا سِٹھنِیاں گانا، دولھا دُلھن کا شرمانا۔ کبھی ٹُونے، گاہ اچھے بنے سلُونے۔ ہمجُولیوں کا پوچھنا: ٹُونا لگا؟ دولھا کا ہنس کے کہنا: عرصہ ہوا۔ کوئی دُلھن کی جُوتی، دولھا کے شانے میں چھُوا گئی۔ کوئی اُسی کا کاجل پارا ہوا لگا گئی۔ ہم سِنوں کی چھیڑ چھاڑ، اُن کے جُوبن کی بہار، فَقَط ململ اور شبنم کے دوپٹوں کی آڑ۔ جس دم یہ رسمیں ہوچکیں، نوبات کی نوبت آئی؛ اِس طَرح چھُنی، کہ دیکھی نہ سُنی۔ میر حسنؔ:

وہ جب پاؤں پرکی اُٹھاتے اَڑا نہیں اور ہاں کا عجب غُل پڑا ②

جس دم یہ رسمیں ہوچکیں؛ پھر ڈومنیوں نے پاہَنی گائی، سب کی

چھاتی بھر آئی ۔ دُلھن سے رُخصت ہونے لگے ، رُو رُو جی کھونے لگے ۔ سواری تیار ہو کے دروازے پر آئی ۔ دولھا نے سہرا سر سے لپیٹ دُلھن کو گود میں اُٹھایا ؛ سب کا دل اُمنڈ آیا ، شور و غُل مچایا ۔ دُنیا کے کارخانے قابلِ دید ہیں ، بلکہ دید ہیں نہ شنید ہیں ۔ شادی میں غم سَلَف سے توام ہے ؛ مگر ثبات بجز ذاتِ باری کسی کو نہیں ۔ مُقدّماتِ جہانِ گُذراں خوابِ پریشاں ہیں ، اِس میں سب حیراں ہیں ۔ مؤلّف :

اک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طَور ، آہ   معلوم ہو گیا مجھے لیل و نہار سے

غرض کہ دُلھن کو سُکھپال میں سوار کیا ۔ بادشاہ نے اسبابِ ضروری ، سامانِ ظاہری کے سِوا ، مُلک و سلطنت و خزانہ جہیز میں لکھ دیا ۔ برات رُخصت ہوئی ۔ وہ اِہتمام ، تجمّل ، سواری کا سامان ۔ ہر شخص خُرّم و خنداں ۔ جہیز کا آگے بڑھنا ، لوگوں کا دولھا پر دُعائیں پڑھنا ۔ نسیمِ سحر کا چلنا ، شمع کا جھلملا جھلملا کے جلنا ۔ شہنا میں بھیروں ، بِبھاس ، اَلَیا ، للت ، رام کلی کا پھونکنا ۔ نقیب اور چوبداروں کا کوئل کی طرح کوکنا ۔ نوبت کی ٹکور ، جھانجھ کا جھانجھ سے شور ۔ جھٹ پٹا وقت ، نور کا تڑکا ۔ کڑکیتوں کا سوہیل کڑکا ۔ کچھ کچھ تاروں کی چمک ۔ نقاروں کی صدا ، دھونسے کی گُمک ۔ چاند کے مُنہ پر سفیدی ، دُلھن والوں کی یاس و نااُمیدی ۔ عطر کی ہر سو لپٹ ، پھولوں کی مہک ۔ سب کو نیند کا خُمار ، کوئی پیادہ کوئی سوار ۔ فرش

باسی ہار پھولوں سے رشکِ صحنِ چمن ؛ کہیں جھول ، کہیں شکن ۔ کسی جا پنکھڑی ٹوٹے اور پیڑوں کے پتّے کھلے پڑے ، کہیں لوگ حیران و ششدر کھڑے ۔ مجلس کے فراق میں ، اہلِ محفل کے اشتیاق میں ، شمع کی زاری ، اشک باری ۔ لگن میں پروانوں کی بے قراری ، خاکساری ۔ دولھا کے لوگوں کی خوش بشّاش تیاری ، دُلھن کے گھر میں نالہ و زاری ۔ کوئی کہیں نیند کی جھونک میں پڑا ، کوئی یہ سامان بہ چشمِ عبرت دیکھ ، تاسّف میں کھڑا ۔ شمع فانوس میں گُل ۔ گُل ، گُل گیر میں ۔ زیرِ انداز پر پروانوں کے پر ، فرّاش فرش اٹھانے کی تدبیر میں ۔ بیٹھی ہوئی ہر ایک کی آواز ؛ کہیں سوز ، کہیں ساز ۔ یہ وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے ، راہ چلتا بھی دیکھ کر روتا ہے ۔ اِس کی لذّت وہ جانے ، جس کی نظر سے یہ ہنگامہ گزرا ہو ۔ کسی کی برات دیکھی ہو ، گو بیاہ نہ کیا ہو ۔

قصّہ مختصر ، دولھا شگفتہ خاطر ، خنداں ۔ چہرے پر شباب کی چمک ، عارضِ تاباں سے حُسن کی بہار عیاں ۔ ہاتھی پر سوار ، گردِ شاہ و شہریار ۔ زرِ سرخ و سفید نثار ہوتا ۔ سرِ چوک پہر بجے دیوانِ خاص میں داخل ہوا ۔ اب گھر پہنچنے کی ریت رسم ہونے لگی ۔ دولھا دُلہن جب اُترے ؛ بکرا ذبح کیا انگوٹھے میں لہو لگا دیا ، پھر کھیر کھلائی ۔ رسموں سے فرصت پائی ۔ اب یہ منتظر ہوئے کہ شام ہو ، وصل کا سرانجام ہو ۔ اُس دن جانِ عالم کا گھبرانا ، گھڑی گھڑی گھڑیالی سے دِن کی خبر منگوانا دیکھنے کی گوں تھا ۔ بدحواس پھرتا تھا کہ کہیں جلد رات ہو ، بے تکلفی کی ملاقات

ہو۔ کبھی کہتا تھا: واہ، قسمت کی خوبی! پہر بھر کا عرصہ ہوا، گھڑی نہیں ڈوبی! ہوش کہاں بجا تھا، مکرر پوچھتا: ابھی کیا بجا تھا؟ اُدھر انجمن آرا بھی جمائیاں لیتی تھی، تکیے پر سر دھر دیتی تھی۔ جب یہ بھی تدبیر بن نہ آتی تھی؛ لوگوں کے چونکانے کو اونگھ جاتی تھی۔

غرض کہ خدا خدا کر وہ دن تمام ہوا، نمود وقتِ شام ہوا۔ عروسِ شب نے مقنعۂ مہتاب سے رو پوشی کی، مشتاقوں کو فرصت ملی گرم جوشی کی۔ لوگ آنکھ بچا کر جا بہ جا کنارے ہوئے، دولھا دُلھن چھپر کھٹ میں ہم کنار بے تابی کے مارے ہوئے۔ شادی کا روز، شباب کا عالم؛ مشتاقوں کا بیٹھنا باہم۔ آنکھوں میں خمار نیند کا، دل میں اشتیاق دید کا۔ عطرِ سہاگ اور فتنے کی خوش بو۔ بٹنے اور تیل کی عجب میل کی مہک ہر سو۔ پھولوں سے پلنگ بسا، اَدقچہ کسا۔ خود نشۂ عشق سے باختہ حواس، تمنائے دل پاس، نہ کچھ دغدغہ نہ وسواس۔ ہنگامۂ صحبت طرفین سے گرم؛ اُدھر شوق، اِدھر شرم۔ ایک طرف ولولۂ گرم جوشی، ایک سمت کثرتِ حیا سے منہ پر مُہرِ خموشی۔ بیان کرنا گذشتہ حال کا، خیال لوگوں کی دیکھ بھال کا۔ یہ معمول ہے: اُس روز ہم سنیں تاکتی جھانکتی ہیں؛ لیکن اِن ڈروں پر چپ نہ رہے، آہستہ آہستہ دونوں نے دُکھڑے کہے۔

جانِ عالم نے توتے سے ذکر سن کر در بہ در خراب خستہ ہو کر آنا، توتے کا بیٹھ رہنا، وزیر زادے کا صدمۂ فراق سہنا؛ پھر

طِلِسم کا پھنس جانا، جادوگرنی کا ستانا؛ بعد اِس کے نقشِ سُلیمانی لینا، وہاں سے چل دینا؛ بہ کُشادہ پیشانی و خوش بیانی بیان کیا۔ مگر ملکہ مہر نگار کی ملاقات، جَگَت رَنگی کے حرف و حکایات؛ اُس کی طبیعت کا آجانا، اپنا بے اِعتنائی سے چلے آنا؛ کچھ شرما کے، بات کو مطلب کی جا سے چبا چبا کے بیان کیا۔ یہ اکثر ہوا ہے کہ معشوق کے رُو بہ رُو، جو اِس پر کبھی کوئی عاشق ہوا ہے، اُس کا ذکر کرتا ہے شیخی بگھارتا ہے، کچھ جھوٹ اپنی طرف سے جوڑتا ہے، دل کے پھپھولے توڑتا ہے۔ اِس کی شَرح، گو طوُل طلَب ہے؛ پر، عاشق مزاجوں پر مُنکَشِف سب ہے۔

انجمن آرا نے جادوگرنی کے قصّے پر تاسُّف کیا۔ ملکہ کے مَذکوُر پر بَناوَٹ سے ہنس دیا۔ پھر رُوکھی صورت بنائی، ناک بھوں سمیٹی، تیوری چڑھائی؛ مگر چلے آنے کے سہارے پر مسکرائی۔ اپنا بھی اِشتیاق، لیے دیے، اَز رُوزِ ملاقات، محنت و مَشقّت کی قدر دانی سے، جادوگر کی لڑائی میں جاں فشانی سے بیان کر کے کہا: اَلْاِنْسانُ عَبِیدُ الْاِحْسانِ۔ جب اِس طَرَح کے دو دو اُنچھر ہو چکے، دل کے ارمان کھو چکے؛ پھر دونوں بے ساختہ ہو، شرم و حیا کھو ہم آغوش ہوئے۔ رنج درکنار، غم و دردِ مُہاجرت فراموش ہوئے۔ مُؤلّف:

یہ ہم کنارِیِ جاناں سے تازہ لطف اُٹھا گلے سے ملتے ہی، سب رنج درکنار ہوا

سینے سے سینہ، لب سے لب، ہاتھ پاؤں؛ بلکہ جتنے اَعضائے جِسم ہیں،

سب وَصل تھے، مَثَل ہے: ایک جان دو قالب؛ وہ ایک جان ایک ہی قالب، غالب ہے کہ ہو گئے۔ اُستاد:

ایامِ وصل میں ہم پلٹے ہیں جیسے اُس سے　　　یوں وَصلی کے بھی کاغذ چسپاں بہم نہ ہوں گے (1)

خواہش کو اِضطرار، حیا مانِعِ کار، شرم برسَرِ تکرار۔ دونوں کے دم چڑھ گئے تھے، انداز سے بڑھ گئے تھے۔ دست بُردی، ہاتھا پائی تھی، چُوریاں تھیں۔ جنگِ زرگری، گاو زُوریاں تھیں۔ شہزادی مَوقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ جب بے بس ہو جاتی تو چُٹکیاں لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی: اے صاحب! اِتنا کوئی گھبراتا ہے! دیکھو تو کون آتا ہے! کبھی خود اُٹھ کے دیکھتی بھالتی تھی، کوئی دم یوں ٹالتی تھی۔ آخر کار جب غمزہ و ناز کی نوبت بڑھ گئی، تھک کے ڈھب پر چڑھ گئی۔ غُنچۂ سَربَستہ، تمنّائے دراز، بہ حرکتِ نسیمِ وَصل شگُفتہ و خنداں ہوا۔ دُرِ ناسُفتہ، دُرجِ شہریاری، رشکِ عقیقِ یمنی، غیرتِ دِہِ لعلِ بدَخشاں ہوا؛ جیسا پیرِ دِہقاں، فردوسیِ سخن داں نے کہا ہے، شعر:

چناں بُرد و آورد و آورد و بُرد　　　کہ دایہ ز حسرت پسِ پردہ مُرد

رشک و حسرت سے جگرِ صَدَف چاک ہوا، قطرۂ نیساں صَدَف میں گرا، دشمن کم بخت در پردہ ہلاک ہوا۔ تقاضائے سِن، اَلھڑ پنے کے دن؛ سیر تو یہ ہوئی اُس وقت دونوں ناتجربہ کار، بادۂ اُلفت کے سرشار کیا کیا گھبرائے، ہزاروں طرح کے نئے نئے خَیال آئے، کیفیت سب بھولی؛ جب دامنِ شب میں چادرِ پلنگ پر شَفَقِ صُبح پھولی۔ غرض کہ شرما کے اِستراحت فرمائی، دلِ بے تاب نے تسکین پائی۔

ہنوز پلک نہ جھپکی تھی، صُبح کا غُلغُلہ ہوا، نمُودِ سحَر ہوئی، خاص و عام میں شب کی خبر ہوئی۔ دمِ صُبح ایک سُرخ رُو، دوسرا ژُولیدہ مُو حمّام میں داخل ہوئے۔ جو جو مَحرمِ راز، شریکِ ناز و نیاز تھیں؛ رات کی باتوں کے پتے رمز و کنایے میں دینے لگیں۔ کوئی شرمایا، کوئی جھنجھلایا۔

غمزہ و ناز ہر انداز میں رہا۔ اُس وقت قہقہے کا شور آسمان پر پہنچایا، جب خوانوں میں پنجیری اور شیشوں میں تنبول آیا۔ الغرض نہادھو خاصہ نوش فرمایا۔ جانِ عالم بادشاہ کے حضور میں آیا، خلعتِ فتح پایا۔ اب اُمورات سلطنت بہ مشورۂ شاہ زادہ ہونے لگے۔

بعد رسم چوتھی چالے کے، لبِ دریا ایک باغ بہت تکلّف کا، نشاط افزا نام، بادشاہ نے رہنے کو عنایت کیا۔ اگر اُس باغ کی تعریف رقم کروں، شاخِ زنبق و نرگس کی ٹہنی کو لاکھ بار قلم کروں۔ اِلّا، خضر کی حیات، رضواں کا ثبات درکار ہے؛ نہیں تو ناتمام رہے، لکھنا بے کار ہے۔ سو بار خزاں جائے، بہار آئے؛ ایک پٹڑی کی روشِ صفا تحریر نہ ہو سکے، خامۂ مانی پھسل جائے۔ رشکِ گلزارِ جناں، ایک تختۂ فردوس سا کئی کوس کا باغِ بے پایاں۔ برگ و بار، گل اُس کے جورِ خزاں سے آزاد بالکل۔ نہ بلبل پر ستمِ باغباں، نہ خوفِ صیّاد؛ عجائب غرائب چہچہے، نئے رنگ ڈھنگ کے ترانے یاد۔ جتنے دُنیا کے میوے ہیں، تر و تازہ ہمیشہ تیّار۔ سرسبز پتّے، خوش رنگ پھول، پھل مزے دار۔ گُل تکلیفِ خار سے بری۔ جہان کی نعمت ہر تختے میں بھری۔ روش کی پٹڑیوں پر مہندی کی ٹٹیاں کتری ہوئی برابر۔ چمن میں وہ وہ درخت پھلے پھولے، جسے دیکھ کر انسان کی عقل بھولے۔ پھولوں کی بوے خوش سے دل و دماغ

طاقت پائے۔ جو پھل نظر سے گزرے، بارِ خاطر نہ ہو؛ ذائقہ زبان پر، مُنھ میں پانی بھر آئے۔

نہریں ہزار در ہزار، پُر از آبشار۔ گرد چرند و پرند خوب صورت، قطع دار۔ باغبانیاں پری زاد، حور وش، کم سن، مہر لقا۔ بیلچے جواہر نگار ہاتھوں میں۔ ہر ایک آفت کا پرکالہ، دل رُبا، مہ سیما۔ گُندھی ہوئیں پختہ، جڑاؤ چرخی، رستے کلابتون کے۔ ڈول وہ کہ عقل دیکھ کر ڈانواں ڈول ہو۔ چمڑے سے پر نزاکت برسے۔ بیل کے بدلے نیل گائے کی جوڑیاں۔ آہو جن کے روبہ رو چہ کارہ، باغبانیاں مہ پارہ۔ زربفت کے لہنگے قیمت کے مہنگے۔ شبنم کے نفیس دوپٹے مُغرّق۔ مسالے کی کُرتی، انگیا۔ چھڑے پاؤں میں: طلائی، وا چھڑے۔ کان کی لَوئیں ہیرے کی بجلی: برق دم، سب کی آنکھ جس پر پڑے۔ کوئی ڈول کو سنبھال ٹپّا، خیال گاتی۔ کوئی شعرِ برجستہ یا ہندی کا دوہا اُس میں ملاتی، چھیڑ چھاڑ میں چٹکی لے کے اُچھل جاتی۔

ایسے باغِ پُر بہار میں جانِ عالم اور انجمن آرا ہاتھ میں ہاتھ، پریوں کا اکھاڑا ساتھ، دین و دُنیا فراموش، ہردم نوشا نوش، باعیش و نشاط اوقات بسر کرنے لگا۔ جہان کا ساز و ساماں ہردم مُہیّا۔ شراب و کباب، چنگ و رباب کا جلسہ۔ خدمت گزاریں پری طلعت، ماہ پیکر سب کام کو حاضر۔ جیسے کنھیّا شامِ عشرت سحر کرنے لگا۔ نہ خیال اپنے شہر و دیار کا، نہ خوفِ نیرنگیِ فلک، نہ بیم و ہراس گردشِ روزگار کا، نہ ماں باپ سے مطلب۔ یار آشنا بھولے سب۔ نہ کچھ دھیان

اُس جگر فِگار، کُشتۂ اِنتظار ملکہ مہر نگار کا۔

شَرح جگر خَراشیِ مَصائب دیدۂ روزگار، یعنی ملکہ مہر نگار کی۔ تڑپ، بے قراری، نالۂ نیم شبی اور اشک باری اُس مصیبت شِعار کی۔ دو ایک جملۂ معتَرِضَہ پُر شکایت، کَشِشِ محبّت کی حکایت۔ نظم:

کدھر ہے تو اے ساقیِ بے خبر! \
نہ کی لطف سے غم زدوں پر نظر

ہوا حال شادی کا سب اِختتام \
مگر غم کا قصّہ ہے وہ ناتمام

تپش سے، تڑپ سے تو کر دے بہم \
کہ لکھتا ہوں پھر داستانِ الم

خوشی سے، مجھے رنج مرغوب ہے \
یہ مؤنس ہے، ہم دم بہت خوب ہے

یہی ساتھ دیتا شب و رُوز ہے \
یہ غم، عاشقوں کا غم اَندوز ہے

نالہ نَوازانِ بزمِ ماتم و تَفتَہ جِگرانِ کُلبۂ غم، حاکیانِ حِکایتِ حُزن و ملال و نَشّارانِ دل خوں، آشُفتَہ حال لکھتے ہیں کہ اُس بے سَرو ساماں، کُشتۂ ہجراں، دور اَز دِل دار و ہَم قَرینِ غم، رُو نادیدۂ شادی، بُورِیا نَشینِ ماتَم، دِل رِیش، سینہ فِگار یعنی ملکہ مہر نگار کا فُرقت میں یہ حال ہوا، اُستاد:

یاں تک کہ اُٹھانے کا وقت اپنے، قریب آیا

اِس پر، مرے بالیں پر تم اُٹھ کے نہ آ بیٹھے ①

میں نام ترا لے لے دن رات جو چلّاؤں

اُو سُنتے ہوئے بہرے! کیوں کر نہ گلا بیٹھے

جو کوئی کہتا: خیر ہے ملکہ! گھُلی جاتی ہو، کیوں اِتنا رنج و غم کھاتی ہو! تو یہ کہتی، مُصحفی:

غم کھاتی ہوں لیکن مری نیّت نہیں بھرتی ②

کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

مُؤَلِّف:

نہ پوچھو کچھ مری حالت کہ اِس دِل کے لگانے سے

پریشاں، سینہ سُوزاں، مُنفَعِل، سَر دَر گریباں ہوں

ایسی باتیں درد آمیز، وحشت انگیز کرتی کہ سُننے والوں کی چھاتی پھٹتی۔ وہ کہتیں: نظر بہ خدا رکھو۔ حَسَن:

اُسے فضل کرتے، نہیں لگتی بار ③

نہ ہو اُس سے مایوس، اُمّید وار

سُوزَ: پھر بہار آتی ہے تجھ میں، اے گلستاں! غم نہ کھا ④

وہ چلی آتی ہے فوجِ عَندَلیباں، غم نہ کھا

گو کہ شب آخر ہوئی، اے شمع! تو زاری نہ کر

پھر وہی محفل، وہی تیرا شَبِستاں، غم نہ کھا

وہ سُن کر یہ کہتی کہ میں چراغِ سَحَری ہوں؛ یقین ہے کہ تا صُبح بزمِ جہاں سے، جل کے، سَفَری ہوں۔ خُسرو:

پس ازانکہ من نمانم، بچہ کار خواہی آمد①

مُؤَلِّف: ہماری جان کے جانے میں جب عرصہ رہا تھوڑا
تب اُس کے دل میں آیا دھیان میرے پاس آنے کا

آج تک اُس غفلت شِعار، فَرامُوش کار کی کچھ خبر نہ آئی؛ ہم نے غَمِ جُدائی میں مفت جان گنوائی۔ مُؤَلِّف:

تَپِ جُدائی سے اِس طَرح اب نزار ہوں میں
اجل کے مُنہ سے بھی، غالب ہے، شَرمسار ہوں میں
کیا ہے رنجِ جُدائی نے ایسا کاہیدَہ
نظر میں خلق کی، رشکِ خطِ غُبار ہوں میں
جو تو وہ گُل ہے کہ عالَم کے دل میں ہے تری جا
تو سب کی آنکھ میں کھٹکا کیا، وہ خار ہوں میں
قرار می بَرد از خلق آہ و زاریِ ما
سُرورؔ! رنج میں کس کے یہ بے قرار ہوں میں

یہ معمول تھا: جب چار گھڑی دن رہتا، سوار ہوکر؛ اُن درختوں میں، جہاں جانِ عالَم سے ملاقات ہوئی تھی، جاتی اور جو جو شریکِ راحت و رنج تھیں، اُن سے مخاطب ہو یہ کہتی، اہلی شیرازی:

خوش آنکہ تو باز آیی و من پای تو بوسم — در سجدہ فُتَم، خاکِ قدمہای تو بوسم [1]
ہر جا کہ تو روزے نَفَسے جای گرفتی — آنجا روم و گریہ کُناں جای تو بوسم
روی تو تصوّر کنم و لالہ و گل را — در حسرتِ رخسارِ دل آرای تو بوسم
ہر جا کہ غزالیست، چو مجنوں سر و چشمش — در آرزوی نرگسِ شہلای تو بوسم
من اہلِ درویش، تو آں شاہِ بُتانی — دستیکہ ببوسم، بہ تمنّای تو بوسم

اور کبھی صبح سے پھرتے پھرتے، قریبِ شام باد لِ ناکام اُسی جنگل میں پھر آتی، یہ غزل زبان پر لاتی، جُرأت :

بہ شکلِ مہر ہے گردش ہی ہم کو سارے دن
جو تم پھر آؤ تو پیارے، پھریں ہمارے دن [2]

نہیں ہے تیرے مریضانِ ہجر کا چارہ
اب اپنی زیست کے بھرتے ہیں یہ بیچارے دن

یہ وصل کیونکے مُبدّل ہوں ہجر کے ایّام
مگر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دن

رہے تھا جب کہ ہم آغوش مجھ سے وہ پیارا
عجب مزے کی تھیں راتیں، عجب تھے پیارے دن

کب اُس سے ہوگی ملاقات، میں یہ پوچھوں ہوں
ذرا تو دیکھ نجومی! مرے ستارے، دن

لگایا روگ جوانی میں کیوں میاں جُرأت
ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمھارے دن

رات کو بہ حالِ بے قرار وہ سُوگوار ناچار گھر آتی ۔ تمام شب کراہ کراہ، سب کو جگاتی اور یہ سُناتی، اُستاد :

حرام نیند کی، اِقرارِ وصلِ جاناں نے①
الٰہی! کوئی کسی کا اُمیدوار نہ ہو

وہ رات جسے شبِ فُرقت کہتے ہیں، بے چینی سے پہاڑ ہو جاتی؛ تو وہ غم کی ماری سخت گھبراتی، یہ لب پر لاتی، اُستاد :

جیسا شبِ عشرت کو فلک! تونے گھٹایا②
کی جلد نہ فرقت کی، ستم گر، سحر ایسی!

ہے ہے! آج نہ صدائے مُرغِ سَحَر آئی، نہ مُوذِّن نے نِدائے اَللّٰہُ اَکْبَر سُنائی ۔ نہ خوابِ غفلت سے پاسبان کم بخت چونکا اور نیند کی جھونک میں، گھڑیالی بھی گَجَر کا بجانا بھول گیا ۔ جُرأت :

تھے شبِ وصل یہ سب جان کے کھانے والے③
آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے!

شب کو نالہ تھا، دن کو زاری تھی؛ دن رات اُس پر سخت بھاری تھے ۔ لوگ کہتے تھے : ملکہ! اللہ کو یاد کرو، کبھی تو دل کو شاد کرو ۔ شافیِ مُطلق تمہارے مَرَضِ مُفارَقَت کو بہ صِحّتِ وَصْل بَدَل کرے؛ اب رُوزِ وِصال، عِنایتِ ذُوالجلال سے قریب ہے؛ تو اُس وقت بہ حسرت یہ کہتی، اُستاد :

شبِ وِصال جو قسمت میں ہے، تو ہووے گی ①
دُعا کرو، شبِ فرقت تو یہ سحر ہووے

نظم :

مریضِ ہجر کو صحّت سے اب تو کام نہیں — اگرچہ صبح کو یہ بچ گیا تو شام نہیں ②
رکھو و یا نہ رکھو مرہم اِس پہ، ہم سمجھے — ہمارے زخمِ جُدائی کو اِلتیام نہیں
کیا جو وعدۂ شب اُس نے، دن پہاڑ ہوا — یہ دیکھیو مری شامت کہ ہوتی شام نہیں
وہی اُٹھائے مجھے، جس نے مجھ کو قتل کیا — کہ بہتر اِس سے مرے خون کا انتقام نہیں
اُٹھایا داغِ گُل، افسوس، تم نے دل پہ سُرور — میں تم سے کہتا تھا، گلشن کو کچھ قیام نہیں

اُستاد :

آخر شبِ وصال کی جا، پیش کی وہی ③
ہر دن تھا اے فلک مجھے جس رات کا خیال

مُعاملاتِ عشق دیکھیے : وہاں شہ زادے کو غم سے فَراغ، کیفیتِ باغ، گُل عِذار بغل میں، راحت و آرام؛ یہاں ملکہ آتشِ فراق سے بادِلِ پُر داغ، آشفتہ دماغ، خارِ غم جگر میں، گرِفتارِ رنج و آلام۔ لیکن دردِ دلِ بے قرار، نالۂ جگر اَفگار رایگاں نہیں جاتا۔ جب تڑپ بلبل کے دل میں زیادہ ہوتی ہے، مَوسِمِ گُل آتا ہے۔ اِسی طَرح سوزِ دلِ عاشق جو حد سے فُزُوں ہو، معشوق رَحم کھاتا ہے۔ بھولا ہو، یاد آئے۔ وَگر ہجر میں پھڑک کر مرجائے، مطلوب کو نَعش پر لائے، اُس کی بھی جان گنواتا ہے۔ حضرتِ عشق دشمنِ جانِ عاشق و معشوق ہیں، اِن کا حال کیا کہیں؛

چُناں چہ یہ نَقل، ضَربُ المَثَل ہے اور حقیقت میں اَصل ہے۔ چشمِ عبرت بیں اور گوشِ شَنوا اِس کے دیکھنے اور سُننے کو درکار ہے، نیرنگیِ عشق کا اظہار ہے۔

نَقل سوداگر کی بیٹی کی۔ انگریز کا آنا، فَریفتہ ہوجانا؛ آخر کو جان دینا دونوں کا۔

کلکتے میں ایک سوداگر تھا عالی شان۔ مَتاعِ ہر دِیار، تُحفۂ جَوار جَوار دُکان میں فَراواں۔ اُس کی بیٹی تھی حسین، مِہر طَلعَت، ماہ جَبیں، سیمیں تَن، کافِرِ فَرنگ، غارت گرِ لندن۔ غَرَض کہ اَور تو اَسباب سب طَرح کا دُکان میں تھا؛ مگر گھر میں وہ زُودر رَقَم، طُرفہ تُوم تھی۔ فَرنگ سے ہِند تک اُس کے حُسن کا چرچا تھا۔ رُوم سے شام تک اور بَنبئی سے سُورَت تک اُس کی صورت کی دھوم تھی۔ اُستاد:

ہے رَخنَہ سازِ ایماں وہ زادۂ فَرَنگی (۱)
اِسلام اب کہاں ہے؛ عاصی، فَرامشَن ہے

ہزاروں انگریز، بَریز بَریز کرتے، اُس پر شیفتہ و بے تاب تھے۔ لاکھوں مسلمان سَرگَرداں، خَستہ و خراب تھے۔ جب ہَوا کھانے کو سوار ہو کر آتی تھی؛ راہ میں دو رویہ خَلقت کی جان، اُس کی ہَوا خواہی میں برباد جاتی تھی۔ گَبر و تَرسا اُس کا کلمہ پڑھتے تھے، یَہُود و نَصاریٰ اُس کا دَم بھرتے تھے، مسلمان دل و جاں نَذر کرتے تھے۔ مُؤلِّف:

اُس لُعبَتِ فَرَنگ کو دِکھلا کے قاشِ دل
کہتا ہوں: چکّھو، یہ دلِ بِریاں کا توس ہے

اِتّفاقِ زمانہ، کوئی انگریز لندَن سے تازہ وارِد ہوا جلیلُ القَدر، ذی شان، خوب صورت، نوجوان؛ شُورِ عشقِ سَوداخیز سر میں، سُوز دل میں؛ مزاج بے شَر، بے قراری آب وگِل میں۔ مِیر:

تھا طَرح دار آپ بھی، لیکن ①
رہ نہ سکتا تھا اچھّی صورت بِن

قَضارا، وہ آفت کا مارا کچھ اسباب لینے اُس کی کُوٹھی میں آیا اور اُس غارت گرِ دین و ایمانِ ہر گَبر و مسلماں سے دوچار ہوا۔ عشق گلے کا ہار ہوا۔ دیکھتے ہی مَتاعِ عقل، اَثاثِ ہُوش و حواس گرہ سے کھُو بیٹھا۔ دل سے ہاتھ دُھو، دَمِ نقدِ جان کو رُو بیٹھا۔ اَسباب خریدنے گیا تھا، سَودا مُول لیا۔ اُس نے مُشتَری سمجھ، میزانِ محبّت میں تُول لیا۔ ہاتھ پاؤں نے سَت، دل نے ہمّت ہاری؛ دِن دِیے لُٹ گیا عشق کا بَیپاری۔ جب اور کچھ تدبیر بن نہ آئی، خرید و فروخت کے حیلے میں آمد و رَفت بڑھائی۔ پھر تو یہ حال ہوا، جُراَت:

دِن میں سَو سَو بار اب ہم اُن کے گھر جانے لگے ②
مُنہ چھپانے وہ لگے، ہم اُن پہ مرجانے لگے

سَلَف سے آج تک عشق چھپا نہیں، مشہور ہے۔ اِس مُقدّمے میں انسان مجبور ہے۔ مِیر:

① عشقِ بے پردہ جب فسانہ ہوا مُضطرِب کدخُدائے خانہ ہوا

جب یہ اَمرِ مُفَصَّل سوداگر کے گوش زد ہوا، بہ پاسِ نام ونشاں خَوف ذِلّت ورُسوائی کا از حد ہوا۔ پہلے دونوں کو نصیحت کی، پَند کیا؛ پھر سلسلۂ آمد ورفت قطع، دیکھا بھالی کا رَخنہ بند کیا۔ اُدھر شُعلۂ عشق نے بھڑک کر تاب وتوان وشکیب وتحمّل کو ہیزمِ خُشک کی طرح جلادیا، عقل کا چراغ بُجھادیا، صبر کا قافلہ لُٹ گیا، دامنِ ضبط ناتواں کے ہاتھ سے چُھٹ گیا، بے چارے صاحب کو چند عرصے میں سلامت نہ رکھا۔ میر:

② بِسترِ خاک پر گرا یہ زار درد کا گھر ہوا دلِ بیمار
خاطر اَفگار، خار خار ہوئی جاں، تمنّا کشِ نگار ہوئی
دل نہ سمجھا اور اِضطِراب کیا شوق نے کام کو خراب کیا
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے لگے اُڑنے جگر کے پرکالے

یہاں تک تَپِ مُہاجَرت اور دردِ مُفارَقت سے حال دَرہَم وبَرہَم ہوا کہ صاحب بہادُر شِکَستِ فاش اُٹھا کے صاحبِ فِراش ہوا، دل وجگر سینے میں پاش پاش ہوا۔ حِس وحرکت کی طاقت نہ رہی، لینے کے دینے پڑگئے۔ اُستاد:

③ مَرَض یہ پھیل پڑا ہے تَپِ جُدائی سے
کہ بیٹھ لگ گئی یاروں کی چارپائی سے

جوجو اُس کے یار، مؤنس وغم گُسار تھے، نصیحت وپند، قید وبند کرنے لگے۔ عورتوں کی بے وفائی، بُتوں کی سنگ دلی، معشوقوں کی

کج ادائی بہت مُشرَّح سمجھائی؛ سود مند نہ ہوئی، خاطر میں نہ آئی۔ اُن سب میں ایک اُس دشمنِ جاں کا شفیق و غم خوار، وفا شعار تھا؛ کہنے لگا: کیوں جویاے مَرگ ہوا ہے! ظالم، یہ کیا کرتا ہے! اے ناداں، عدوے دل، بدخواہِ جاں! اِس کا انجام ذِلّت ہے۔ حاصل اِس کا خِفَّت ہے۔ یہ خیالِ مُحال اپنے دل سے نکال۔ زَورقِ زِندگانی، سَفینۂ نوجوانی دیدہ و دانستہ وَرطۂ ہلاکت میں نہ ڈال۔ اپنے کَس و کُو پر نظر کر۔ لِلّٰہ دلِ خود رَفتہ کو سنْبھال۔ تو نے پِسَرِ مُجَسْتَن کی حکایت نہیں سُنی کہ اُس پر کیا گُزری! یہ سُن کے، وہ حَزیں بادِلِ غمگیں پوچھنے لگا: کیونکر ہے؟

حالِ خُسراں مآلِ مُجَسْتَن کے بیٹے کا۔ سفر کو جانا، راہ میں جہازوں کا غرق ہو جانا۔ پھر تختے کے سہارے سے پہنچنا کنارے پر، فَریفتہ ہونا ایک ماہ پارے پر۔ لڑکوں کا پیدا ہونا۔ پھر تفرِقہ، اور خِفَّت کا مُبتَلا ہونا۔

وہ بولا: اِسی شہر میں ایک شخص تھا مُجَسْتَن نام۔ نہایت اہلِ دَوَل، مُرفَّہ حال۔ صاحبِ علم وفضل، جامعِ ہر کمال۔ طبیب و ادیبِ بے بَدَل۔ سَخُن سَنج، لطیفہ گو بَرمَحَل۔ کمالات میں یگانۂ رُوزگار۔ تجارت میں نامُورِ ہر دِیار۔ سو سو جہاز ایک ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ نصیب ایسا جاگتا تھا مٹّی کو چھوتا، سُونا ہاتھ آتا تھا۔ کسی طَرح کا خواہش مند، بجز فرزندِ اَرجمند

نہ تھا۔ دُعا، دوا، خیرات تک بند نہ تھا۔ شب و رُوز اِس کا خیال تھا۔ مُدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ ہزاروں رنج لاوَلَدی کے سہتا تھا؛ مگر صابر ایسا تھا کہ خدا کے سوا کسی بندے سے کچھ نہ کہتا تھا۔

خوش قسمتوں کی دُعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنّاے دل حصول ہوتی ہے: پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا حَسبِ دِل خواہ، صورت میں غیرتِ ماہ۔ بہت شاداں ہو کے سرگرمِ پرورِش ہوا۔ ایک عالم اُس کی صورت دیکھ کے خوش ہوا۔ جب بارہ برس کا سن ہوا، نشیب و فرازِ دیکھنے کا دن ہوا؛ بہ سببِ طبعِ رسا و تعلیم اُستادانِ یاد کا جمیع عُلوم، سب فُنون میں یکتاے زمانہ مشہور ہوا۔ ماں کو خوشی، باپ کو سُرور ہوا۔ درس دینے لگا، مطَب کرنے لگا؛ اوروں کو تعلیم سب کرنے لگا۔ چودھویں برس باپ سے سفر کی اِجازت چاہی، کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے، والِدَین کو حاصلِ مشقّت دکھائے۔ مجسّتن نے کہا: اپنا بھی یہی قصد تھا؛ مگر چندِے توقُّف کرو، ابھی ناتجربہ کار ہو۔ اُس نے عرض کی: حضور عُمرِ طبعی کو پہنچے، مُسِن ہیں؛ فدوی کے سیاحت اور سفر کے یہی دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بہ قیدِ حیات سفر کو جاؤں؛ گرم و سردِ زمانہ دیکھوں، جودتِ طبع سب کو دِکھاؤں۔

آخر مجسّتن نے دس بارہ جہاز پُر متاع و مال، اور کچھ رفیقِ قدیم کارگزار، دیانت دار، امانت شعار ہمراہ کر رُخصت کیا۔ نشیب و فرازِ دوراں، نیرنگیِ جہاں سے آگاہ کر دیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے۔ دو مہینے کے بعد ہَواے جورِ گردِش سے سرنگوں ہو کے تباہ ہو گئے۔ مجسّتن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوب گیا۔ یارانِ ہمراہی عالمِ بقا کو راہی ہوئے، کچھ طُعمۂ نہنگ و ماہی ہوئے۔ یہ ایک تختے پر ڈوبتا ترتا بہ چلا۔ حیاتِ مُستعار باقی تھی؛ ساتویں دن ہِرتا پھِرتا تختہ کنارے پر لگا۔ غش سے جو اِفاقہ ہوا؛ آنکھیں کھولیں، سر اُٹھایا، تختے کو

گھاٹ پر پایا۔ بہ ہر کیف اُترا۔ کچھ گھاس لا، رسّی بنا، وہ تختۂ کشتیِ شکستہ پتھر سے اٹکا دیا۔ پھر آپ بہ تلاشِ آب و دانہ روانہ ہوا۔ تھوڑی مسافت بہ صد آفت طے کی۔ شہرِ عظیم الشّان، بہت آبادان نمود ہوا۔ آہستہ آہستہ، بیٹھتا اُٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجیب سانحہ، طُرفہ ماجرا نظر آیا، دُکان ہر ایک وا، اَشرفی روپے کا ڈھیر جا بہ جا، اسباب سب طرح کا نایاب موجود؛ مگر آدمی کا پتا مفقود۔ اِس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنسِ بشر سے خالی ہے۔ ویرانِ مطلق ہے، شہر کا وارث ہے نہ والی ہے۔ پھرتا پھرتا قلعے میں آیا۔ باغ سرسبز، پُرمیوہ؛ بیچ میں بنگلا، زربفت کے نفیس پردے پڑے ہوئے، در و دیوار میں جواہرِ بیش بہا قرینے سے جڑے ہوئے۔ پردہ اُٹھا بنگلے میں گیا۔ پلنگ جواہر نگار گسترده، اُس پر بہ شکلِ مُردہ ایک شخص دوپٹا تانے، نہ کوئی پائینتی نہ سرہانے، پڑا ہے۔ اِس نے دوپٹا جو سرکایا، وہ عورت تھی۔ نیند سے چونک پڑی، سر اُٹھایا، مُتعجب ہو کے اِس کی صورت دیکھی، مُتاسّف ہو کے یہ سُنایا کہ اے عزیز! اپنی جوانی پر رحم کر۔ یہ مکان نہیں، سیلِ فنا ہے؛ تو ناآشنا ہے۔ اِس سے درگزر، وگرنہ آفت کا مُبتلا ہوگا، خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا! اِس نے کہا: ایسا ماجرا کیا ہے، بیان تو کر۔ عورت نے کہا: پہلے تو اپنے یہاں آنے کا حال سُنا کہ کیوں کر آ پھنسا۔ اِس نے کہا: ہفتہ گزرا بے دانہ و آب، خستہ و خراب ہوں؛ جو کچھ کھاؤں، تو داستان پریشانی کی سُناؤں۔ عورت بولی: مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے مُنہ سے سُنا ہے؛ سو کھانا یہاں کہاں، بجز غم کھانے کے اور پانی، سوا اَشک بہانے کے۔ آنسو پینے کا نام ہے، اِس سے نہیں پیتی ہوں اور کھانے کی قسم سے قسم تک نہیں کھاتی۔ متحیّر ہوں کیوں کر جیتی ہوں! مگر تنہائی میں ہاں، خوف کھا کے، روز دِن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شبِ اوّلینِ گور ہے، جاں کنی رہتی ہے؛ سخت جانی کی

بدولت نہیں مرتی ہوں۔ جرأت :

(1)
یہ غلط کہتے ہیں، بے آب و خورِش جیتے ہیں لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں

تو اِس باغ میں جا، جس میوے پر رغبتِ خاطر ہو، کھا۔ مجسٹن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا، نہر سے پانی پیا۔ گو نہ رنجِ فاقہ کشی سے اِفاقہ ہوا۔ پھر عورت کے پاس بنگلے میں آ کے حَسَب و نَسَب اپنا اور باعثِ سفر، جہاز کی تباہی کی مُفصَّل سَرگُذَشت سُنائی۔ پھر اُس کا ماجرا پوچھا۔ وہ بولی: اے شخص! اِس شہرِ بے چراغ کی مَیں شہزادی ہوں۔ باپ میرا اِس ملک کا حاکم تھا۔ چھوٹا بڑا یہاں کا شاد و خُرّم تھا۔ باپ جو تاج دار تھا، مجھ کو مشغلۂ سیر و شکار تھا۔ ایک روز لبِ دریا مصروفِ تماشا بیٹھی تھی، دَفعتہً ایک سانپ پانی سے نکل کے میری طرف بڑھا۔ میں نے اُس کو تیر مارا۔ معلوم نہیں لگا، یا خطا کر گیا۔ پھر جو دیکھا تو اژدہائے مُہیب بہ شکلِ عجیب جھپٹا آتا ہے۔ مَیں تو ڈر، گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی۔ جو جو ہمراہِ رکاب تھے، طُعمۂ دَہَنِ مارِ خوں خوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں؛ ساکِنانِ شہر مَعِ بادشاہ، انسان سے تا حیوان، کوئی نہ بچا، سب ہلاک ہوئے، تہِ خاک ہوئے؛ فَقط مَیں سخت جان باقی ہوں۔ اور یہ صُحبت ہے کہ قریبِ شام وہ مارِ خوں آشام آکر اِس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے؛ دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے؛ اِسی باغ سے میوہ کھا، پانی پیتی ہوں؛ اِس خرابی سے جیتی ہوں۔ کوئی غم خوار بجز ذاتِ پروردگار نہ تھا، جس کو حالِ زار سُناتی۔ اِتنے دنوں میں آج تجھے دیکھا؛ خوفِ خُدا آیا، مُطّلع کر دیا۔

پسرِ مجنتّن نے کہا: خاطرِ پریشاں جمع رکھ؛ اگر فضلِ الٰہی مددگار ہے، تو جلد اُس کو فی النّار کر، تجھ کو اِس آفت سے نجات دیتا ہوں۔ یہ کہہ کے، جس جگہ سانپ کے بیٹھنے کی جگہ عورت نے بتائی تھی، وہاں گڑھا کھودا اور قلعے سے باروت لاکر، دور تک نقب سی بنا، باروت اُس میں چھڑک دی۔ پھر گھانس ہری اُس پر جمائی۔ شہ زادی نے کہا: اب وہ آتا ہی ہوگا۔ یہ جا کے سرِ نقب پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا؛ کہ دَفعَۃً وہ اَفعیِ پُر زَہر، خُدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اُس سبز قدم نے فرشِ زمرّدیں پایا؛ بہت خوش ہو کر بیٹھا۔ یہ تو تاک میں تھا؛ پتھر سے آگ نکال، اُس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا، وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہنچا۔ دونوں نے شُکر کا سجدہ بہ درگاہِ دافعُ البلیّات کیا۔ باہم بے اندیشہ و غم رہنے لگے۔ سات برس دونوں ساتھ رہے۔ اِس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے۔ ایک دن رنجِ تنہائی کی شہ زادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔ سعدی:

بہارِ عُمر، ملاقاتِ دوستدارانست[1]
چہ حظ برد خضر از عمرِ جاوِداں تنہا

کب تک تنہائی میں بسر کریں، شامِ غم انجام رو رو کے سحر کریں۔ کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ ویران شہر آباد ہو، خاطرِ غمگیں شاد ہو۔ وہ بولا: اگر وطن جاؤں اور مجنتّن کو یہاں لاؤں، تو یہ بستی بسے۔ عورت نے کہا: اکیلی مَیں کیوں کر بسر کروں گی، مَیں بھی ساتھ چلوں گی۔ آخرش، ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کے چل نکلے۔

قضارا، وہاں پہنچے جہاں تختہ بندھا تھا؛ ذہن میں آیا: پیادہ پا لڑکوں کا لے چلنا مُحال ہے، یہ بے جا خیال ہے۔ توکَّلتُ علی اللہِ کہ کے اِسی تختے پر سوار ہو، رسّی کھول دو، کہیں تو جا نکلو گے۔ یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے۔ وہ تختہ کھولنے لگا، شہ زادی نے کہا: مال و اسباب تو اِس قدر ہے کہ بیان میں زَبان قاصر ہے؛ مگر ایک ناریل اِکسیر سے بھرا ہے، دَولتِ لااِنتہا ہے، رَتّی باون تولے کا تجرِبہ ہو چکا ہے۔ بہت تَرَدُّد سے ظلِّ سُبحانی نے پایا تھا، سب سے چھپایا تھا؛ جو تو اجازت دے تو اُسے لے آؤں۔ مصرع: بدوزد طَمَع دیدۂ ہوشمند①

مجسّٹن کے بیٹے نے کہا: اچھّا۔ وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یوں ہی رہا۔ شہ زادی لڑکا لیے اُتری۔ اِس کے اُترتے ہی ایسی تُند ہوا چلی کہ رسّی، تکان سے ٹوٹ گئی؛ تختہ بہ چلا۔ ہر چند اِس نے ہاتھ پاؤں مارے، وہ ساحلِ مطلب سے کنارے ہوا۔ کنارے پر شہ زادی بہ حالِ خراب، دریا میں وہ بادِلِ کباب بہ نکلا۔ دِل سے کہتا تھا: دیکھیے، مرضیِ ناخُدائے کشتیِ بادبان شکستہ کیا ہے! یہ جھونکا ہوائے قومِ ثمود، عاد کا ہے۔ اِس سوچ میں چلا جاتا تھا کہ ایک جہاز نمود ہوا۔ اہلِ جہاز نے جو دیکھا: تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لیے بہا جاتا ہے؛ رحم کھا، پنسوہی کو دوڑا جہاز پر لیا۔ اِتّفاقِ زمانہ، مالکِ جہاز مجسّٹن کا دوست و دم ساز تھا؛ اُس کو پہچانا، بہت تعظیم تکریم سے پیش آیا۔

برس روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا۔ جہاز کا حاکم مجسّٹن کی ملاقات کو آیا، بچھڑے بیٹے کو باپ سے مِلایا۔ یہاں جس دن

سے جہاز کی تباہی مجسٹن نے سن پائی تھی، مُحیطِ رنج والم، غریقِ لُجّۂ غم تھا۔ بارے، بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بہ درگاہِ باری کیا، پُوتا گھاتے میں مِلا، اور کلماتِ شُکریہ اُس سے کرنے لگا۔ اُس نے کہا: بندہ پَروَر! خیر ہے، دُنیا اِسی کا نام ہے۔ جس کا کام جس سے نکلے، وہ فخر و سعادت سمجھے۔

بعدِ چند روز مجسٹن نے بیٹے سے رُوداد سفر پوچھی۔ اُس نے اِبتدا سے اِنتہا تک حکایت، فلکِ کج رفتار کی شکایت بیان کی۔ وہ یہ سُن کر سمجھا: مشکل پیچ پڑا، مگر سہل انگاری سے یہ جواب دیا کہ اَلْخَیْرُ فِی مَا وَقَعَ خیریت اِسی میں تھی جو ہُوا۔ مصرع: برسرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید، بگذرد۔①

مگر یہ مقدمہ اور بیان "سرود بمستاں" ہُوا، بیٹے نے کہا: مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلیے۔ ایسا مُلکِ مالا مال، یہ دَولتِ لازَوال ہاتھ سے نہ دیجیے، نصیبِ دُشمناں نہ کیجیے۔ مجسٹن نے کہا: خَیر ہے بابا جان! کیسا آنا، کیسا جانا! یہ بھی ایک فسانہ تھا جو تم نے کہا، ہم نے سُنا؛ اور وہ بھی خوابِ پریشاں تھا جو تو نے دیکھا۔ اِس کو یاد رکھ، لا اَعلَمُ:

ایّامِ وِصال و صُحبتِ سیم تناں
در عالمِ خواب اِحتِلامے شد و رفت

بیٹے نے جواب دیا: آپ سا عقل مند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے۔ دُنیا میں تین مَغز کے ہیں: زَر، زمین، زَن؛ یہ سامان جمع ہیں؛ اگر آپ نہ جائیں گے، فِدوی تنہا جائے گا، پھر نہ آئے گا۔ مجسٹن نے کہا: افسوس! ہم تجھے دانا جانتے تھے؛ اِلّا، ہماری نادانی تھی۔ حُمق کی مُقتضی

تمھاری نوجوانی تھی۔ اے بھائی! کوئی نادان سے نادان عورت کی بات کا دھیان نہیں کرتا۔ یہ باتیں جب تک تھیں، جو تم اور وہ باہم تھے۔ وہ مؤنِس تھی، تم ہم دَم تھے۔ اب خیریت ہے۔ سعدیؔ:

زن دوست بود، وَلے زمانے　　تا جُز تو نیافت مہربانے
چوں در برِ دیگرے نشیند　　خواہد کہ ترا دگر نہ بیند

مصرع: 　اسپ و زن و شمشیرِ وفادار کہ دید

ہر چند اُس نے سر پھرایا، مَغز خالی کیا، یہ مُقَدَّمہ اُس پر حالی کیا؛ وہ بے مَغز نہ سمجھا۔ مُصحفیؔ:

مُصحفیؔ! سوُد نصیحت کا نہیں عاشق کو
میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

ناچار مجسّٹن نے کہا: تم جب تک ذِلّت نہ اُٹھاؤ گے اور ہمیں خراب نہ کرو گے؛ اِس حرکتِ بے جا سے باز نہ آؤ گے، نہ چین لو گے۔ اُسی دن مجسّٹن سامانِ سفر درست کر، ساٹھ جہاز مَعَ اسباب اور چند مُشیرِ خوش تدبیر ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ عقل کے دشمن بیٹے کو ساتھ لیا۔ چند روز میں، ہوا جو مُوافق تھی، وہ جزیرہ ملا۔ جہازوں کو لنگر ہوا۔ مجسّٹن کا بیٹا اُترا۔ مگر جہاں ویرانہ، بُوم و غُول کا آشیانہ تھا، وہاں بستی دیکھی۔ اور جس جگہ پہاڑ تھا، اُسے ہموار پایا، بلندی نظر آئی نہ پستی دیکھی۔ دشت مُصفّیٰ، آدمی ہر سمت سرگرمِ کاروبار، شہر پناہ تیّار۔ اِسے تعجّب ہوا، سمجھا کہ مَیں بھول گیا۔ کسی سے پوچھا: اِس شہر کا نام کیا ہے؟ والیِ مُلک کون سا ہے؟ وہ بولا: مدّت سے یہ مُلک

بہ سبب آفتِ آسمانی اُجاڑ ہوگیا تھا۔ رعایا برایا، بلکہ بادشاہ بھی نہ بچا تھا، فقط بادشاہ کی بیٹی باقی تھی۔ اب برس دن سے اُس نے شوہر کیا ہے شہر از سرِ نو آباد ہوا، نیا طرز ایجاد ہوا۔ زمین یہاں کی زرریز، چشمے سرد و شیریں، ہوا فرحت انگیز، ٹھنڈی ہے۔ عورت نے بسایا ہے، اِس باعث سے نام اِس کا شہزادی منڈی ہے۔

مجستن نے یہ ماجرا سُن کر بیٹے سے کہا: خوش تو بہت ہوئے ہو گے! تُو سیدھے پھر چلو، یہاں نہ ٹھہرو۔ اُس نے کہا: اِتنی سفر کی صعوبت اُٹھائی، اُس کی صورت بھی نظر نہ آئی۔ دو باتیں کرلوں تو پھر چلوں۔ مجستن نے کہا: یہ مصیبت کچھ نہ تھی، جو بات کرنے میں ایذا اُٹھے گی۔ وہ کسی کی کب مانتا تھا، عورت کو اپنے اوپر فریفتہ جانتا تھا؛ اُنھیں لوگوں سے پھر پوچھا: شہ زادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے؟ کسی سے دوچار بھی ہوتی ہے؟ وہ بولے: روز ہر گلی کوچے میں آتی ہے، دیکھ بھال کے چلی جاتی ہے۔ غرض کہ سواری کا وقت دریافت کر، لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے سرِ راہ جا کھڑا ہوا؛ کہ شہ زادی شبدیز کو مہمیز کرتی آپہنچی۔ یہ پکارا: ہم نے ایفائے وعدہ کیا، حاضر ہوئے، آئے، اور لڑکا بھی فضلِ الٰہی سے سلامت موجود ہے، ساتھ لائے؛ کیا اِرشاد ہوتا ہے؟ اُس نے بے گانہ وار، جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے، گھورا؛ مگر جواب کچھ نہ دیا، چلی گئی۔ یہ خفیف گھر پھرا۔

مجستن نے حال پوچھا، کیا گزری؟ یہ بولا: ملاقات نہ ہوئی، کل پھر جاؤں گا۔ اُس نے کہا: صبح کا جانا؛ روزِ سیاہ، شامِ غم دِکھائے گا؛ بھور ہو جائے گی، بہت پچھتائے گا۔ اُس نے نہ مانا۔ دوسرے روز بیٹے کو سِکھایا کہ جب سواری قریب آئے، گھوڑے سے لپٹ جانا اور یہ زبان پر

لانا کہ دُنیا کا لہو سفید ہو گیا۔ مہرِ مادری سے محبّتِ پدری میں لطف زیادہ پایا کہ ہمیں ساتھ بہ آرامِ تمام لیے پھرتا ہے؛ تم بات بھی نہیں پوچھتی ہو، بلکہ پہچانتی نہیں۔ جس دم سواری قریب آئی؛ یہ تو بہت جلا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ کھیل بگڑ گیا، کہا: شاہ زادی! باگ کو رُوکو، شیروں کا نعرہ سُن لو۔ وہ خود تو رُکی تھی، باگ بھی خود بہ خود رُک گئی۔ پسرِ محتشَم نے اور تو کچھ نہ کہا، یہ مُسدّس شروع کیا، مؤلّف:

یاد اَیام، کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے
ہوتی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے
مکر تھا یاد، خبر تھی نہ بہانے سے تجھے
بے دھڑک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا
ہمیں ہم تھے، تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا

کبھی چوٹی کی خبر تھی نہ تھا کنگھی کا خیال
بارہا اُلجھے ہی رہتے تھے ترے سُلجھے بال
پان کے لاکھے سے اور مِسّی سے ہوتا تھا ملال
مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گزرا نہیں سال
ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم!
دَفعۃً سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم!

تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خُلطا سب سے
گرم جوشی کا بھلا کب تھا یہ لپکا سب سے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے
تجھ کو لگ چلتے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب سے
اب تو ٹٹّی میں کیا چھید، غضب تو نے کیا
کھُل گیا سب یہ ترا بھید، غضب تو نے کیا

شُکر صد شُکر، ہوئی جلد رہائی تجھ سے
اب تو تا حشر مُکدّر ہے صفائی تجھ سے
وَضع اپنی نہیں، کیا کیجے بُرائی تجھ سے
نہ ملیں پر، جو کہے ساری خدائی، تجھ سے

بہ خدا، ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے
اُٹھو بس جاؤ، تمھیں کھول کے دل رو بیٹھے

سوچ اکثر ہے مگر دل یہ ہمارا کرتا	گرچہ حیوان سے تو ربط گوارا کرتا
ایسا بدنام تو وہ بھی نہ بچارا کرتا	بحرِ اُلفت سے نہ اِس طرح کنارا کرتا

مُفت لی پیارے! زمانے کی بُرائی ہم نے
سخت اوقات یہ بیہودہ گنوائی ہم نے

اب قسم کھاتا ہوں تو، دل نہ لگاؤں گا کبھی	ذِلّت و رنج نہ اِس طرح اُٹھاؤں گا کبھی
گر طرح دار بھی اِس دہر میں پاؤں گا کبھی	اُٹھ کھڑا ہوں گا، نہ میں پاس بِٹھاؤں گا کبھی

موسم اب دل کے لگانے ہی کا، جانا، نہ رہا
ربط کیا خاک کریں ہم، وہ زمانا نہ رہا

بر زباں یاروں کے یہ ذکر رہے گا ہر بار	گو کہ عاشق تھا، مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
دیکھ بد وضع، کیا دیکھیے ایسا انکار	سر پٹک مر گئے سب، پر نہ مِلا وہ زنہار

کرے معشوق کسی سے تو دغا ایسی کرے
پیچ کرے بات کی عاشق، تو بھلا ایسی کرے

یہ سُن کر وہ شرمندہ ہوئی۔ پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا۔ یہ بے چارہ نادان، اُن باتوں کا سُود وزِیاں کچھ نہ سمجھا؛ جو کچھ باپ نے سِکھایا تھا، کہنے لگا۔ جب کہہ چکا؛ شہ زادی نے تپنچہ قربُوس سے کھینچ لڑکے پر جھونک دیا۔ دھم سے گر پڑا؛ دایۂ اَجَل نے کنارِ عاطفت میں اُٹھا، اَہلِ قبُور سے مِلا دیا۔ پھر باگ اُٹھا چل نکلی۔ مجتّن کے بیٹے نے بہت خاک اُڑائی،

بیٹے کی لاش باپ کو دکھائی۔ اُس نے کہا: ہماری بات جو سُنتا تو کیوں سر دُھنتا! وہ بدنصیب دشمنِ عقل بولا: صُبح اِختتام ہے، جو ہونا ہے، ہو جائے گا۔ مجسٹن نے کہا: تو اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا۔ دمِ سحر جب وہ چلا، مجسٹن کا جی نہ رہ سکا، ساتھ ہوا۔ جس دم شہ زادی کی سواری پاس آئی، باگ پکڑ لی۔ ہنوز زبان نہ ہِلائی تھی، شہ زادی نے کہا: اے مجسٹن! ہم نے سُنا تھا کہ تو مردِ جہاں دیدہ، سرد و گرمِ رُوزگار چشیدہ، تجربہ رسیدہ ہے، مگر افسوس! یہ اپنی رِیش وفش پیر نابالغ ہے۔ تو نے سُنا نہیں، لا اَعلَم:

①

زحادثاتِ جہاں بس ہمیں پسند آمد ۔۔۔ کہ خوب و زِشت، بد و نیک در گذر دیدم

اِس پیرانہ سالی میں تجھ پر ہزار سانحے گزرے ہوں گے؛ کچھ الم و رنج کا مزہ، یا فرحت و خوشی کا نشہ باقی ہے؟ اے ناداں! دُنیا کے دُوں کے مُعاملے بُوقَلَموں ہیں۔ کس کس بات کو یاد کیجیے۔ کس کا غم، کس بات سے خاطر شاد کیجیے۔ اگر عقلِ رَسا یا کچھ فہم و ذکا ہو، تو دُنیا میں کافی ہے یہ بات: گُذشتہ را صَلوات۔ مُصحفیؔ:

②

اے مُصحفی! مَیں رُوؤں کیا پچھلی صحبتوں کو ۔۔۔ بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ کہہ کر گھوڑا پُچکارا کہ پھر سلسلہ جُنبانی اِس اَمرِ بے معنی کی مُوجبِ مَضرّتِ جاں جاننا۔ مجسٹن نے بیٹے کو سلام کیا، اور نہ کچھ کلام کیا۔ وہ بھی نُطفۂ ضعیف کا پیدا، بوڑھے باپ کا بیٹا؛ محجُوب وطن پھرا، جیتے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی۔

یہ جملہ اُس انگریز نے تمام کر کے کہا: مطلب اِس سَمع خَراشی سے یہ ہے کہ آدمی وہ بات نہ کرے جس کا حُصُول ذِلت و خفّت ہو۔ کہو اب کیا کہتے ہو؟ یہ قصّہ سُن کر، وہ فرہادِ بیستونِ عشق شیریں زبانی سے یہ کہنے لگا: یہ سب میں نے سُنا مگر یہ قولِ اُستاد:

کب تلک جیوں گا میں، موت اک دن آنی ہے   ہجر میں جو آجاوے، عین مہربانی ہے (1)

سب جلسہ سرِ پٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا، کہا: جب یہ جان گنوائے گا، تب جھگڑا جائے گا۔ آخرکار جب اُس کا حال رَدی ہوا؛ دوستوں کو چٹھیاں لکھ کر جمع کیا، کہا: دُنیا مقامِ گُذراں ہے۔ جو ہے، رَواں دَواں ہے۔ کل اِس مَقام سے ہمارا کوچ ہے۔ یہ سَرا سَراسَر پُوچ ہے۔ اگر ہماری وَصِیّت بجالاؤ گے؛ دُنیا میں نام، حَشر کو بہ خَیر انجام ہوگا۔ سب نے اِقرار کیا کہ سَرِ مُو اِس میں کمی بیشی نہ ہوگی، مطلق عاقبت اندیشی نہ ہوگی، جو جی میں ہو شوق سے کہو۔ اُس نے کہا: بعدِ اِنتقال ہمارا جنازہ تکلّف کا بنا کر بجَرے کی چھت پر صندوقِ نَعش دَھر، باجے بجاتے؛ ہمارے معشوق کی کوٹھی جو لَبِ دریا ہے، دارِ فنا ہے، اُس کے نیچے سے لے جانا۔ اور دل میں یہ کہتا تھا، اُستاد:

ساتھ وہ میرے جنازے کے لَحَد تک آئے (2)
اے اَجَل! تیرا قدم مجھ کو مبارک ہووے

قصّہ مُختَصَر، اُسی شب کو تڑپ کر اُس مریضِ فرقت کا ہجر میں وِصال ہوا، سرائے فانی سے انتقال ہوا۔ گویا:

مرنے کو بھی لوگ کہتے ہیں وِصال (3)
یہ اگر سچ ہے تو مر جاتے ہیں ہم

مُؤَلِّف: مر کے۔ حاصل کیا فرقت ہی میں تو نامِ وِصال
جان دی ہم نے، مٹایا ہے خَلِش ہجراں کا

صُبح کو یہ خبر عام ہوئی کہ سوداگر بچّی کے عاشقِ محروم، ناکام کا کام تمام ہوا،

مر گیا۔ شُدَہ شُدَہ سوداگر کو اور اُس ماہ پیکر کو یہ حال معلوم ہوا۔ جذبِ محبّت سے حال تَغیّیر ہوا، مگر ضَبط سے کام لیا، دلِ بے قرار کو تھام لیا۔ انگریز جمع ہو، بہ صد پریشانی وَصِیّت بجا لائے۔ جنازہ درست کر، بجرے کی چھت پر دھر، لباس سب نے سیاہ کیا، نالہ و فریاد کر کے حال تباہ کیا۔ سر ننگے، غُل مچاتے، باجے بجاتے چلے۔ عجب سانحہ تھا کہ ہزارہا زن و مرد کنارے کنارے گریاں چلا آتا تھا۔ صندوقِ نعش کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُسی دن سے آج تک اندوہ میں دریا دریا اشک بحرِ عُمّاں کی چشم سے رواں ہے۔ مثلِ سیماب بے قرارانہ دَواں ہے۔ اور جسے اَحباب حَباب کہتے ہیں، یہ فرطِ قَلَق سے ہر مُحیط کی چھاتی میں پھپھولا پڑتا ہے اور پھوٹتا ہے، مَوجوں سے تلاطُم نہیں چھوٹتا ہے۔ ماہیانِ بحر کا خنجرِ اَلَم سے خنجر یعنی گلا زخم دار ہے، سِنانِ غم سینے کے پار ہے۔ ساکنانِ دریا کو بس کہ شمشیرِ عشق کا خوف و خطر ہے، اِس ڈر سے ہر سنگ پُشت کی پُشت پر سپر ہے۔

جس وقت اِس حالِ خراب سے جنازہ اُس کی کوٹھی تلے آیا اور فرنگیوں نے شور و غُل زیادہ مچایا، اُس زندۂ جاوِید نے بہ آوازِ بلند سنایا، اُستاد:

اے فلک! آخری پھیرا ہے، نہ ہو تجھ سے گر اَور ①
اُس کے کوچے میں جنازہ مرا سنگین تو ہو

اُس وقت وہ ماہ سیما کششِ دل اور تپشِ مُتّصِل سے مُطّلع ہو، دیوانہ وار

بے قرار کوٹھے پر چڑھی اور بے تابانہ پوچھا کہ یہ لاشِ دِل خَراش کس جگر پاش پاش کی ہے کہ حاجبانِ بارگاہِ عشق سے صدا "دُور باش دُور باش" کی ہے۔ وہ سب بولے: عجب ماجرا ہے! یہ کُشتہ تمھارا ہے۔ رنجِ مُفارقت نے آپ کے اِسے بے اَجَل مارا ہے۔ افسوس کہ اِس بے کَس نے جان دی اور تم کو مُطلق خَبر نہ ہوئی! اور کسی شخص نے عَمداً اُسے سُنا کر یہ شعر پڑھا، جُرأت:

مُکر جانے کا قاتل نے نِرالا ڈھب نکالا ہے ①
سبھوں سے پوچھتا ہے: کس نے اِس کو مار ڈالا ہے؟

یہ باتیں سُن کر، سر دُھن کر؛ دَفعَتہً نعرۂ جاں سوز، آہِ دِل دوز سینۂ بریاں سے کھینچ، آتشِ غیرت میں بھُن کر کُود پڑی۔ عشق کا نِشانہ دیکھیے: صَندوقِ نَعش پر گِر، ٹکڑے ٹکڑے مِثلِ جگرِ عاشِقِ زار ہو، خوابِ مَرگ میں سو، بَختِ خُفتۂ عاشق جگایا؛ کَششِ مَحبّت نے اِس طَرح بچھڑوں کو مِلایا۔ دیکھنے والے تھرّا گئے، دل گُدازوں کو غَش آ گئے۔ شہر میں یہ چرچا گھر گھر ہوا، مَنزِلوں یہ اَخبار مُشتَہَر ہوا۔ اُس کے ماں باپ نے بہت سی خاک سر پر اُڑا، دونوں کو پیوندِ زمیں کیا۔ اِس عشقِ فِتنہ اَنگیز نے کیا کیا نہیں کیا! تہِ خاک ہجر کے ماروں کو، بے قراروں کو قرار آیا۔ ہزار ہا شخص دیکھنے کو سَرِ مَزار آیا، مطابِقِ قولِ میر تقی:

حیرتِ کارِ عشق سے، مَردُم ... شکلِ تصویر، آپ میں تھے گُم ②
کام میں اپنے عشق پکّا ہے ... ہاں، یہ نیرنگ ساز یکتا ہے

جس کے ہو اِلتفات اُس کی، نصیب ہے وہ مہمانِ چند روز، غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے
کون محرومِ وصل یہاں سے گیا کہ نہ یار اُس کا اِس جہاں سے گیا
اپنی قدرت جہاں دکھاتا ہے اِس سے جو کچھ کہو سو آتا ہے

پھر یہاں سے خامۂ مُصیبت نِگار حالِ ملکۂ زار لکھتا ہے کہ آخر جی بتنگ ہُوا، تپ دوری سے یہ ڈھنگ ہوا، اُستاد:

① لگے زمین پر اب سب اُتارنے ہم کو یہ دن دِکھائے ترے اِنتظار نے ہم کو
فراق میں ترے، بِن موت اب تو مارا ہے تڑپ تڑپ کے، دلِ بے قرار نے ہم کو
جب اپنا، آہ، دمِ نَزع کنٹھ بیٹھ گیا تم آئے بالیں پر اُس دم پکارنے ہم کو

صُبح سے تا شام ٹکٹکی جانبِ در و دستِ تأسّف بر سر اور دیوانوں کی طرح یہ کلمہ زبان پر، اُستاد:

زبس کہ رہتا ہے آنے کا اُس کے دھیان لگا ②
صدائے در پہ ہے در پردہ اپنا کان لگا
بہ یادِ زُلف، نہ تا دُودِ آہ سب پہ کُھلے
مَیں مُنہ پر اِس لیے رہتا ہوں پیچوان لگا
ہزار خار ہوئے تجھ سے، عندلیب! یہاں
یہ بے ثبات چمن ہے، نہ آشیان لگا

آخر کثرتِ اِنتظار سے نظر کمی کرنے لگی۔ اور جانِ زار، تڑپنے سے دلِ بے قرار کے، بَرہمی کرنے لگی۔ یہ نوبت ہوئی، شعر:

③ گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

اُس وقت کَشِشِ مَحبّتِ ملکۂ مہر نگار نے جانِ عالَم کے دل کو بے چین کیا، خیال آیا کہ خُدا جانے صدمۂ فُرقت سے اُس کا کیا حال ہو گا! دل نے کہا: جینا وَبال ہو گا۔ گھبرا کر دَست پاچہ ہوا، عَیش و نَشاط بھولا؛ یہ تازہ گُل پھولا۔ انجمن آرا سے کہا: زیادہ طاقتِ مُفارَقتِ اَحباب دلِ بے تاب کو، اور گوارا دوریِ وطن مجھ خَستہ تَن کو نہیں؛ آج بادشاہ سے رُخصت خواہ ہوں گا۔ وہ بہ ہر حال اِطاعَت اور رَضا اِس کی جَمیع اُمُور پر مُقدّم جانتی تھی، کہا: مجھے بھی تمنّائے سَیرِ کوہ و بِیاباں، بے بَیاں ہے۔

شہ زادہ مُوافِقِ مَعمُول دربار میں آیا اور سلسلۂ سُخن بہ طَلَبِ رُخصتِ وطن کھول کے، عَزمِ بِالجَزم سُنایا۔ بادشاہ مَحزُون و غَم ناک ہو فرمانے لگا: یہ کیا کہا، جو کلیجا مُنہ کو آنے لگا! جانِ مَن! تابِ جُدائی نہیں، رُخصتِ بادِیہ پیمائی نہیں۔ اگر خواہِشِ سَیر ہے، تو فِضا اِس نَواح کی جا بہ جا مشہور ہے۔ خَزانہ موجود، فوج فرماں بَردار، مُلک حاضِر، میری جان نثار؛ اگر منظور ہے۔ حکمِ سفر، اجازتِ دوری بہت دور ہے۔

جانِ عالَم نے دَست بَستہ عَرض کی: اے شَہر یارِ باوَقار، پُر تَمکیں! بَرَس دِن میں حضور کو مجھ غَمگیں سے یہ مَحبّت ہوئی کہ مال، مُلک، سلطنت، بلکہ جان تک دَرِیغ نہیں؛ وائے بَرحالِ مادَر و پِدَرِ سوختہ جگر! جنھوں نے لاکھ مَنّتوں، کرور مُرادوں سے، دن کو دن نہ رات کو رات جان کر، سولَہ سترہ بَرَس دُنیا کی خاک

چھان کر مجھ کو پالا۔ شومیِ طالع، وَلولۂ طبیعت نے گھر سے نکالا۔ اب مُدّتِ مَدید، عَرصۂ بَعید گزرا؛ اُنھیں میرے جینے مرنے کا حال معلوم نہیں۔ اُن کے صدمے کو غور کیجیے، رُخصت بہ ہر طور کیجیے۔ آدمیّت سے بَعید ہے: آپ عَیش و نَشاط کرے، ماں باپ کو رنج و تَعَب میں چھوڑ دے، سررِشتۂ اِطاعتِ والِدَین توڑ دے۔ اُمّید وار ہوں اِس اَمر میں حُضور کَد نہ کریں، بہ کُشادہ پیشانی اِجازَتِ وَطَن دیں۔ اگر حَیاتِ مُستَعار، زِیستِ ناپائدار باقی ہے؛ پھر شَرَفِ آستاں بُوس حاصِل کروں گا؛ نہیں تو اِس فِکر میں گُھٹ گُھٹ کر مروں گا۔ دین برباد ہو گا، دُنیا میں عزّت و آبرو نہ رہے گی۔ خدا ناخوش ہو گا؛ خَلقَت تَن پَرور، راحت طَلَب کہے گی۔

بادشاہ سمجھا یہ اب نہ رُکے گا، آنسو آنکھوں میں بھر کر کہا: خَیر بابا! مرضیِ خُدا، جو تیری رَضا؛ مگر تیّاریِ سامانِ سفر کو چالیس دن کی مُہلت چاہیے۔ جانِ عالَم نے یہ بات قبول کی۔ یہ تو رُخصت ہو کر گھر آیا، خبرداروں نے اِس حال کا خاص و عام میں چرچا مچایا۔ خُلاصہ یہ کہ شُدہ شُدہ غُلغُلہ گھر گھر ہوا۔ خُرد و کَلاں، بوڑھا اور جوان شہر کا اِس خبر سے باخبر ہوا۔

عزمِ وطن شاہ زادۂ جانِ عالَم کا، حال بادشاہ کے رنج و غم کا۔ تیّاریِ سامانِ سفر بہ صد کرّ و فر۔

بادشاہ کا دور سے نظارہ، ترقیِ اندوہ سے گریبانِ صبر پارہ پارہ۔ اہلِ شہر کی گریہ وزاری، آمدِ سواری۔

نظم:

چل اے توسنِ خامہ چالاک و چست — کہ اب بیٹھے بیٹھے، بہت جی ہے سست
جگہ بیٹھ رہنے کی دُنیا نہیں — یہاں خاک بیٹھے کوئی دِل حزیں
سفر ہر نفس سب کو رہتا ہے یاں — سرائے فنا بھی عجب ہے مکاں
نہ بیٹھا کبھی جم کے اک جا سرور — قریبوں سے اپنے رہا دور دور

طے کُنندگانِ مُلکِ معانی و سیّاحانِ اِقلیمِ خوش بیانی؛ بادیہ پیمایانِ بے توشہ، بارِ محبت برسر؛ راہ نوردانِ ہوش باختہ، بے راہ بر؛ یادِ دِل دار در دِل، دین و دُنیا فراموش؛ اَلَم ہمراہ، ہر گام نالہ و آہ، تصوّرِ یار ہم آغوش لکھتے ہیں کہ اُس عازمِ سمتِ معشوقِ عاشق خصال کو چِلّہ وہیں گزرا، سامانِ سفر تیّار ہوا، اب صُبح کو اُس چِلّہ نشینِ حُجرۂ محبّت کی رُخصت ٹھہری۔ سرِ شام بادِلِ ناکام، بادشاہ دامنِ سحر کی صورت گریبان چاک کر، مَع اَرکانِ سلطنت دو کوس شہر سے باہر سرِ راہ، دامنِ کوہ پر جا بیٹھا۔ وزیرِ خوش تدبیر سے فرمایا: تم شہ زادے کو رُخصت کرو؛ ہم یہاں سے جُلوسِ سواری، سامانِ سفر دیکھ لیں گے۔

یہ خبر اہلِ شہر کو معلوم ہوئی۔ تمام خلقت، پانچ برس کا لڑکا، پچّانوے برس کا بوڑھا، رنڈی، مرد؛ دوسرے ٹیکرے پر جمع ہوا۔ جھٹپٹے وقت جانِ عالم نے سواری طلب کی۔ ہرکاروں نے حضور میں عرض کی۔ بادشاہ راہ کی طرف متوجّہ ہوا۔ روشنی نمود ہوئی۔ پلٹنیں آئیں سجی سجائیں۔ توپ خانہ گزرا۔ پھر بارہ ہزار ہاتھی سواری کا، ہودج و عماری کا۔ ہزار بارہ سے جنگی، گاڑھا، مست؛ ایک سے ایک زبردست، چاروں بھٹّیاں ٹپکتیں، بان، پٹے سونڈوں میں چڑھے، بھسونڈے رنگے، جواہر نگار چوڑی دانتوں پر، طلائی نقرئی زنجیریں کھنکتیں، جھولیں زربفت کی نئی نئی، رسّے کلابتون کے، ہیکلیں جڑاؤ، مُغرّق گجگاہیں پڑیں؛ سری سلمے ستارے کی، پنکھے کا جوبن، ہوا پر دیکھنے والوں کی نگاہیں لڑیں؛ دو رویہ اِس انداز سے کہ اگر اصحابِ فیل انھیں دیکھتا؛ خوف کھاتا، کبھی کعبہ ڈھانے نہ آتا۔

فیل بان زربفت کی قبا یا کمخواب کی پہنے، جوڑے دار پگڑیاں باندھے۔ کمر میں پیش قبض یا کٹار، ہاتھوں میں گجباگ جواہر نگار۔ مستوں کے ساتھ دو بوڑی بردار۔ ایک چرکٹا سنڈا، ہاتھ میں ڈنڈا۔ دو برچھے والے، دیکھے بھالے، آگے۔ پیچھے تریل، قریب سانٹھ مار، برابر دو سوار۔

پھر کئی لاکھ سواروں کے پرے، ہاتھیوں سے پرے پرے۔ سر سے تا پا لوہے کے دریا میں ڈوبے۔ بیس اکیس برس کا

ہر شخص کا سِن ۔ شباب کی راتیں، جوانی کے دن ۔ خُود، بَکتر، زِرہ پہنے، بائیں دہنے ۔ چار آئینۂ فَولادی میں ہر دم رُوئے مَرگ مُعائنہ کرتے، بَل سے قدم دھرتے ۔ ہاتھوں میں داستانے، خانہ جنگوں کے بانے ۔ دو تلواریں: ایک قاشِ زین میں، دوسری ڈاب میں، سیلِ فنا آب میں ۔ تَمَنچے کی جوڑیاں قُبوُر میں ۔ نشۂ بہادری سے سَرور میں ۔ کمر میں قَرولی یا کٹار آب دار، سِپَر پُشت پر، برچھا ہاتھ میں، تیکھا پن ہر بات میں ۔ مِثلِ نِہنگانِ بَحرِ ہَیجا و شِیرانِ کُنامِ وَغا، موچھوں کو تاو دیتے، ہر بار نُوک کی لیتے ۔ گھوڑے وہ خوش خِرام کہ سَمَندِ سبز فام جن کا قدم دیکھ کے آج تک چال بھولا ہے ۔ دیکھنے والے کہتے تھے: چَمَنِ رَواں کیسا پھلا پھُولا ہے ۔ دو صفیں باندھے ہوئے، بیچ میں پنج شاخے رَوشن؛ گھوڑے کُداتے، جُوبن دِکھاتے چلے گئے ۔

پھر ہزار بارہ سے سانڈنی سوار خوش رفتار ۔ زَرد زَرد قبائیں دَر بَر، سُرخ پگڑیاں سر پر، آبی بانات کے پاجامے پاؤں میں ۔ ہتھیار لگائے، مُہاریں اُٹھائے سِتاروں کی چھاؤں میں ۔ سانڈنیوں میں دو دو سے کُوس کا دم، ہر قدم گھُنگرو کی چھَم چھَم ۔ بُختیِ فلک اب تلک بَلبَلاتا ہے، جب اُن کا دھیان آتا ہے ۔

قدم قدم یہ جب بڑھے تو سواری کے خاص خاصے نظر آئے: عربی، تُرکی، تازی، عِراقی، یَمَنی اور کاٹھیاوار کا دکھنی ۔ وہ وہ گھوڑا جو اَبلَقِ لَیل و نَہار کی نظر سے نہیں گزرا ۔ سُبک رَو ایسے کہ جو دریا میں دَر آئیں: سوار بجرے کا مزہ لوٹیں، سُم کے تلے حَباب

نہ ٹوٹیں۔ ہڈّا نہ موتڑا، نہ رَس کا خَلَل۔ ڈَنک اُجاڑ نہ کھوٹا اُکھاڑ، ساپنِن نہ ناگن، عَقرب نہ اَرجَل۔ شَب کور نہیں، مُنہ زور نہیں، کم خُور، نہ مَٹھا نہ کھوٹا، بال بھونری سے صاف۔ حَشری نہ کمَری، کہنہ لَنگ نہیں، سینے کا تنگ نہیں، ہمہ تن اَوصاف۔ کسی پر جَڑاؤ زین بندھا، اَلماس، زمرّد کے ہرنے؛ کسی پر چارجامہ دُوالگو کسا۔ بنا بنا کر زمین پر پاؤں دھرتے، کودتے پھاندتے، لِمبیاں بھرتے۔ کسی کی فقط گردنی اُلٹی، موتیوں کی جھالر لٹکتی۔ گنڈا، پٹّا، ساز، یَراق جواہر نگار۔ دُمچی طرح دار۔ پَرِ ہُما کی کلغی لگی۔ پاکھر پُرتکلف پٹھوں پر پڑی۔ دُوگاما، گام، شہ گام، یرغا، ایبیا، رَہوار، دُلکی کا منجا، اُبیل کرتا۔ جِلَودار چنور لیے مشغول مگس رانی میں۔ ہم رکاب تپائی بردار معقول سرگرم جاں فشانی میں۔ باگ ڈوریں پُرزَر سائیس لے کر نکلے۔

اُن کے بعد نوبت نشان، ماہی مراتب، میگھ ڈمبر۔ آگے عَلَمِ اژدہا پیکر، جِلَو میں نُصرت و ظفر۔ بڑا جلوس، نہایت کرّ و فر۔ نوبت کی نِدا، جھانجھ کی جھانجھ سے صدا۔ قَرنا کا شور و غُل، شہنا میں بھیروں، بِبھاس کے سُر بِالکل۔ نقیب اور چوبداروں کی آواز پُرسوز و گداز۔ عجب کیفیت کا عالم تھا۔ اُدھر نقّارہ ہائے شتری اور فیلی سے گوشِ کرّ وبیاں کر ہُوا جاتا تھا۔ ایک طرف شہر کے لڑکوں کا غول "بجا دے بجا دے" کا غُل مچاتا چلا آتا تھا۔ میر سوز:

کہے تو، مِہر و مہ لے کر عصائے نور ہاتھوں میں[1]
یہی کہتے تھے گردوں پر: ادب سے اور تفاوت سے

پھر شکار کا سامان میسر شکا لائے۔ بازِ آہنی چنگال، باز بچے تیز بال۔ بحری، باشے کے تماشے۔ شاہینِ فولاد مخلب، عقابِ فلک سیر، جہان کے طیر سب۔ اُن کے قریب ولایتی کُتے بودار، گلڈانگ، تازی، جاں بازی کرنے والے۔ چیتے، جو دشمنوں کا بُرا چیتے، بلکہ لہو پیتے۔ سِیاہ گوش در آغوش۔ ہرن لڑنے والے، خانہ زاد، گھر کے پالے۔ اِن کے بعد ہزار ہا سقّا، خواجہ خضر کا دم بھرتا، چھڑکاو کرتا۔ کمر میں کھارُوے کی لُنگیاں، شانوں پر بادلے کی جھنڈیاں۔ مشکوں میں بیدمُشک بھرا، دہانے میں ہزارے کا فُوّارہ چڑھا، آب پاشی کرتا۔

مُتعدّد غلام بادلہ پوش، حلقہ بہ گوش، ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے پڑے، منقل، انگیٹھیاں سونے چاندی کی لیے، عنبر و عود جھونکتے نکلے۔ پھر تو کوسوں تک جنگل رشکِ ختن و تاتار مثلِ طبلۂ عطّار ہو گیا۔ اُن کے متصل دو ہزار لالٹین والے کم سِن، بلّور کی صاف صاف شفّاف لالٹینیں لیے، شمعِ مومی و کافوری روشن، وہ سب غنچہ دہن، زیبِ انجمن، بڑھے۔ پھر صدائے اِہتمامِ نقیبانِ خوش گلو چار سو بلند ہوئی اور صُبحِ صادق نے جلوہ دکھایا، ہاتھ کو ہاتھ اور اپنے بیگانے کا منہ صاف نظر آیا۔ سُلطانِ اَریکۂ زنگاری بھی دریچۂ مشرق سے سر نکال مشغولِ نظّارہ ہوا، حسرت میں وطن آوارہ ہوا۔

وہ دمِ سحر نسیم و صبا کی فرفر۔ شمع کا جھلملا جھلملا اُداس جلنا، سواری کا آہستہ آہستہ چلنا۔ پہاڑی جانوروں کی سیر،

ذکرِ حق میں کہیں وَحش، کسی جا طَیر۔ سَر سَبز۔ درخت لہلہے، پھول رنگ برنگ کے ڈَہڈَہے۔ سَقّوں کی آب پاشی۔ صداے نالۂ مُرغِ خوش اِلحاں سے دِل خَراشی۔ خُسرَوِ انجم کا مَعِ ثابِت وسیّارہ چھپتے جانا، سورج کی کرن کا جگمگانا۔ پھولوں کی بُو باس، چشمۂ سرد و شیریں آس پاس۔ خلق کا مجمع دامنِ کوہ پر؛ سب کی نگاہ کبھی اُس کیفیت پر، گاہ اِس اَنبُوہ پر۔ اِدھر مسافروں کی کثرت، اُدھر بادشاہ پُر ارمان۔ خلقِ خُدا با حسرت بہ چشمِ اِنتظار، اُمّیدوارِ آمدِ پیادہ و سوار، مَحوِ تماشاے عجیبِ رُوزگار تھی۔

یَکایک غُول خاص بَرداروں کا آیا: کَمخواب کے مِرزائی، اَنگرکھے، گُجراتی مَشرُوع کے گُھٹنے، دِلّی کے ناگَوری پاؤں میں، سِر پر گلنار اَینٹھے طَرح دار۔ خاصیوں کے غِلاف باناتی، سَقرلاتی، باغ و بہار۔ گَرد پُوش ململ کے۔ سِینگڑے اور ساز مُطَلّا، جَھلا جھل کے۔ رَفَل؛ چقماق، تُوڑے دار۔ قَرابین، شیر بچّے؛ جس سے شیر زندہ نہ بچے: جواہر نگار۔ اور برچھے بردار، بان دار، کُتّے والے، یکّے، بیش قَرار دَرماہے دار، راکِب و مَرکَب جھمکڑے کا عالَم؛ گرداگرد۔ بیچ میں شہ زادہ جانِ عالَم اسپِ باد رفتار پر سوار۔ برابر انجمن آرا کا سُکھپال پری تمثال۔ ہزاریان سے کہاریاں حوروش، پیاری پیاریاں، کم سِن، جِسم گدرایا، شباب چھایا؛ زربفت و اَطلس کے لَہنگے، مسالا ٹنکا؛ ململ کے دوپٹے باریک، بَنَت گوکھرو کی کُرتی اَنگیا،

کاشانی مخمل کی کُرتیاں کندھوں پر، کچھ سُکھپال اُٹھائے، باقی پرا جمائے اِدھر اُدھر۔ جڑاؤ کڑے ملائم ہاتھوں میں پڑے، پاؤں میں سونے کے تین تین چھڑے، کانوں میں سادی سادی بالیاں، نشۂ حُسن میں متوالیاں۔ رُخساروں کا عکس جو پڑجاتا تھا، شرم سے کُندن کا رنگ زرد نظر آتا تھا۔ کسی کا کان جو آلا تھا، تو حُسن کی دُکان میں ناز و انداز کا نرخ دوبالا تھا، اندازِ ناز نرالا تھا۔ وہ آہستہ تیوری چڑھا کے پاؤں رکھنا۔ کبھی سِسکی، جِھجکی۔ بڑی سیر تھی۔

کئی سے سواری کا دوڑنے والا خواجہ سرا، عجیب عجیب طرح کا نَس کٹا۔ حَبشنیں، قلماقنیں، تُرکنیں سرگرمِ اہتمام، کبک خرام۔ خواجہ سرایانِ ذی لیاقت، معقول؛ نوّاب ناظر، داروغہ سب حاضر؛ عمدہ پوشاک پہنے گھوڑوں پر سوار بندوبست میں مشغول۔ جریب زمین پر پڑتی، کوس کا پہیا ساتھ؛ ہاتھوں ہاتھ زمین کی پیمایش، سواری کی آرایش۔ خلاصہ یہ کہ بہ مرتبہ کرّوفر، نہایت دھوم دھام۔ اَشرفی، روپیہ تصدّق ہوتا، شُہدوں کا اِزدحام۔ اِس صورت سے بادشاہ کے پاس آ پہنچے۔ جانِ عالَم نے دیکھا: ظِلِّ سُبحانی کے چشمۂ چشم سے جوئے خوں جاری، ہچکی لگی، بے قراری طاری ہے؛ گھوڑے سے کود کر آداب تسلیمات بجا لایا۔ بادشاہ نے بہ تبسّم فرمایا: اِس وقت ہمارے پاس نہ آؤ، خدا کو سونپا، چلے جاؤ۔ مجبور، شہ زادہ مُجرا کر کے سوار ہوا۔ جس دم جانِ عالَم نے گھوڑا بڑھایا، تمام خلقت کا جی بھر آیا۔ علَی الخُصوص بادشاہ کی بے قراری، امیر اُمَرا کی نالہ و زاری اور انجمن آرا کے بَین سے، تمام تماشائی شور و شین سے واویلا مچا کہنے لگے: آج رونقِ شہر کی رُخصت ہے، زینتِ سلطنت کی فرقت ہے۔ ایسے مہر و ماہ کے جانے سے شہر میں غدر پڑے گا، اندھیر ہو جائے گا۔ اِن کا اَلَمِ جُدائی در رنجِ دشت پیمائی ہزار روز سیہ، شامِ غم دکھائے گا۔ کہتے ہیں: سیکڑوں،

مرد و رنڈی بے کہے سُنے ہمراہ ہوئے۔ غریبُ الوطنی اِختیار کی، وہاں کی بُود و باش گوارا نہ ہوئی۔

اِن کے بعد پیچھے سات سے پالکی، نالکی، چنڈول، مُحافہ امیر زادیوں کا۔ اور اَنیسوں، جَلیسوں کی تین چار سَے کھڑ کھڑیا اور فِنَس قیمت کا بڑھیا۔ آتو اور محل داروں کے چَوپہلے سے پہلے مُغلانیوں کی مَنجھولیاں۔ خاص خواصوں کے پیچھے پیش خدمتوں کا دو تین سو میانہ۔ ہزار نو سے رتھ اکبر آبادی: دو بُرجے، سایبان دار، نئے مُغرَّق پردے چمکتے؛ ناگوری بَیل، جو ثَورِ فلک نے نہ دیکھے تھے، بُجتے؛ مخمل کی جھولیں پڑیں؛ لونڈیاں، باندیاں، اَنّا، چھوچھو، چھٹّی نویس، یاری دار نیاں اُن پر چڑھیں۔

جب یہ آگے بڑھیں، پھر چھکڑے اور اونٹ، ہاتھی خزانے اور اسباب کے؛ ڈیرے، پیش خیمے لدے لدائے، کسے کسائے، جکڑے نظر آئے۔ غَرَض کہ تا شام بَہیر بُنگاہ، بازاری سرکاری سب لوگ چلے گئے۔ لکھا ہے کہ روپے اور اَشرفیاں امام ضامن کی دَمِ رُخصت اِتنی آئیں کہ بازوؤں پر بندھ نہ سکیں، تمام راہ سیَد مسافروں نے پائیں۔ اور کُلچُوں کا یہ حال ہوا کہ اُن کا لے چلنا مُحال ہوا۔ راتِب کے سوا، ہاتھیوں کو ملے اور اہلِ لشکر کو بانٹ دیے۔ کھجوریں جو بٹ نہ سکیں، راہ میں پھینک دیں۔ وہ اُگیں؛ اُس کے درخت آگے کم تھے، اُس دن سے جنگل ہو گئے۔

اُس وقت بادشاہ سَراسِیمہ و بدحواس باحالِ یاس دَولت سَرا میں پھر آیا۔ وہ بسا بسایا شہر لُٹا، اُجڑا، ویران نظر آیا۔ بازار

میں جا بہ جا چراغ گُل، سرِ شام پگڑی غائب، اندھیرا بالکل۔ جس طرف دیکھا، لوگ تھکے ماندے پھر کر پڑے تھے۔ بازار میں تختے لگے، تڑ تڑ جڑے تھے۔ لوگ سوزِ مفارقت سے درد مند، دکانیں بند۔ جو جہاں پڑا تھا، شہ زادے کی رخصت کا ذِکر کر رہا تھا۔ دو شخص اگر باہم تھے، بادِلِ پُر غم تھے۔ کوئی سوتا تھا، کوئی چپکا پڑا روتا تھا۔ بستی سنسان، بازار میں سنّاٹا، خلقِ خدا اندوہ کی مبتلا۔ بادشاہ کو دُونا قلق ہوا، رنگ فق ہوا، دل سینے میں شق ہوا۔ محل سرا میں آیا، وہاں بھی چھوٹے بڑے کو غمگین پایا۔ لوگوں کے عزیز جدا ہو گئے، سب اُس یوسفِ رفتہ کے زندانِ فراق میں اسیرِ بلا ہو گئے۔ علی الخصوص انجمن آرا کی ماں، جس کی نظر سے وہ چاند سورج چھپ گئے؛ زمانہ آنکھ میں تیرہ و تار، دل غم سے خار خار، حیرت میں نقشِ دیوار ہو رہی تھی۔ آنکھوں پر زور تھا، زار زار رو رہی تھی۔ بادشاہ نے سمجھایا، ہاتھ منہ دھلوایا، کچھ کھلایا۔

یہ تو سب نالہ بہ لب، آہ در دِل؛ جانِ عالم اور انجمن آرا رُو بہ منزل۔ پانچ پانچ کوس کا کوچ، دو چار دن کے بعد ایک دو مقام بہ راحت و آرام کرتے چلے۔ فوجِ ظفر موج ساتھ۔ اُردوئے معلّیٰ کا عجب عالم تھا۔ ایک شہر روز ہمراہ، جہان کی نعمت تیار شام و پگاہ۔ صرّاف، بزّاز، جوہری: روپیہ پیسہ، اشرفی کھری سے کھری؛ ڈھاکے کا ریزہ، بنارس کا گلبدن، گجرات کا کمخواب؛ الماس و زمرّد، یاقوتِ احمر، جو چاہو سو لو، موجود۔ ایک طرف قصّاب اور

نانبائی؛ وہ کچّا گوشت لیے، یہ پکّی پکائی۔ میوہ فروش خانہ بدوش۔ حلوائی طرح طرح کی مٹھائی درست کیے۔ مینا بازار باغ و بہار۔ جدا جدا ہر گنج کا جھنڈا گڑا، ہر ایک منڈی کا پتا ملتا، چوپڑ کا بازار پڑا۔ جلو خانے کے روبہ رو۔ نصف شب گزرے تک دکانیں کھلیں، اکاسی دیا جلتا، بھولا بھٹکا اُس کی روشنی میں آملتا۔ کوتوال سرگرم پاسبانی، بازاریوں کی نگہبانی، نرسنگا روند میں پھونکتا۔ غرض کہ سب خرّم و شاداں رواں تھے؛ مگر جانِ عالم گاہ گاہ جذبِ محبتِ ملکہ سے یہ کہتا، شعر:

بسامانِ سفر باخود دلِ رنجیدہ دارم
بکف چیزیکہ دارم، دامنِ برچیدہ دارم

وُرُودِ موکبِ جاہ و جلالِ شاہ زادۂ خجستہ خصال مُتّصلِ باغِ فراق دیدۂ روزگار ملکۂ مہر نگار، اور بیان ملاقاتِ انجمن آرا کا، پھر نکاح ملکہ کا۔

مَشّاطۂ خامہ نے عروسِ دل فریبِ سخن کو بہ صد زیب و زینت حجلۂ بیاں میں اِس طرح جلوہ آرا کیا ہے کہ بعدِ قطعِ منازل و طیِّ مراحل جس روز وُرُودِ لشکرِ فیروزی اثر باکرّ و فر ملکہ مہر نگار کے باغ سے قریب ہوا، خبرداروں نے اور اخبار کے ہرکاروں نے یہ مژدۂ جاں بخش فوراً ملکہ کو

پہنچایا کہ حضور کی عمر و دولت روز اَفزوں ہو، محکوم گردوں ہو؛ مُبارک! شاہ زادۂ جانِ عالَم تشریف لایا۔ بس کہ غمِ مُفارَقت سے تاب و تَواں طاق، زندگی شاق تھی؛ سُنتے ہی مُشتاق کو غش آیا، پھر سنبھل کر فرمایا: بختِ خُفتہ کب بیدار ہوتا ہے، ایسا پاؤں پھیلائے سُوتا ہے! اور جو میرا دل بہلانے کو یہ کہتے ہو، تو سُن لو، مُؤلِّف:

تفریح کُلفتُوں کی، تَرغیب ہے لاحاصل
بہلانے کی باتیں ہیں، یہ دل بھی بہلتے ہیں

چَندِے جو یہی لَیل و نَہار ہے تو قصّہ، فیصلہ ہے۔ تدبیر خلافِ تقدیر سراسر بے کار ہے۔ مُؤلِّف:

گر اُس کے ہجر میں یوں ہی اندوہگیں رہے
تو ہوئے گا وصال، دِلا، یہ یقیں رہے
ہے احتیاط شرط کہ اِس چشمِ تر پر، آہ!
دامن رہے رہے نہ رہے، آستیں رہے
مدفن کا اپنے ہم کو تردّد ہو کس لیے
کوچے کی تیرے، یار، سلامت زمیں رہے
تو گلشنِ وصال کی کر سیر عندلیب!
ہم خرمنِ فراق کے بس خُوشہ چیں رہے
جو جو کہ انتخاب تھے صفحے پہ دہر کے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نشاں بھی نہیں رہے

کس کی خوشی، کہاں کی ہنسی، کیسا اِختلاط

ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے

چھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اُس کا اے سُرور

دم بھرتے ہم اُسی کا دمِ واپسیں رہے

اِس عرصے میں وہی خواص دل آرام نام بارہ دری سے نیچے اُتری، پھر کہا: خُدا جانے کہاں سے یہ لشکر آکر اِس دشت میں اُترا ہے! ملکہ ہنس کر بہ حیلۂ سیر خواصوں کے کندھوں پر ہاتھ دھر، ٹھنڈی سانس بھر کوٹھے پر چڑھی۔ دیکھا تو فی الحقیقت لشکرِ بے پایاں، سپاہِ فراواں، فُزوں اَز حدِ شُمار و بیاں ہے۔ خیامِ شاہی اِستادہ ہیں، پھرتے چلتے سوار اور پیادے ہیں۔ یکایک شہزادہ جانِ عالم، بہ چند سوار، اسپِ صرصر خرام، رخشِ تیز گام پر سوار نظر آیا؛ تاجِ سلطانی سر پر کج، شہریاری کی سج دھج۔ یا تو اُسے تنہا کھچا، منزلوں کا مارا، دشتِ غُربت کا آوارہ دیکھا تھا؛ اب حَشم و خَدم، جاہ و حَشم سے پایا؛ بدن تھرّایا، اَعضا اَعضا میں رعشہ ہوا، یہ زور تماشا ہوا۔ اُستاد:

آتے ہی ترے، پھُٹتا ہے رعشہ سا بدن میں①

ہر چند کہ ہیں بیٹھتے ہر لحظہ سنبھل ہم

وہ زردیِ چہرۂ پُرغم مژدۂ وصل کی سُرخی سے بدل گئی، غش سے سنبھل گئی۔ شہزادہ گھوڑے سے اُتر کے، سیدھا ملکہ کے باپ پاس گیا، جھک کر نذر دی، رسمِ سلام بجا لایا۔ اُس نے

دُعائے خَیر دے کر چھاتی سے لگایا، کہا : لِلّٰہِ الحَمد تمھیں بہ صحّت و عافیت اللہ نے کام یاب دِکھایا۔ پھر انجمن آرا کی سواری آئی، تسلیم بجالائی۔ پیر مرد نے فرمایا: شہ زادی! فقیر کے حال پر کرم کیا، اللہ بھلا کرے۔ اُس نے عَرض کی : کنیز مُدّت سے حضور کی صِفَت و ثَنا ظِلِّ سُبحانی کی زَبانی سُنا کرتی تھی، آج شہ زادے کی بدولت سعادتِ آستاں بُوس سے مُشرَف ہوئی۔ دو گھڑی بیٹھی، پھر اِلتماس کیا : اگر اجازت دیجیے، ملکہ کی ملاقات سے مسرور ہوں۔ اُس حق پَرَست نے فرمایا : اِس کا پوچھنا کیا، بابا! بے تکلّف خانہ خانۂ شماست۔ جانِ عالم تو رخصت ہو کے خیمے میں آیا، انجمن آرا نے ملکہ کے مکان کا رستہ لیا۔ آنے کی خبر بیش تر ملکہ کو پہنچی تھی، سامان اُس اُجڑے مکان کا درست ہو چکا تھا۔

جب سواری اُتری، لبِ فرش لینے آئی، فَرّاشی سلام کیا۔ انجمن آرا نے گلے سے لگالیا۔ ملکہ آبدیدہ ہو کر بولی : تم نے مجھے مَحجُوب کیا۔ مَیں فقیر کی بیٹی، تم شاہ زادی۔ ہر چند شاہ و گدا دونوں بندۂ خُدا ہیں ؛ اِلّا، تمھارے قدم آنکھوں پر رکھوں تو بجا ہے، آپ کے آنے سے مجھے بڑا اِفتخار حاصل ہوا ہے۔ انجمن آرا بولی : ہم نے خوب کیا۔ رنڈی! یہ چوچلے کی باتیں بیگانہ وار نہ کرتی تو کیا ہوتا! اے صاحِب! ہمارے تمھارے تو رشتۂ ہَمسَری، سَرِ رِشتۂ برابری ہے۔

اور حساب کی راہ سے، پہلی تو 'سلامتی سے'، تمھیں ہو۔ سرکار کا اُتش، ہمیں مِلا ہے، پہلے مزہ آپ نے چکھا ہے، جُوبن لوٹا ہے۔ غَرض کہ دو دو نُوکیں ہوگئیں۔ پھر اِختِلاط، حرف وحِکایات، رَمز وکِنایہ میں تمام رات بسر ہوئی۔

جس وقت عَرُوسِ شب نے مَقنَعۂ مغرب میں مُنہ چھپایا اور نَوشاہِ رُوز مشرق سے نکل آیا؛ انجمن آرا جانِ عالَم کے پاس آئی، ماجرائے شب بَرزَباں لائی، کہا: بہ خُدا! اِس خُلق ومروّت، سَنجِید وصفت کی عورت آج تک نہ دیکھی نہ سُنی تھی۔ دوسرے دن جانِ عالَم نے ملکہ کے باپ سے عَرض کیا کہ اَلْكَرِيمُ اِذَا وَعَدَ وَفیٰ۔ اُس سالِکِ راہِ حق نے اِرشاد کیا: ہم اِس لائق کہاں ہیں، لیکن، مصرع:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

تم قول کے پورے، اِقرار کے سچّے ہو۔ بِسمِ اللہ، اپنے زُمرۂ کنیزوں میں سَرفَراز کرو، آبرو بخشو۔ شادی کا نام لینا، مُنہ چِڑانا ہے کہ نہ اب وہ ہم ہیں، نہ ہمارا زمانہ ہے۔ آخِرِش بہ طَورِ شَرعِ شریف ملکہ کا نکاح جانِ عالَم کے ہمراہ ہوا۔ اب یہ معمُول ٹھہرا: ایک شب انجمن آرا کی، دوسری رات ملکہ کی ملاقات ٹھہری؛ مگر اُن دونوں میں وہ رہ ورسم محبّت، اُلفت کی بڑھی کہ شہ زادے کی عاشِقی نظر سے گرگئی، نظَری ہوئی۔ اور سچ ہے: جو طَرفَین سے نَجیبُ الطَّرفَین ہوتے ہیں، اُن میں رَشک حَسَد، رنج وملال دَخل نہیں پاتا، شِکوہ وشکایت لب تک نہیں آتا۔

کٹی جلی، ڈاہ، بُغض، عَداوت، خواہ نخواہ کج بحثی، دانتا کل کل، رُوز کی
تؤ تؤ ییں مَیں چھوٹی اُمت پر ختم ہے۔ لاکھ طرَح اِنھیں سمجھاؤ،
نَشیب و فَراز دِکھاؤ؛ لیکن اِن لوگوں سے بے جُھونٹک جھانٹا
گھڑی بھر چَین سے رہا نہیں جاتا۔ آخر کار یہ ہوتا ہے کہ آدمی سر پکڑ کے
روتا ہے۔ دو دن ایک طرَح پر صُحبت بَرآر نہیں آتی ہے" زِندَگی
انسان کی تَلخ ہو جاتی ہے۔ لاکھ طرَح کا غم ہوتا ہے، ناک میں دَم
ہوتا ہے۔ مُؤَلِّف:

عشق میں طرَفین سے الفت برابر چاہیے
جو بہ دِل بندہ ہو، اُس کو بندہ پرور چاہیے

داستانِ حیرت بیاں، رخصت شہ زادۂ باوقار کی، پیرِ مرد کا عَمَل بتانا، وزیر زادۂ گُم گشتہ کا اُسی روز آنا، جانِ عالَم کی عنایت، اُس کا انجمن آرا پر فَریفتہ ہو جانا، دغا سے شہ زادے کو بندر بنانا۔ بعدِ خرابی ملکہ کے باعِث رہائی پانا۔

نظم:

مُصیبت نِگار و مَصائِب رَقَم جگر چاک و مغموم میرا قلم
زمانے کی کچھ طرز لکھتا ہے یاں عَجائب غَرائب ہے یہ داستاں

مری بات یہ دل سے کرنا یقیں
کسی کا کوئی دوست مطلق نہیں
جو یہ دوست ہیں، اِن سا دشمن کہیں
نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں
کیا امتحاں میں نے اکثر سُرورؔ
ضرورت کی کچھ دوستی ہے ضرور

قِصّہ کوتاہ، چندِے شہ زادۂ والا جاہ وہاں رہا۔ ایک رُوز یہ سب عاشق و معشوق باہم خوش خُرّم بیٹھے تھے؛ جانِ عالم نے کہا: ہمیں وطن چھوڑے، عزیزوں سے مُنہ موڑے عرصہ ہوا؛ ہنُوز دِلّی دور ہے، اب چلنا ضرور ہے۔ وہ دونوں نیک خُو، رضاجُو بولیں: بہت خوب۔ اُسی روز حرفِ رُخصت ملکہ کے باپ سے درمیان آیا۔ مردِ انجام بیں نے رُوکنا مناسب نہ جانا۔ سفر کی تیاری ہوئی۔ دمِ رُخصت اِس قدر مال و اَسباب، نقد و جنس وغیرہ کی قسم سے شہ زادی کو ملا کہ انجمن آرا کا جہیز بھولا۔ اور وقتِ وَداع پیر مرد نے بادِلِ پُردرد جانِ عالم سے کہا: فقیر کے پاس آپ کے لائق کچھ نہ تھا جو پیش کش کرتا، مگر ایک نُکتہ بتاتا ہوں؛ جب کہ امتحان ہوگا، خزانۂ قارُوں سے زیادہ کام آوے گا۔ راست، دروغ خاطر نشاں ہوگا، لطف مل جائے گا۔ پھر چند فقرے تنہا لے جا کے بتا کے، تاکید سے کہا: اگر یہ مُقدّمہ حقیقی بھائی سے اِظہار کرو گے؛ یاد رکھو، حضرت یوسف علَیہِ السَّلام سے زیادہ صدمے سہو گے۔ زمانے کے اِخوانُ الشَّیاطیں بہ ہزار کید آمادۂ کیں رہتے ہیں۔ اِسی سبب سے دانش مند زبان بند رکھتے ہیں، راز اپنا نہیں کہتے ہیں۔ یہ نُکتہ حضرت آدمؑ کے وقت سے سب کو یاد ہے: دُنیا میں

برادرِ حقیقی دشمنِ مادر زاد ہے۔ فرد :

بھاگ اِن بَردَہ فروشوں سے، کہاں کے بھائی[1]

بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

پھر انجمن آرا پاس آ فرمایا: شہ زادی! فقیرزادی کنیز کو عزیز جان کر، نَظَرِ اَلطاف و کرم ہر دم رکھنا۔ یہ بھی خدمت گزاری میں قصور نہ کرے گی۔ اِسے تم کو سونپا، تمھیں حافظِ حقیقی کے سپرد کیا؛ لو خدا حافظ۔ سواری دیر سے تیّار تھی۔ لوگوں پر ثابت تھا کہ کوئی اَمرِ پوشیدہ، دَرویشِ باوقار شہ زادے پر بہ تکرار اِظہار کرتا ہے۔

اِتّفاقاتِ زمانہ، اُسی روز وہ وزیر زادہ جو وطن سے ساتھ نکل، ہرن کے پیچھے گھوڑا پھینک، دَشتِ اِدبار میں شہ زادے سے جُدا ہوا تھا؛ سرگشتہ و پریشاں، پھرتا پھرتا، پیادہ پا اِدھر آ نکلا۔ اُس نے جو یہ لشکرِ جرّار اور قافلہ تیّار دیکھا، پوچھا: کس کی سواری کہاں کی تیّاری ہے؟ لوگوں نے تمام جانِ عالم کا قِصّہ سُنایا۔ یہ خوش ہوا، جی میں جی آیا۔ پوچھا: شہ زادہ کہاں ہے؟ وہ بولے: پیر مرد جو یہاں کا مالک ہے، کامل ہے، عامل ہے، فقیرِ سالک ہے؛ کچھ کہنے کو تنہا جُدا لے گیا ہے۔ اِس عرصے میں جانِ عالم رُخصت ہو سوار ہوا۔ سلامی کی توپ چلی، نقارہ نواز نے ڈنکے پر چوب دی۔ وزیر زادے نے ہُلّڑ میں دوڑ کر مُجرا کیا۔ شہ زادے نے گھوڑے سے کود کے گلے لگایا، دیر تک نہ چھوڑا۔ اُسی دم لباسِ فاخرہ پہنا، ہمراہ سوار کیا۔ راہ

میں سَرگُذَشتِ تَفرِقَہ پوچھتا کہتا چلا۔ جب خیمے میں داخل ہوا، وزیر کو مَحَل سَرا میں طَلَب کیا۔ انجمن آرا اور ملکہ کو نَذر دلوا کے، کہا: یہ وہی شخص ہے جس کا اَلَمِ مُفارَقَت مُدام دل میں کانٹا سا کھٹکتا تھا، جی سینے میں تنگ تھا، آمد و شُد میں دم اَٹکتا تھا۔ دیکھو، جب اچھّے دن آتے ہیں، بے تلاش بِچھڑے مل جاتے ہیں۔ جس دن گَردُوں نے ہمیں آوارۂ دَشتِ اِدبار کیا تھا، جُدا ہر ایک دوست دارِ غم خوار کیا تھا۔ اب مُساعَدَتِ بَخت سے اَیّامِ سخت دور ہوئے، بَہَم مَہجُور ہوئے۔

وزیر زادے کا حال سُنو: انجمن آرا کا حُسن و جمالِ بے مِثال دیکھ، دیوانہ ہو، ہوش و حواس، عقل کھو؛ نمک حرام بنا، وصل کی تدبیر میں پھنسا۔ اُستاد:

یار، اَغیار ہو گئے، اللہ! ①
کیا زمانے کا اِنقِلاب ہوا

اُستاد:

خدا ملے تو ملے، آشنا نہیں ملتا ②
کوئی کسی کا نہیں دوست، سب کہانی ہے

دُو چار گھڑی یہ صُحبت رہی، پھر اپنے اپنے خیموں میں گئے۔ وزیر زادے کے واسطے خیمۂ عالی اِستادہ ہوا۔ پھر جتنی جَلیسیں، اَنیسیں حسیں، مَہ جَبیں دونوں شہ زادیوں کے ہمراہ تھیں؛ اُسے دِکھا، فرمایا: جس طرف تیری رغبت ہو، سَعی کروں، دِلوادوں۔ وہ نُطفۂ حرام اور خیال

میں تھا؛ یہ مُقدّمہ مطلب کے خلاف صاف صاف سمجھا، عرض کرنے لگا: میری کیا مجال ہے اور کیا تاب وطاقت ہے جو انھیں بُری نگاہ سے دیکھوں۔ جانِ عالم اِس وَضعی حرَکت سے بہت رَضامند ہوا کہ یہ بڑا نیک طِینَت، صاف باطِن ہے۔ بہ اَسبابِ ظاہر اِس نظر سے زیادہ مَدِّنظر ہوا، دِل میں گھر ہوا۔ تمام صُحبتیں، حالاتِ سفر، رنجِ راہ، قَریَہ وشہر کا گزر شہ زادے نے بیان کیا؛ مگر جب پیر مرد کے مَشوَرے کا ذکر آتا، ٹال جاتا۔ وہ سمجھا، کچھ اِس میں بھید ہے۔

ایک رُوز ملکہ مہر نگار اور انجمن آرا نے مُتّفِق ہو کر جانِ عالم سے کہا: یہ نیا ماجرا ہے، ہر دم ایک شخصِ غَیر اور جوان کو شریکِ صُحبت خَلا مَلا رکھنا کیا مناسب ہے؟ اور دابِ سلطنت سے بھی یہ اَمر بَعید ہے۔ شیطان کو انسان دور نہ جانے۔ غیر تو کیا، اپنے کا اِعتبار نہ مانے۔ جانِ عالم نے کہا: پھر ایسا کلمہ زبان پر نہ لانا۔ تم نے اِتنا نہ قیاس کیا کہ اُس نے تمھاری لونڈیوں کا پاس کیا، نہ کہ تمھارا حفظِ مَراتب۔ اور میں بھی تو ایسا بیہودہ، نادان نہ تھا جو خلافِ وَضع حرکت کرتا۔ ملکہ یہ سُن کر ہنسی، انجمن آرا سے مخاطِب ہو کر کہا: برائے خُدا انصاف کیجیے، خاطر کی نہ لیجیے؛ اِن کے حُمق میں کس بے وَقوف کو تامُّل ہوگا! آپ اگر عقل کے دُشمن نہ ہوتے، تو کیوں حَوض میں کود کر، ساحِرہ کی قید میں پھنستے، نام ڈُبوتے۔ تو بھلا سچ کہو، شرمندہ نہ ہو؛ جی میں کیا سمجھے تھے جو کود پڑے؟ ذرا یہ خَیال نہ آیا، غَوّاصِ فِکر کو مُحیطِ تامُّل میں غوطہ زَن نہ فرمایا کہ

کہاں انجمن آرا، کُجا جنگل کا حوض! وہ اِس میں کیوں کر آئی! وہ اَز خاندانِ شاہی تھی، یا شریکِ سلسلۂ ماہی، واہی تباہی تھی!

جانِ عالم کھسیانا ہوگیا، کہا: بات اَور، مسخرا پن اَور۔ کہاں کا ذِکر کس جگہ لا کے مِلایا۔ میری حماقت کا موقع خوب تمھارے ہاتھ آیا، جس کو سند بنایا۔ یہ تو سمجھو، شعر:

عشق ازیں بسیار کرد است و کُند
سُبحہ را زُنّار کرد است و کُند

اُستاد:

کہتے ہیں جسے عشق، وہ از قسمِ جُنوں ہے ①
کیوں کر کہ حواس اپنے میں پاتے ہیں خَلَل ہم

بھلا کچھ اپنی باتیں تو یاد کرو، دل میں مُنصِف ہو۔ ملکہ نے کہا: دیکھا! آپ شرمائے تو یہ کہانی لائے۔ مَیں تو رنڈی ہوں، ناقص عقل میرا نام ہے، مردوں کا یہ کلام ہے۔ بھلا صاحب! اگر مجھ سے کوئی بے وَقوفی کی حرکت ہووے، تعجّب کی جا نہیں، ایسی بڑی خطا نہیں؛ لیکن شُکر کرنے کی یہ جا ہے کہ آپ کا مزاج بھی میرا ہی سا ہے۔ آخر یہ بات ہنسی میں اُڑ گئی؛ مگر وہ مکّار ہر کوچ و مُقام میں وقت کا مُنتظِر تھا۔ ایک رُوز زِغم اَندوز شہ زادے کا خیمہ صحرائے باغ و بہار، دَشتِ لالہ زار مگر ہمہ تن خار خار، پُر آزار میں ہُوا۔ فِضائے صحرا نے کیفیت دکھائی، پھولوں کی خوش بو دِماغ میں سمائی۔ جا بہ جا چشمے رواں دیکھ کے، یہ لہر آئی کہ تنہا

وزیر زادے کا ہاتھ پکڑ لبِ چشمہ جا بیٹھا۔ کشتی شراب کی طلب ہوئی۔ جس دم جانِ عالم کی آنکھوں میں سُرور آیا، اِختلاط کا زبان پر مذکور آیا؛ اُس دغا شعار، پُرفن مکّار نے وقتِ تنہائی، صُحبتِ بادہ پیمائی، نشّے کی حالت غنیمت جانی، رُونے لگا۔ شہ زادے نے ہنس کر کہا: خیر ہے! وہ بولا: جو جو شرطِ رفاقت، حقِّ خدمت دُنیا میں ہوتا ہے، غُلام سب بجا لایا؛ مگر محنت و مشقّت، غریبُ الوطنی، دشت نوَردی کا عِوض خوب بھر پایا۔ جب آپ سا قدر داں بات کو چھپاوے، تو پھر اَور کسی سے کس بات کی اُمید رہے۔

جانِ عالم نے نشّے میں انجامِ کار نہ سوچا، اُس فیلسوف کے رُونے سے بے چین ہو گیا، کہا: اگر تجھے یہی امر ناگوار ہے تو سُن لے جو اَسرار ہے: مجھے ملکہ کے باپ نے یہ بات بتائی ہے کہ جس کے قالب میں چاہوں، اپنی رُوح لے جاؤں۔ اُس نے پوچھا: کس طرح؟ شہ زادے نے ترکیب بتا دی۔ جب وہ سب سیکھ چُکا، بولا: غُلام کو بے اِمتحان غلطی کا گُمان ہے۔ شہ زادے نے کہا: اِثبات اِس بات کا بہت آسان ہے۔ اُٹھ کر جنگل کی طرف چلا۔ چند قدم بڑھ کر بندر مُردہ دیکھا، فرمایا: دیکھ مَیں اِس کے قالب میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر شہ زادہ زمین پر لیٹا، بندر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر زادے کو سب ڈھنگ یاد ہو گیا تھا؛ فوراً وہ کور نمک زمین پر گرا، اپنی روح جانِ عالم کے قالبِ خالی میں لا، کھڑا ہوا اور کمر سے تلوار نکال، اپنا جسم ٹکڑے

ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا۔ یہ غضب بڑا ہوا، شہ زادے کا نشہ کرکرا ہوا۔ سمجھا: بڑی خطا ہوئی، از ماست کہ بر ماست، خود کردہ را علاج نیست۔ وہ کافر بندر کے پیچھے دوڑا۔ شہ زادہ بچارا بھاگ کر درختوں کے پتّوں میں چھپا۔

پھر تو بہ دِل جَمعیِ تمام وہ نُطفۂ حرام لہو کپڑوں پر چھڑک، بے دَھڑک ملکہ کے خیمے میں گیا، رُویا پیٹا، کہا: اِس وقت ظلم کا حادِثہ ہوا، مَیں وزیر زادے کے ساتھ سَیر کرتا تھا؛ یکایک جنگل سے شیر نکلا، اُسے اُٹھا لے چلا۔ ہر چند میں نے جاں بازی سے شیر کو تہِ شمشیر کیا، زخمی ہوا؛ مگر اُسے نہ چھوڑا، لے ہی گیا۔ ملکہ نے تاَسُّف کیا، سمجھایا: قضا سے کیا چارہ! یہی حیلۂ مَرگ اُس کے مُقدّر میں تھا۔ پھر انجمن آرا پاس گیا، وہاں بھی یہی اِظہار کیا؛ اِلّا، گھبرایا ہوا باہر چلا گیا۔ ملکہ، انجمن آرا کے خیمے میں آئی، وزیر زادے کا مذکور آپس میں رہا؛ لیکن ملکہ کو قِیافہ شَناسی کا بڑا ملکہ تھا، پریشان ہو کر یہ کلمہ کہا: خُدا خَیر کرے! آج بہت شگُونِ بد ہوئے تھے: صُبح سے دَہنی آنکھ پھڑکتی تھی؛ راہ میں ہِرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا مُنہ تکتی تھی، اپنے سایے سے بھڑکتی تھی؛ خیمے میں اُترتے وقت کسی نے چھینکا تھا؛ خوابِ مُوحِش نماز کے وقت دیکھا تھا۔ تم بھی فَضلِ اِلٰہی سے عقل و شعُور رکھتی ہو، آج کی حرکتیں شہ زادے کی غور کرو؛

خِلافِ عادت ہیں، یا مجھی کو وَاہِمہ بے جا ہے؟ انجمن آرا نے کہا: تم جانتی ہو وزیر زادے سے محبّت کیسی تھی! رنج و اَلَم بُرا ہوتا ہے، بدحواسی میں اَور کیا ہوتا ہے۔

اَلقِصّہ، وہ شب ملکہ کے پاس رہنے کی تھی، اِسے اندر کا حال کیا معلوم تھا؛ طبیعت کے لگاو سے انجمن آرا کے خیمے میں گیا۔ جس وقت پَہَر بجا، ملکہ اِنتِظار کرکے وہاں گئی۔ دیکھا شاہ زادہ مُضطَرِب بیٹھا ہے۔ اِس نے پوچھا: آج کہاں آرام کرو گے؟ وہ ٹھٹک کر بولا: جہاں تم کہو۔ ملکہ نے کہا: یہیں سو رہو۔ شہ زادے نے کہا: بہت خوب۔ یہ کلمہ بھی خلافِ دستور ظُہور میں آیا۔ اِس کا "خوب کہنا" ملکہ نے بُرا مانا۔ انجمن آرا کا ہاتھ پکڑ اپنے خیمے میں لائی، رُوئی پیٹی، چِلّائی۔ انجمن آرا بولی: ملکہ! خُدا کے واسطے کچھ مُفصَّل بتا۔ وہ بُولی: غَضَب ہوا، قسمت اُلٹ گئی، شہ زادے سے چھُٹ گئی؛ خُدا کی قَسَم یہ جانِ عالَم نہیں۔ وہ بھی شہ زادی تھی، گو سیدھی سادی تھی، کہا: دُرست کہتی ہو، بہت سی باتیں اِس نے آج نئی کی ہیں۔ ملکہ نے کہا: خَیر، اب جو ہو سو ہو، تم یہیں سو رہو۔ پھر جَلَشتُوں، تُرکَنُوں سے فرمایا: ہم سوتے ہیں، تم دَرِ خیمہ پر مُسَلَّح جاگو؛ اِس وقت شہ زادہ کیا، اگر فَرِشتہ آئے، بار نہ پائے۔ یہ خبر سُن کر وہ نامَرد ڈرا، اکیلے اَور خیمے میں جا پڑا۔ ایک ڈر دو طرف ہوتا ہے۔ ملکہ نے

کہا: دیکھا! اگر جانِ عالَم ہوتا، کبھی اکیلا نہ سوتا، بے تأمّل چلا آتا۔ بدمزگی کا باعث، خفگی کا سبب پوچھتا۔ اُسے کس کا ڈر تھا، اُس کا تو گھر تھا۔ انجمن آرا کہنے لگی: صورت تو وہی ہے۔ اُس وقت ملکہ نے ماجرا غیر کے قالب میں روح لے جانے کا دمِ رُخصت اپنے باپ کے بتانے کا مُفصّل بتایا؛ پھر کہا کہ شہ زادے نے وزیر زادے کو یہ حال بتایا ہے۔ آپ تو خُدا جانے کس مصیبت میں مُبتلا ہوا، ہم کو موذی کے چنگل میں پھنسایا ہے۔ ہمیں رُوزِ اوّل اُس کی چِتوَن پر بدگمانی کا شک آیا تھا، سامنے لانے کو منع کیا تھا، سمجھایا تھا۔ وہ نادان ہمارا کہنا خاطر میں نہ لایا، اُس کا مزہ پایا۔

اَلقِصّہ، وہ شب کہ شبِ اوّلین گور تھی، رونے پیٹنے میں کٹی۔ انجامِ کار کا اُس نابکار کے خوف سے تردّد و تفکّر رہا کہ دیکھیے شیشۂ ناموس و ننگ سنگِ ظلم سے کیوں کر بچتا ہے! اور یہ کہتی تھیں، اُستاد:

کسے تیغِ جفائے چرخ سے اُمّید ہنسنے کی ①
جو ہووے بھی تو ہاں شاید دہانِ زخم خنداں ہو

اِسی فکر و اندیشے میں صُبحِ قیامت نمود ہوئی، سواری ڈیوڑھی پر موجود ہوئی، کوچ ہوا۔ خبرداروں نے اُس بنے شہ زادے سے عرض کی: یہ سرزمینِ غضنفریہ ہے، یہاں سے پانچ کوس شہر ہے۔ حاکم وہاں کا غضنفر شاہ زرہ پوش ہے۔ سوار و پیادے کے سوا، لاکھ غلام جنگ آزمودہ، جرّار حلقہ بہ گوش ہے۔ حُکم کیا: خیمہ ہمارا شہر کے قریب ہو۔ کارپرداز حسبُ الارشاد عمل میں لائے۔ جب شہ زادیاں خیمے میں داخل ہوئیں، خود آیا۔ اِدھر یہ بے چاریاں

ڈر سے بادِلِ صد چاک، اُدھر ملکہ کے رُعب سے وہ بچّہ بھی خوف ناک۔ ساعت بھر بیٹھ کے اُٹھ گیا۔

جب غُلغلۂ فوج اور آمدِ لشکر وہاں کے بادشاہ نے سُنا کہ لشکرِ بے شمار، سپاہِ جرّار شہر کے مُتّصل آپہنچی؛ اُسے بہت تشویش ہوئی۔ وزیرِ خوش تدبیر کو چند تُحفے دے کر، اِستفسارِ حال، بہ ظاہر اِستقبال کو بھیجا؛ تا ملازمت حاصل کر کے من و عن حُضور میں عرض کرے۔

وزیر حاضر ہوا۔ عَرض بیگیوں نے خبر پہنچائی۔ وہ تو دابِ سلطنت، ریاست کا رنگ، ملاقات کا ڈھنگ جانتا تھا؛ وزیرِ اعظم کا بیٹا تھا، طرزِ رزم و بزم، آئینِ صُلح و جنگ جانتا تھا؛ رُو بہ رُو طَلَب کیا۔ بعدِ ذِکر و اَذکارِ ہر شہر و دِیار، اپنا سَبَبِ آمد بہ جِہتِ سیر و شکار اور اچھا ہونا آب و ہَوا اِس جوار کا اور دیکھنا یہاں کے شہر و شَہریار کا بیان کیا۔ دَمِ رُخصت خِلعتِ فاخرہ وزیر کو عنایت ہوا اور بہ طَرزِ دوستانہ کچھ ہَدایا بادشاہ کو روانہ کیا۔

جب وزیر اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ حُسنِ اَخلاق، دبدبۂ شَوکت و صَولت، آئینِ سلطنت، رُعب و جُرأت کا اُس کے اِس رنگ ڈھنگ سے ذکر کیا کہ وہ بادشاہ بے ساختہ مُشتاق ہو کر سوار ہوا۔ خبرداروں نے اِس حال سے مُطّلَع کیا۔ اَرکانِ سلطنت، وُزَرا، اُمَرا، بخشی، سِپہ سالار پیشوائی کو گئے۔ جب قریب پہنچا، خود دَرِ خَیمہ تک آیا۔ مُعانَقہ کر، دونوں تخت

پر جا بیٹھے۔ سلسلۂ کلامِ بلاغت نظام طرفین سے کھلا۔ وہ بھی اِس کی صورت پہ غش ہو گیا، فصاحت پر اَش اَش کرتا رہا، بہ صد تکرار شہر کا مُکلّف ہوا۔ جلد جلد عمارتِ شاہی سجی سجائی خالی ہوئی، اُس کو اُتارا، لشکر وہیں رہا۔ پھر حَسبِ طلبِ ملکہ و انجمن آرا سَرِ چوک دو محلسرا برابر خالی ہوئے؛ اُس میں وہ ناموسِ سلطاں، مُبتلائے بَلائے بے دَرماں، مُضطر و حیراں داخل بہ صد خستہ حالی ہوئے۔

چند روز دعوت، جلسے رہے۔ جب فرصت ملی، دل میں سوچا: اگرچہ جانِ عالم بندر رہے؛ اِلّا، اُس کے جینے میں اپنی مرگ کا خوف و خطر ہے۔ ایسی تدبیر نکالیے کہ اُسے جان سے مار ڈالیے، پھر بے کھٹکے آرام صُبح و شام کیجیے۔ ملکہ سے ڈرتا تھا، بہ پیر مرد کے نام لینے سے مرتا تھا، جیسے چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ سوچ کر حکم کیا: ہمیں بندر درکار ہیں؛ جو لائے گا، دس روپے پائے گا۔ اہلِ شہر ہزاروں بندر پکڑ لائے۔ جو سامنے آتا؛ بہ غور دیکھ، سر تڑواتا۔ تھوڑے عرصے میں بہت بندر ہلاک اُس سفّاک نے کیے۔ جب بندر کم ہوئے، دام بڑھے۔ بہ حدّے کہ فی بندر سو روپے مقرّر ہوئے۔ دو کوس، چار کوس گرد و پیش نام و نشان نہ رہا، بندر عنقا ہو گیا۔ چناں چہ وہیں کے بھاگے ہوئے آج تک متھرا اور بندرابن اور اَودھ بنگلے میں خستہ تن ہیں۔ بلکہ اُس زمانے میں "بندرابن" بالفتح تھا؛ اب عرصۂ دراز گزرا، وہ بندروں کی کثرت جو نہ رہی؛ اِس کسرے، یہ لفظ بالکسر خلقت کہنے لگی۔

غَرَض کہ شہر میں ہر طرف غُلغُلہ، سب کی یہی مَعاش ہوئی۔ ہر شخص کو بندر کی تلاش ہوئی۔ ایک چِڑیمار زیرِ دیوارِ سَرا، اُس بستی میں بستا تھا؛ مگر محتاج، مُفلُوک۔ بہ ہزار جُستجو و تگاپُو تمام دن کی گردِش میں دس پانچ جانور جو ہاتھ آجاتے؛ دو چار پیسے کو بیچ کر جُورو خَصَم رُوٹی کھاتے۔ اگر خالی پھرا، فاقے سے پیٹ بھرا۔ ایک روز اُس کی جُورو کہنے لگی: تو سخت اَحمق ہے، دن بھر جانوروں کی فِکر میں دَر دَر، خاک بہ سَر، اُلّو سا دیوانہ ہر ایک ویرانہ جھانکتا پھرتا ہے؛ اِس پر، جو رُوٹی ملی تو بدن پر لَتّہ ثابِت نہیں۔ کسی طَرح اگر ہنومان کی دَیا سے ایک بندر بھی ہاتھ آئے؛ تو برسوں کی فرصت ہو، دِلَدّر جائے۔

لالچ تو بُرا ہوتا ہے، وہ راضی ہوا، کہا: کہیں سے آٹا لا، رُوٹی پکا اور جس طرح بنے، تھوڑے چنے بَہَم پہنچا۔ صُبح بندر کی تلاش میں جاؤں گا، نصیب آزماؤں گا۔ اُس نے مانگ جانچ وہ سامان کر دیا۔ دو گھڑی رات رہے چِڑیمار جال، پھَٹکی پھینک؛ لاسا، کمپا چھوڑ؛ ٹٹّی جو دُھوکے کی تھی، وہ توڑ؛ رُوٹی، چنے اور رسّی لے کے چل نکلا۔ شہر سے چھ سات کوس باہر نکل، درختوں میں ڈھونڈھنے لگا۔

وہاں کا حال سُنیے: شہ زادہ جو بندر بنا تھا، اُس نے جس دن سے بندر پکڑتے لوگوں کو دیکھا تھا اور بسر تُڑوانے کا حال سُنا

تھا ؛ بدحواس، پریشان، سراسیمہ، زیست سے یاس، حیران،
ہر طرف چھپتا پھرتا تھا کہ مبادا کوئی پکڑ لے جائے، زندگی میں خلل
آئے۔ اُس روز کئی دن کا بے دانہ و آب، خستہ و خراب، ضعف و نقاہت زنجیرِ پا تھا،
ہر قدم اُلجھ کے گرتا تھا؛ ایک درخت کے کُول میں غش ہو کر پڑا تھا۔ چڑیمار
نے دیکھا، دبے پاؤں آکر گردن پکڑ لی۔ اُس نے آنکھ کھولی؛
گلا دستِ قضا میں پایا، جینے سے ہاتھ اُٹھایا۔ یقین ہوا: زیست
اِتنی تھی، آج پیمانۂ بقا بادۂ اَجَل سے لب ریز ہو کر چھلکا؛
پُکارا: اے گردُونِ دُوں! اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔ چڑیمار
نے کمر سے رسّی کھول مضبوط باندھا، پھر شہر کا رستہ لیا۔
تھوڑی دور چل، بندر نے کفِ افسوس مَل اُس سے کہا: اے شخص!
کیوں خونِ بے گُناہ، بندۂ اللہ، راندۂ درگاہ اپنی گردن پر لیتا ہے،
مُصیبت زَدے کو اور دُکھ دیتا ہے۔ وہ بولا: کیا خوب، تو باتوں
سے مجھے ڈراتا ہے! اگر دیو، بھوت، جن، آسیب؛ جو بلا ہے،
بلا سے؛ مگر تیرا چھوڑنا ناروا ہے۔ آج ہی تو قسمت آزمائی ہے، نعمتِ
غیر مُترقّب رام جی نے دِلوائی ہے۔ تجھے بادشاہ کو دوں گا، سو روپے لوں گا،
چین کروں گا۔ یہ سُنتے ہی سُن ہو گیا، رہی سہی جان قالب سے نکل
گئی۔ ہر چند منّت سماجت سے کہا: لالچ کا کام بُرا ہوتا ہے؛ کچھ کام
نہ آیا، چڑیمار نے جلد جلد قدم بڑھایا، قریبِ شام شاد کام گھر آیا،
جُورُو سے کہا: اچھی ساعت گھر سے گیا تھا، طائرِ مطلب بے دام و دانہ

خواہش کے جال میں پھنسا۔ یہ کہہ کر خوب ہنسا۔

دو کلمے یہ سُنیے : جس دن شہ زادہ گرِفتارِ بلائے تازہ ہوا، یعنی چڑیمار کے دامِ حرص میں گرِفتار ہوا ؛ ملکۂ دِل گرِفتہ خود بہ خود گھبرائی، رُو رُو کر یہ بَیت زبان پر لائی، اُستاد :

ہوئی کیا وہ تاثیر اے آہ تیری①
تھی آگے تو کچھ بیش تر آزمائی

انجمن آرا سے کہا : تم نے سُنا، یہ کم بخت بندر پکڑوا کے سر کُھلواتا ہے ؛ یقین جانو جانِ عالم اِس ہیئت میں ہے۔ اور آج، خدا خیر کرے، صُبح سے بے طرح دِلِ ناکام کو اِضطِراب ہے، جانِ زار کو پیچ و تاب ہے۔ گھر کاٹتا ہے، غم کلیجا چاٹتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے شہ زادہ پکڑا گیا۔ یا کوئی اَور آفتِ تازہ، ستمِ نَو بے اندازہ چرخِ کُہَن دِکھائے گا۔ ہنسی کے بدلے رُلائے گا۔ میرؔ :

جس سے جی کو کمال ہو اُلفت　　جس کی جانِب درست ہو نسبت②
جُنبشِ اُس کی پلک کو گر وھاں ہو　　دل ہیں یھاں کاوِش اک نُمایاں ہو
یار کو دردِ چشم گر ہووے　　چشمِ عاشق لہو سے تَر ہووے
وھاں دَہَن تنگ، یھاں ہے دل تنگی　　حُسن اور عشق میں ہے یک رنگی

انجمن آرا نے جھلّا کر کہا : اِس سے اور اَفزوں کیا دُنیا میں تباہی و خرابی ہوگی : شہر چُھٹا، سلطنت گئی، ماں باپ، عزیز و اَقرِبا کی جُدائی نصیب ہوئی، گھر لُٹا۔ زخمِ دل و جگر آلے پڑے ہیں، جان

کے لالے پڑے ہیں۔ مُصحفی :

مَرَضُ الموت سے کچھ کم نہیں آزار اپنا
دل میں دشمن کے بھی یارب نہ چُبھے خار اپنا

اور جس کے واسطے آوارہ و سَرگَشتہ ہوئے، یہ صدمے سہے بانحوستِ بَختِ نافَرجام، گردشِ اَیّام سے اُسے کھو بیٹھے، وطن سے ہاتھ دُھو بیٹھے۔ اب رَضِینا بہ قضا۔ مرضیِ مَولیٰ اَز ہمہ اَولیٰ۔ ناسِخ :

مجھے فرقت کی اسیری سے رہائی ہوتی①
کاش عیسیٰ کے عِوَض موت ہی آئی ہوتی

ابرِ رحمت سے تو محروم رہی کِشت مری
کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی

ہوں وہ غم دوست کہ سب اپنے ہی دل میں بھرتا
غمِ عالَم کی اگر اِس میں سمائی ہوتی

یہاں تو یہ باتیں تھیں؛ اُدھر چڑیمار کی جُورو چراغ لے کر بندر کو دیکھنے لگی۔ بندر سوچا: وہ کم بَخت بَرسَرِ رَحم نہ ہوا؛ کیا عجب یہ رنڈی ہے؛ اگر نَرم زَبانی سے مذکورِ آفتِ آسمانی سُنے اور مہربانی کرے۔ اِس خیال سے پہلے سلام کیا۔ وہ ڈری، تو یہ کلام کیا: اے نیک بَخت! خوف نہ کر، دو باتیں میری گوشِ دل سے سُن لے۔ گنواریاں جی کی کڑی بھی ہوتی ہیں؛ بندر کا بولنا اچنبھا سمجھ کر کہا: کہہ۔ وہ بولا: ہم غریبُ الوطن، گرفتارِ رنج، مُبتلاے محَن،

گھر سے دور، قید میں مجبور ہیں۔ ماں باپ نے کس کس ناز و نعم سے پالا۔ فلکِ تفرقہ پرداز نے کون کون سی مصیبت دِکھانے کو گھر سے نکالا۔ یہاں تک دَر بہ دَر حیران پریشان کر کے، پردیس میں بُرے دن دکھائے کہ تیرے پاس گرِفتار ہو کر آئے۔ اُستاد:

پَیدا کیا خدا نے کسی کو نہیں عَبَث (1)

لایا مجھی کو یاں یہ جہاں آفریں عَبَث

اب صُبح کو جب ہم گردن مارے جائیں گے، تب سَو روپے تمھارے ہاتھ آئیں گے۔ خونِ بے گناہ کی جزا حَشر کو پاؤ گی۔ بیکُنٹھ چھوڑ نَرَک میں جاؤ گی۔ پَیسہ روپیہ ہاتھ کا مَیل ہے؛ اِس پر جو مَیل کرتی ہو، کتنے دن کھاؤ گی؟ کلنک کا ٹیکا ہے، دَھبّا اِس کا جیتے جی نہ چھوٹے گا، دھوتے دھوتے گھر بہاؤ گی۔ اگر ہمارے حال پر رَحم کرو، خُدا اَور کوئی صورت کرے گا۔ سَو روپے کے بدلے تمھارا گھر اَشَرفیوں سے بھرے گا۔ ہمارے قَتل میں گُناہِ بے لذّت یا ایک موذی کی حسرت نکلنے کے سِوا اَور کیا فائدہ ہے؟ اگرچہ ایسا جینا، مرنے سے بُرا ہے؛ لیکن خُدا جانے اِرادۂ اَزَلی، مَشِیَّتِ اِیزَدی کیا ہے! ہماری تقدیر میں کیا کیا لکھا ہے! جو خدا کے نام پر نِثار ہے، اللہ اُس کا ہر حال میں مُمِدّ و مددگار ہے۔ تو نے بادشاہِ یَمَن کا قصّہ سُنا نہیں: ایک سلطنت لِلّٰہ دی، دو پائیں؛ لالچیوں کی قضا آئی، جانیں گنوائیں۔

رنڈی موم کی ناک ہوتی ہے؛ جب پھر گئی، جدھر پھیرا پھر گئی۔ بندر کی باتوں پر کچھ تعجب، کچھ تاسّف کر کے کہنے لگی: ہنومان جی! وہ کہانی کیسی ہے، سناؤ مہاراج۔

فسانۂ سلطانِ یمن۔ سائل کو سلطنت دے کے غریبِ دیار ہونا، سوداگر کے فریب سے شہ زادی کا کھونا۔ پھر بیٹوں کی جُدائی، اپنی دشت پیمائی۔ آخر سلطنت کا مل جانا، بیٹوں کا آنا، بی بی کا پانا، پھر سوداگر کا قتل کرنا۔

بندر نے کہا: سرزمینِ یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ مُلک اُس کا مالا مال، دولت لازوال۔ بخشندۂ تاج و تخت، نیک سیرت، فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوشِ حق نیوش میں در آئی، وہیں احتیاج پکاری: میں بر آئی۔ یہاں تک کہ لقب اُس کا نزدیک و دور "خدا دوست" مشہور ہوا۔ ایک روز کوئی شخص آیا اور سوال کیا کہ اگر تو خدا دوست ہے، تو للہ، تین دن کو مجھے سلطنت کرنے دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بسم اللہ۔ جو اراکینِ سلطنت، مسند نشینِ حکومت حاضر تھے؛ بہ تاکید انھیں حکم ہوا کہ جو اِس کی نافرمانی کرے گا، موردِ عتاب

سلطانی ہوگا۔ یہ فرما، وہ فرماں روا تخت سے اُٹھا، سائل جا بیٹھا، حُکم رانی کرنے لگا۔

چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا: اب قصد کیا ہے؟ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔ سائل بولا: پہلے تو فقط امتحان تھا، اب بادشاہت کا مزہ ملا؛ برائے خُدا یہ تاج و تخت یک لخت مجھے بخش دے۔ بادشاہ نے فرمایا: بہ رضائے خُدا یہ حکومت آپ کو مُبارک ہو، میں بہ خوشی دے چکا۔ بادشاہت دے کر پھ کچھ نہ ہیہات لیا؛ فقط لڑکوں کا ہاتھ ہاتھ میں، بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا: اِتنے دنوں سلطنت، حکومت کی؛ چندے فقیری کی کیفیت، فاقے کی لذّت دیکھیے۔ گو جاہ و حشم مفقود ہے، مگر شاہی بہ ہر کیف موجود ہے؛ اِلّا اِس شہر میں سے کہیں اَور چلنا فرض ہے۔ حکمِ خُدا قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ہے۔ دُنیا جائے دید ہے۔ عنایتِ خالق سے کیا بعید ہے جو کوئی اَور صورت نکلے۔ ایک لڑکا سات برس کا، دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا؛ بلکہ تکلّف کا لباس بھی وہ خُداشناس بار سمجھا، نہ لیا؛ جامۂ عُریانی جسم پر چُست کیا اور چل نکلا۔ نیرنگیِ سپہرِ بُوقلموں، دُنیائے دوں کا یہ نقشہ ہے، مصرع:

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است ①

کل وہ سلطنت، ثروت، کرّ و فر، افسر و تاج؛ آج یہ مصیبت، اذیّت، در بہ در، پیادہ پا سفر، محتاج۔ کبھی دو کوس، گاہ چار کوس، بے نقّارہ و کوس، بہ ہزار رنج و تعب چلتا۔ جو کچھ میسّر

آیا، تو رُوزی ہوئی ؛ نہیں تو رُوزہ۔ یوں ہی ہر رُوز راہ طَے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی، چند روز میں ایک شہر ملا، مسافر خانے میں بادشاہ اُترا۔ اِتّفاقاً ایک سوداگر بھی کسی سمت سے وارِد ہوا۔ قافلہ باہر اُتار، تنہا گھوڑے پر سوار، سَیر کرتا مہمان سرا میں وارِد ہوا۔ شہ زادی گو کہ گردِ راہ، صعوبتِ سفر کی مبتلا تھی ؛ لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدی :

حاجتِ مشّاطہ نیست روی دل آرام را [1]

سوداگر کی آنکھ جو پڑی ؛ بہ یک نگاہ از خود رفتہ ہوا، سانس سینے میں اَڑی۔ بادشاہ کے قریب آ سلام کیا۔ یہ بے چارے اللہ کے ولی، وہ وَلَدُالزِّنا شقی۔ بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔ اِس عرصے میں وہ غدّار حیلہ سُوچا، بہت فسُردہ خاطِر ہو کر کہا : اے عزیز! میں تاجِر ہوں، قافلہ باہر اُترا ہے۔ میری عورت کو دردِ زِہ ہو رہا ہے۔ دائی کی تلاش میں دیر سے گدائی کر رہا ہوں، ملتی نہیں۔ تو مردِ بزرگ ہے، کج ادائی نہ کر، اِس نیک بخت کو لِلّٰہ میرے ساتھ کر دے ؛ تا اِس کی شراکت سے اُس کو رنج سے نجات ملے ؛ وگرنہ بندۂ خدا کا مُفت خون ہوتا ہے، آدمی کا مر جانا زبُوں ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا نام سُن کر گھبرائے، بی بی سے کہا : زِہے نصیب! جو محتاجی میں کسی کی حاجت بر آئے، کام نکلے۔ بسم اللہ، دیر نہ کرو۔ اُس نے دَم نہ مارا، کھڑی ہو گئی، سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دروازے سے باہر نکل اُس غریب سے کہا : قافلہ دور ہے، مجھے

آئے ہوئے عرصہ گزرا ہے ؛ آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تو جلد پہنچیں۔ وہ فلک ستائی فریب نہ جانتی تھی ، سوار ہوئی ۔ سوداگر نے گھوڑے پر بٹھا ، باگ اٹھائی ۔ قافلے کے پاس پہنچ کے کوچ کا حکم دیا ، آپ ایک سمت گھوڑا پھینکا۔ اُس وقت اُس نیک بخت نے داد بیداد ، فریاد مچائی ۔ تڑپی ، روئی پیٹی ، چلائی ۔ آہ و زاری اِس کی ، اُس بے رحم ، سنگ دل کی خاطر میں نہ آئی ۔

بادشاہ پہر بھر منتظر رہا ، پھر خیال میں آیا : خود چلیے ، دیکھیے وہاں کیا ماجرا ہوا ۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نکلا۔ ہر چند ڈھونڈھا ؛ نشان کے سوا قافلے کا سُراغ نہ ملا۔ دور گردِ سیاہ اُڑتی دیکھی ، جرس اور زنگ کی صدا سُنی۔ نہ پاؤں میں دوڑنے کی طاقت ، نہ بی بی کے چھوڑنے کی دل کو تاب ؛ سب طرح کا عذاب ۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار ۔ نہ خدا ترس ، نہ فریاد رس ۔ بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ یہ کہا ، مصحفی :

(1)
تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے ، تو ہم رہے

لاچار ، لڑکوں کو لے کر اُسی طرف چلا۔ چند گام چل کر اضطراب میں راہ بھول گیا۔ ایک ندی حائل پائی ، مگر کشتی نہ ڈونگی نہ ملاح ۔ نہ راہ سے یہ آشنا ، نہ وہاں سیاح کا گزارا۔ کنارے پر دریا کے خاک اُڑا کے ایک نعرہ مارا اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی تباہی پھرا ، رہ برِ کامل کو پکارا ؛ ساحِلِ مطلب سے ہم کنار

نہ ہوا، بیڑا پار نہ ہوا۔ مگر کچھ ڈھنڈھیانے کا ڈھب تھا، گو گھاٹ کڈھب تھا؛ ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو کندھے پر اُٹھا، دریا میں در آیا۔ نصف پانی بہ صد گرانی طے کیا تھا؛ کنارے کا لڑکا بھیڑیا اُٹھا لے چلا۔ وہ چلّایا، بادشاہ آواز سُن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا، کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مُضطَرِب جو ہُوا، خود غُوطے کھانے لگا؛ لیکن زندگی باقی تھی، بہ ہر کیف کنارے پر پہنچا۔ دل میں سمجھا: بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا، چھوٹا ڈوب کے مُوا۔ نیرنگیِ فلک سے عالَمِ حیرت، بی بی کے چُھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے اَلَم سے دل کباب، سلطنت دینے سے خستہ و خراب۔

اِسی پریشانی میں شُکر کرتا پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ درِ شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی، اُدھر آیا۔ اُس مُلک کا یہ دستور تھا: جب بادشاہ عازِمِ اِقلیمِ عَدَم ہوتا؛ اَرکانِ سلطنت، رُؤَسائے شہر وہاں آکر باز اُڑاتے تھے۔ جس کے سر پر بیٹھ جاتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چُنانچہ یہ رُوز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے، ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اِس بادشاہِ گدا صورت کا پہنچنا، باز اِس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے مُوافق حاضر ہوئے، تخت رُو بہ رُو آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا، کہا: مَیں گُم کردہ آشیاں سلطنت کے شایاں نہیں ہوں۔ میں نے اِسی عِلّت سے اپنے مَرزبُومِ شُوم کو چھوڑا ہے، حُکومت

سے مُنْہ مُوڑا ہے۔ مگر وہ لوگ اِس کے سر پر باز کا بیٹھنا، عَنْقا سمجھ، نہ باز رہے۔ جو جو شاہیں تھے تاڑ گئے، پَر بیں پہچان گئے کہ یہ مُقَرَّر ہُمائے اَوجِ سلطنت ہے۔ قصّہ مُختصر، رَگڑا جھگڑ تختِ طاؤس پر بِٹھا نَذریں دیں، تُوپ خانے میں شَلَّک ہوئی۔ بڑے تُزُک، حَشْمت سے آشیانۂ سلطنت، کاشانۂ دولت میں داخل کیا۔ تمام قَلَمرَو، نقد و جِنْس، اَشیاے بَحْری و بَرّی اِن کے تَحْتِ حکومت، قبضۂ تَصرُّف میں آیا۔ گز، سِکّے پر نام جاری ہوا۔ مُنادی نے نِدا دی، دُہائی پھر گئی کہ جو ظُلم و جَور کا بانی ہوگا؛ وہ لٹُورا، گردن مارا جائے گا، سزا پائے گا۔ سوزؔ:

پَل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نَشیں ①
کچھ اَچنبھا نہیں اِس کا کہ خدا قادِر ہے

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہیں؛ نہ اِعتمادِ سلطنت، نہ قیامِ غُربت و عُسرت۔ مرزا رفیعؔ:

عَجَب نادان ہیں، جن کو ہے عُجْبِ تاجِ سُلطانی ②
فلک بالِ ہُما کو پَل میں سونپے ہے مگس رانی

یہ سلطنت تو کرنے لگا مگر فَسُردَہ خاطِر، پَژمُردَہ دِل۔ بہ سَبَبِ شرم و حیا مُفَصَّل حال کسی سے نہ کہتا تھا، شب و روز غمگین و اَندُوہ ناک پڑا رہتا تھا۔ جب وہ بُلبُلِ ہزار داستاں یعنی فرزند، شَمعِ دُوْدماں یاد آتے تھے؛ دن کو پیشِ چشم اندھیرا ہو جاتا، ظِلِّ سُبحانی کُو، کُو کر کے نالہ و فریاد مچاتے تھے۔

اب اُن لڑکوں کا حال سُنیے ۔ جس کو بھیڑیا لیے جاتا تھا، اُدھر سے کوئی تیر اَندازِ سبک دَست آتا تھا؛ اُس نے چھُڑایا۔ دوسرا جو غوطے کھاتا تھا، بلبلاتا تھا؛ اُس کو ماہی گیر نے دامِ محبّت میں اُلجھایا، کنارہ دکھایا۔ وہ دونوں لاوَلَد تھے، اُسی شہر کے رہنے والے جہاں اِن لڑکوں کا باپ بادشاہ ہوا تھا۔ وہ اپنے اپنے گھر میں لا، بہ قدرِ مقدور لڑکوں کو پرورش کرنے لگے۔ جَلَّ جلالُہٗ! کیسا سنگِ تَفرِقَہ فلک نے پھینکا کہ ایک دوسرے کے سنگ نہ رہا، جُدا ہوگیا۔ چند عرصے تک بادشاہ نے ضبط کیا، آخر بیٹوں کی مُفارَقَت نے بے چین کیا؛ وزیر سے فرمایا: دو لڑکے قومِ شریف سے ہماری صُحبت کے قابل ڈھونڈھ کے لاؤ، ہمارا دل بہلاؤ۔ وزیر نے تمام شہر کے لڑکے طلب کیے ۔ حُکمِ حاکم مرگِ مُفاجات! وہ دونوں بھی آئے ۔ سُبحانَ اللہ! جامِعُ المُتَفَرِّقین بھی اُسی کا نام ہے؛ بچھڑے مِلانا اُس کے رُو بہ رُو کتنا کام ہے! بس کہ صورت و سیرت دونوں کو خالق نے عطا کی تھی، شاہ زادے تھے؛ وہی وزیر کو پسند آئے، رُو بہ رُو لایا۔ بہ سَبَبِ طوُلِ زَمانِ مُفارَقَت اور تکلیف و عُسرت نقشے بدل گئے تھے، قَطَع اَور ہوگئی تھی؛ نہ بادشاہ نے پہچانا، نہ تقاضائے سِن سے لڑکوں نے باپ جانا اور نہ یہ سمجھ آئی کہ ہم دونوں بھائی ہیں ۔ یہ بھی قدرت نُمائی ہے، بَہَم ہوئے مگر جُدا رہے؛ لیکن جوشِ خوں سے بادشاہ کا حال دِگرگوں ہوا، دونوں پر بہ محبّتِ تمام مصروفِ عنایت عَلَی الدَّوام رہا۔ سب نے سُنا ہے، کامل کا یہ نُکتہ ہے: کُلُّ اَمرٍ مَرْھُوْنٌ بِاَوْقَاتِہٖ۔ تھوڑے دن میں مُعتَمد و مُقَرَّب ہوئے۔

اور وہ سوداگر جو فَروشِ گَندُم نُما، دغا کا پُتلا یہاں کے پہلے بادشاہ سے رَسائی، عَمَلے سے شَناسائی رکھتا تھا؛ اِس نظر سے وہ بھی اُس عورتِ ناراض کو لے کر وہاں وارِد ہوا۔ خَبَرِ مَرگِ بادشاہ سُن کر ملول ہوا کہ مطلب نہ حُصول ہوا۔ لوگوں نے کہا: بادشاہِ تازہ اُس سے زیادہ خَلیق و غریب پَروَر ہے۔ بہ وَساطَتِ وزیرِ اعظم تُحفہ تُحفہ تحائِف لے کے حُضور میں حاضر ہوا، نَذر گُزرانی، شَرَفِ عَتَبَہ بُوس حاصل ہوا۔ ایک نظر تو دیکھا تھا، بادشاہ نے نہ پہچانا، نہ سوداگر نے حریف جانا؛ مگر بادشاہ اُس کو ذی اِعتبار، سَیّاحِ دِیار دِیار سمجھ بیش تر اَطراف و جَوانِب کا مذکور سُنتا تھا۔

ایک دن قریبِ شام حُضور میں حاضر تھا، بادشاہ نے فرمایا: آج کی شب گھر نہ جا، کچھ دیدہ و شَنیدہ حکایت ہم کو سُنانا۔ وہ بیٹھا تو مگر مُکَدَّر، پریشان۔ بادشاہ نے تَرَدُّد کا سبب پوچھا۔ یہ باعِثِ عنایت فی الجُملہ گُستاخ ہو چلا تھا، دست بَستہ عرض کی: خانہ زاد کے پاس ایک عورتِ ناراض ہے، اُس کو فِدوی سے اِغماض ہے؛ اُس کی نگہ بانی، حفاظت بہ ذاتِ خود کرتا ہوں۔ بہ مرتبہ ڈرتا ہوں ایسا نہ ہو، نکل کے رازِ پنہاں فاش کرے، حمایتی تلاش کرے۔ حُکم ہوا: یہ مُقَدَّمہ آج ہمارے ذِمّے ہے۔ وہی لڑکے بس کہ مُعتَمَد تھے؛ خاص دستہ اُن کے ہمراہ کر، پاسبانی کی تاکیدِ اَکید کی۔ لڑکے آداب بجا کے، سوداگر کے مکان پر گئے۔ باغ میں خَیمہ

برپا تھا، درِ خیمہ پر کُرسی بچھا دونوں بیٹھے۔ پاسبان آس پاس پھرنے لگے۔
جب آدھی رات گزری، ایک کو نیند آنے لگی۔ دوسرے نے کہا:
سونا مناسب نہیں؛ ایسا نہ ہو کوئی فتنہ خوابیدہ جاگے، خیمے
سے کوئی چونک بھاگے۔ وہ بولا: تو ایسا فسانہ کہو جو نیند اُچٹنے کا
بہانہ ہو۔ اُس نے کہا: خیر، آج ہم اپنی سرگذشت کہتے ہیں؛ اگر
غور سے سُنو گے؛ نیند کیا، کئی روز بھوک پیاس پاس نہ آئے گی، عبرت
ہو جائے گی۔ اے عزیزِ باتمیز! میں بادشاہِ یَمَن کا لعل ہوں۔ میرا باپ
لِلّٰہ سلطنت سائل کو دے؛ مجھے اور ایک میرا چھوٹا بھائی کہ
وہ تم سے بہت مُشابِہ تھا، اُس کو اور اپنی بی بی کو ہمراہ لے کر،
غریبُ الوطن ہوا تھا۔ راہ میں ایک سوداگر فریب سے شہ زادی
کو لے گیا، ہم دونوں بھائی ساتھ رہے۔ آگے چل کر دریا ملا۔
ناو، بیڑا کچھ نہ تھا۔ بادشاہ مجھ کو کنارے پر بٹھا، چھوٹے کو
کنارِ شفقت میں اُٹھا، کندھے پر چڑھا پار چلا۔ مجھے بھیڑیے نے پکڑا۔ میرے چلّانے
سے بادشاہ جو بدحواس ہوا، بھائی دوش پر سے آغوشِ دریا
میں کھسک پڑا۔ خود غوطے کھانے لگا۔ پھر نہیں معلوم کیا گزرا۔
مجھے تیر انداز نے دہنِ گُرگ سے چھڑایا، اب فلک اِس بادشاہ
پاس لایا۔

وہ رُو کر لپٹ گیا، کہا: بھائی! دریا میں ہم گرے تھے،
مچھلی والوں کے باعث ترے تھے۔ پھر تو دونوں بغل گیر ہو ایسے

چلّائے کہ وہ عورت نیند سے چونک پڑی۔ پردے کے پاس آ کے حال پوچھنے لگی۔ اُنھوں نے اِبتدا سے اِنتہا تک وہ داستانِ مُصیبت بیان کی۔ وہ پردہ اُلٹ جھٹ پٹ لڑکوں سے لپٹ گئی، کہا: ہم اب تک سوداگر کی قید میں مجبور ہیں، سب سے دور ہیں۔ اُسی دم یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ سواری جلد بھیجی، رو بہ رو طلب کیا۔ اُس وقت باہَم دِگر سب نے پہچانا۔ فوراً سوداگر کو قید کیا۔ باقی رات مُفارقت کی حکایات میں گزر گئی۔ صُبح دَم جلّادِ سپہر یعنی بے مِہر مِہر جب شمشیرِ شُعاع کھینچ کر ہنگامہ پَردازِ عالَم ہوا، سوداگر کو کاروانِ عَدَم کا ہَم سفر کر کے بارِ ہستی سے سُبک دوش کیا۔

یَمَن میں اخبار نویسوں نے یہ حال لکھا۔ وہاں عجب ہر بُونگ مچا تھا۔ وہ سائلِ ستم شِعار بہ درجہ ظلم پیشہ و جفا کار نکلا۔ رعیّت نالاں، اَرکانِ سلطنت ہِراساں رہتے تھے، ہزاروں رنج رات دن سہتے تھے۔ جب یہ خبر وہاں پہنچی، وزیر نے بہ صلاحِ رئیسانِ شہر زہر دے کر اُسے مارا۔ تَلخ کامی سے سب کو نَجات ملی۔ اور عَرضداشت اپنے بادشاہ کو لکھی، تمنّائے قدم بُوس تمام شہر کی تحریر کی۔ بادشاہ کے بھی مَحبّتِ وطن دل میں جوش زَن ہوئی۔ سفر کی تیّاری ہونے لگی۔ قِطْعَہ:

حُبِّ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر — خارِ وطن از سُنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی میکرد — میگفت: گدا بودنِ کنعاں خوشتر

اَلقِصّہ یَمَن میں آیا۔ دونوں سلطنتیں قبضے میں رہیں۔

جب بندر نے فَسانہ تمام کیا، پھر کہا کہ اے نیک بَخت! مطلب اِس کہانی سے یہ تھا کہ جو بادشاہ عاشقِ اللہ، خُدا پر شاکر تھا، ایک

سلطنت دی، دُوپائیں۔ یہ دونوں بدبخت جو لالچی تھے، اِنھوں نے جانیں گنوائیں۔ قیامت تک مطعونِ خلائق رہیں گے۔ جتنے نیک ہیں؛ یہ قصہ سُن کر، بد کہیں گے۔ رنڈی اِن باتوں سے برتر رحم ہوئی، بندر کی تسکین کی، کہا: تو خاطر جمع رکھ؛ جب تک کہ جیتی ہوں، تجھے بادشاہ کو نہ دوں گی، فاقہ قبول کروں گی۔ پھر اُسے رُوٹی کھلا، پانی پلا، کھٹّڑی میں لِٹا، سُو رہی۔

صُبح کو چِڑیمار اُٹھا، بندر کے لے جانے کا قصد کیا۔ عورت نے کہا: آج اَور قسمت آزما، پھر جانور پکڑنے جا۔ جو رُوٹی میسّر آئے تو کیوں اِس کی جان جائے؛ ہم پر ہتّیا لگے، بدنامی آئے۔ نہیں تو کل لے جانا۔ وہ بولا: تو اِس کے دَم میں آگئی۔ بندر نے کہا: ماشاءَ اللہ! رنڈی تُو خدا پر شاکر ہے، تو مرد ہوکر مُضطر ہے؟ پاجی تو زن مُرید ہوتے ہی ہیں، پھر وہ پٹنگ جھٹک؛ جال، پھنکی اُٹھا؛ لاسا، کُمپالے؛ ٹٹّی کندھے سے لگا گھر سے نکلا۔ یا تو دن بھر خراب ہوکر دو تین جانور لاتا تھا؛ اُس رُوز دُوپہر میں پچاس ساٹھ ہاتھ آئے، پھنکی بھر گئی۔ خوش خوش گھر پھرا۔ کئی روپے کو جانور بیچے۔ آٹا، دال، نُون، تیل، لکڑی خرید، تھوڑی مٹھائی لے، بھٹّی پر جا کے ٹکے کا ٹھرّا پیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جھومتے، گیت گاتے گھر کا رستہ لیا، مُفلسی کا غم بچہ بھول گئے۔ جُورُو سے آتے ہی کہا: اَری! ہنومان جی کے کدم،

بڑے بھاگوان ہیں۔ بھگوان نے دَیا کی، آج رُپیّا دلوائے، اِتنے جانور ہاتھ آئے۔ وہ گھر بَسی بھی بہت ہنسی۔ پہلے مٹھائی بندر کو کھلائی؛ پھر رُوٹی پکا، آپ کھا، کچھ اُسے کِھلا، پڑ رہی۔ بندر بچارا سمجھا: چَندِے پھر جان بچی، جو فلک نہ جل مرے اور اِس کا بھی رشک نہ کرے۔ مُؤلّف:

کیا شاخِ گُل پہ پھول کے بیٹھی ہے عَندَلیب
ڈرتا ہوں مَیں، نہ چشمِ فلک کو بُرا لگے

جب لایا، بارِ یاس ہی لایا یہ، اے سُرور
گا ہے نہ نَخلِ غم میں ثَمَر اِس سِوا لگے

اب روز بہ روز چڑیمار کی ترقّی ہونے لگی۔ تھوڑے دنوں میں گھر بار، کپڑا لتّہ گہنا پاتا درست ہو گیا۔ قضارا، کوئی بڑا تاجر سرا میں اُس بھٹیاری کے گھر میں اُترا، جس کی دیوار تلے چڑیمار رہتا تھا۔ ایک روز بعدِ نمازِ عشا سوداگر وظیفہ پڑھتا تھا؛ ناگاہ آوازِ خوب، صدائے مرغوب، جیسے لڑکا پیاری پیاری باتیں کرتا ہے، اُس کے کان میں آئی۔ بھٹیاری سے پوچھا: یہاں کون رہتا ہے؟ وہ بولی: چڑیمار۔ سوداگر نے کہا: اُس کا لڑکا خوب باتیں کرتا ہے۔ بھٹیاری بولی: لڑکا بالا تو کوئی بھی نہیں، فقط جورو خصم رہتے ہیں۔ سوداگر نے کہا: اِدھر آ، یہ کس کی آواز آتی ہے؟ بھٹیاری جو آئی، لڑکے کی آواز پائی۔ وہ بولا: اِس صدا سے بُوئے درد

پیدا ہے ؛ اِس کو میرے پاس لا، باتیں کروں گا۔ کچھ لڑکے کو دوں گا اور تیرا بھی مُنہ میٹھا کروں گا۔

بھٹیاری چڑیمار کے گھر گئی۔ دیکھا: بندر باتیں کرتا ہے۔ اِسے دیکھ چُپ ہو رہا۔ وہ دونوں بھٹیاری کے پاؤں پر گر پڑے، مِنّت کرنے لگے، کہا: ہم نے اِسے بچّوں کی طَرَح پالا ہے، اپنا دُکھ ٹالا ہے۔ شہر پُرآشُوب ہو رہا ہے، بندر کُش بادشاہ اُترا ہے، ایسا نہ ہو، یہ خبر اُڑتے اُڑتے اُسے پہنچے ؛ بندر چِھن جائے، ہم پر خرابی آئے۔ وہ بولی : مجھے کیا کام جو ایسا کلام کروں۔ سَرا میں آ کے سوداگر سے کہا: وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس نے کہا : دیوانی ! ابھی وہ آواز کس کی تھی ؟ یہ غور سُنیے کہ کیا معقول جواب وہ نامعقول دیتی ہے : بَلَیّاں لوں، بھلا مجھے کیا غَرَض جو کہوں : بندر بولتا ہے۔ سوداگر خوب ہنسا، پھر کہا : تو سِڑَن ہے، اری بندر کہیں بولا ہے ! پھر بولی : جی گریب پَرَوَر ! صدقے گئی ؛ اِسی سے تو مَیں بھی نہیں کہتی ہوں کہ بندر بولتا ہے، اور چڑیمار کی جورو نے بتانے کو منع کیا ہے۔ سوداگر کو سخت خَلجان، بہ مرتبہ خَفَقان ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے ! مکان قریب تھا، خود چلا گیا۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک عورت، دوسرا مردِ مُچھَنْدَر، تیسرا بندر ہے۔ یقینِ کامل ہوا یہی بندر بولتا تھا، بھٹیاری سچّی ہے، گو عقل کی کچّی ہے۔ وہ سوداگر کو دیکھ کے بندر کو چھپانے لگے، خوف سے تھرّانے لگے۔ اِس نے کہا: بھید کُھل گیا، اب پوشیدہ کرنا اِس کا لاحاصل ہے۔ مَصلَحت یہی ہے، بندر

ہیں دو۔ جو اِحتیاج ہو، اِس کے جِلدو میں تُو۔ نہیں تو بادشاہ سے اِطّلاع کروں گا؛ یہ بے چارہ مارا جائے گا، چھپانے کی علّت میں تمھارا سِر اُتارا جائے گا، میرا کیا جائے گا۔ وہ دونوں رُونے پیٹنے لگے۔ بندر سمجھا: اب جان نہیں بچتی، اِتنی ہی زِیست تھی؛ چڑیمار سے کہا: اے شخص! فَلَکِ کَج رفتار، گَردُونِ دَوّار نے اِتنی جفا پر صبر نہ کیا، یہاں بھی چَین نہ دیا؛ مناسب یہی ہے رَضائے اِلٰہی پر راضی ہو، مجھے حوالے کردو۔ قضا آئی، ٹلتی نہیں۔ تقدیر کے آگے کسی کی تدبیر چلتی نہیں۔ فَردِ بَشَر کو حُکمِ قضا و قَدَر سے چارہ نہیں، اِس کے ٹال دینے کا یارا نہیں۔ اِذَاجَآءَ اَجَلُھُمْ لَایَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَایَسْتَقْدِمُوْنَ۔

چڑیمار نے کہا: دیکھو بندر کی ذات کیا بے وفا ہوتی ہے! ہماری محنت وَمَشَقّت پر نَظَر نہ کی، توتے کی طرح آنکھ پھیر لی، سوداگر کے ساتھ جانے کو راضی ہو گیا۔ بڑا آدمی جو دیکھا، ہمارے پاس رہنے کا مطلق پاس نہ کیا۔ بندر نے کہا: اگر نہ جاؤں، اپنی جان کھوؤں، تم پر خرابی لاؤں۔ آخر کار بہ ہزار گریہ و زاری سوداگر سے دونوں نے قَسَم لی کہ بادشاہ کو نہ دینا، اچھی طرح پَرَوَرِش کرنا۔ یہ کہہ کر بندر حوالے کیا۔ سوداگر نے اِس کے عِوَض بہت کچھ دیا۔ بندر کو سَرا میں لا، پیار کیا، بہ دل داری و نرمی حال پوچھا۔ بندر نے یہ چند شعر حَسْبِ حال، سَوْدا کے، سوداگر کے رُو بہ رُو پڑھے، مرزا رفیع:

(1)
نے بلبلِ چمن، نہ گُلِ نَودمیدہ ہوں　　میں مَوسِم بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں
گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بہ شکلِ جام　　اِس مے کدے کے بیچ عَبَث آفریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سَودا! بہ قولِ دَرد　　جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

اے عزیز! آتشِ کارواں، نقشِ پائے یارانِ رَفتگاں ظاہر ہوں؛ مگر پنہاں ہوں بلبلِ دُور اَز گُلزار، گُم کردہ آشیاں؛ صیاد آمادۂ بیداد، گھات میں باغباں؛ کیوں کر نہ سرگرمِ فغاں ہوں۔ حضرتِ عشق کی عِنایت ہے، اَحبابِ زمانہ کی شکایت ہے، طُرفہ حکایت ہے کہ حاجت رَوائے عالَم، محتاج ہے۔ تخت ہے نہ اَفسر ہے، نہ وہ سر ہے نہ تاج ہے۔ غریبِ دِیار، چرخ مؤجدِ آزار۔ شفیق و مہرباں نہیں، حالِ زار کا کوئی پُرساں نہیں۔ حیرت کا کیوں نہ مُبتَلا ہوں، اپنے ہاتھ سے اَسیرِ دامِ بلا ہوں۔ خود گرفتارِ پنجۂ ستم ہوا؛ کبھی مجھے جن کا اَلَم تھا، اب اُنھیں میرا غم ہوا۔ مرنے سے اِس لیے ہم جی چھپاتے ہیں کہ ہمدم میرے فراق میں مُوئے جاتے ہیں۔ مجھے دامِ مکر میں اُلجھایا، دوستوں کو میرے دشمن کے پھندے میں پھنسایا، گردشِ چرخِ ستم گار سے عجیب سانحۂ ہوش رُبا سامنے آیا۔ میر تقی:

(2)
سخت مشکل ہے، سخت ہے بیداد　　ایک مَیں خوں گرِفتہ، سو جلّاد
کوئی مُشفق نہیں جو ہووے شفیق　　بے کَسی چُھٹ، نہیں ہے کوئی رفیق
آہ، جو ہمدمی سی کرتی ہے　　اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثَبات　　ایک مَیں اور ہزار تَصدیعات

مصرع : گویم ، مشکل وگرنگویم ، مشکل۔

مگر آج خوش قسمتی سے آپ سا قدرداں ہاتھ آیا ہے ، اِنتشارِ طبیعت برطرف ہو تو بہ دلِ جمعیِ تمام ، آغاز سے تا انجام اپنی داستانِ غم، سانحۂ ستم گزارش کروں گا۔ سوداگر کے ، اِس مضمونِ درد ناک سے ، آنسو نکل پڑے ، سمجھا : یہ بندر نہیں ، کوئی فصیح و بلیغ ، عالی خاندان ، والا دُودمان سحر میں پھنس گیا ہے ، کہا : اطمینانِ خاطر رکھ ، تیری جان کے ساتھ میری جان ہے ، اب زیست کا یہی سامان ہے۔ بندر کو تسکینِ کامل حاصل ہوئی۔ غزلیں پڑھیں ، نقل و حکایات میں سرگرم رہا ، اپنا حال پھر کچھ نہ کہا۔ تمام شب سوداگر نہ سویا ، اِس کے بیانِ جاں کاہ پر خوب رُویا۔

اب بہت تعظیم و تکریم سے بندر رہنے لگا۔ مگر اَمرِ شُدَنی بہ ہر کیف ہُوا چاہے۔ راز فاش ہو ، اگر خُدا چاہے۔ سوداگر کا یہ انداز ہوا : جو شخص نیا اِس کی ملاقات کو آتا ، اُسے بندر کی باتیں سُنواتا۔ اُس کو اِستعجاب سے فکر ہوتا ، اِس کا ہر جگہ ذِکر ہوتا۔ آخرش ، اِس کی گُویائی کا چرچا کوچہ و بازار میں مچا اور یہ خبر اُس کُور نمک ، مُحسن کُش کے گُوش زد ہوئی۔ سُنتے ہی سمجھا یہ وہی ہے ، بعدِ مُدّت فلک نے پتا لگایا ، اب ہاتھ آیا۔ فوراً چوبدار بندر کے لینے کو ، سوداگر کے پاس بھیجا۔ یہ بہت گھبرایا۔ اَور تو کچھ بَن نہ آیا ، بہ صد عجز و نیاز عرضداشت کی کہ غلام صاحبِ اَولاد نہیں ، اِس اَندوہ میں

دلِ مُضطر شاد نہیں۔ طبیعت بہلانے کو اِسے بچّہ سا لے کر فرزندوں کی طرح بڑی مَشقت سے پالا ہے، رات دن دیکھا بھالا ہے۔ بندر ہے، مگر عنقا ہے۔ مُفارَقت اِس کی خانہ زاد کی جان لے گی، آیندہ جو حضور کی مرضی۔

چُوبدار یہاں سے خالی پھرا، وہ ظالِم اَظْلَم غَضَب میں بھرا، وہاں کے بادشاہ کو لکھا کہ اگر سلطنت اور آبادیِ مَملکت اپنی منظور ہو، سوداگر سے جلد بندر لے کر یہاں بھیج دو۔ نہیں تو اینٹ سے اینٹ بجادوں گا، نام و نشاں مِٹا دوں گا۔ یہ خَبَرِ وحشت اَثَر سُن کے غَضَنْفر شاہ مُتَرَدِّد ہوا۔ مُشیرانِ خوش تدبیر، امیر وزیر سمجھانے لگے کہ خُداوندِ نعمت! ایک جانور کی خاطر آدمیوں کا کُشْت و خوں زبوں ہے۔ حکم ہوا: کچھ لوگ سرکاری وہاں جائیں؛ جس طرح بنے، سوداگر سے پکڑ کر، بندر اُس کی ڈیوڑھی پر پہنچائیں۔ جب بادشاہی خاص دستہ سَرا میں آیا؛ بندر دست بَستہ یہ زَبان پر لایا کہ اے مؤنسِ غم گُسار، وفا شِعار! اِس اَجَل رَسیدہ کے باب میں کَد و کوشش بے کار ہے، سَراسَر بیجا ہے۔ قضا کا زمانہ قریب پہنچا، دَرِ ناکامی وا ہے۔ مَبادا، کسی طرح کا رنج میری دوستی میں تمھارے دشمنوں کو پہنچے؛ تو مجھے حَشْر تک حِجاب و نَدامت رہے، خلقِ خُدا یہ ماجرا سُن کے بُرا بھلا کہے۔ سوداگر نے کہا: اَسْتَغْفِرُاللہ، یہ کیا بات ہے! جو کہا، وہ سر کے ساتھ ہے۔

جب بادشاہ کے لوگوں کا تقاضاے شدید ہوا اور دن بہت کم رہا؛ بعدِ رَدّ و قدح، بہ معذرتِ بسیار و منّتِ بے شمار، ہزار دینار دے کے اُس شب مُہلت لی اور صُبح کے چلنے کی ٹھہری، بہ مؤجبِ مَثَل، مصرع:

زر بر سَرِ فولاد نِہی، نرم شود

اِس عرصے میں یہ حالِ تباہ، ماجراے جاں کاہ گلی کوچے میں زبانِ زَدِ خاص و عام ہوا کہ ایک بندر کسی سوداگر کے پاس باتیں کرتا تھا، وہ بھی کل مارا جائے گا۔ بہ حدّے کہ اُس کُشتۂ اِنتظار، مایوسِ دل فِگار یعنی ملکہ مہر نگار کو بھی معلوم ہوا۔ وہ شیداے جانِ عالم سمجھی کہ یہ بندر نہیں، شہ زادہ ہے۔ افسوس! صد ہزار افسوس! اب کون سی تدبیر کیجیے جو اِس بے کس کی جان بچے! دل کو مَسُوس، وزیر زادے کو کُوس، لوگوں سے پوچھا: دَمِ سَحَر کدھر سے وہ سوداگر جائے گا؟ یہ تماشا ہمارے دیکھنے میں کیوں کر آئے گا؟ لوگوں نے عرض کی: حُضور کے جھَرُوکے تلے شاہراہ ہے، یہی ہر سِمت کی گُذَرگاہ ہے۔ یہ سُن کے تمام شب تڑپا کی، نیند نہ آئی۔ دو گھڑی رات سے برآمدے میں برآمد ہوئی اور ایک توتا پنجرے میں پاس رکھ لیا۔ گجر سے پیش تر بازار میں ہُلّڑ، تماشائیوں کا مِیلا سا ہو گیا۔ جس وقت تاجرِ ماہ نے مَتاعِ انجم کو نِہاں خانۂ مغرب میں چھپایا اور خُسرَوِ زرّیں کُلاہ نے بندرِ مشرق سے نکل کر تختِ زَنگاری پر جُلوس فرمایا؛ سوداگر نمازِ صُبح پڑھ کر ہاتھی پر سوار

ہوا۔ کمر میں پیش قبض رکھ، گود میں بندر کو بٹھا، مرنے پر کمر مضبوط باندھ کر مجبور چلا۔ بندر سے کہا: پریشان نہ ہو، جب تقریر سے اور اِصرافِ کثیر سے کام نہ نکلے گا؛ جو کچھ بن پڑے گا، وہ کروں گا۔ اپنے جیتے جی تجھے مرنے نہ دوں گا۔ قولِ مرداں جاں دارد۔ اور، مصرع:

بعد از سرِ من کُن فیکوں شُد، شُدہ باشد

سوداگر کا سراسیمہ آگے بڑھنا کہ خلقت نے چار طرف سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطِب ہوکے یہ کہنے لگا، میر سوز:

برقِ تپیدہ، یا شَرَرِ بَرجہیدہ ہوں
جس رنگ میں ہوں مَیں، غرض از خود رمیدہ ہوں (1)

اے اہلِ بزم! مَیں بھی مُرقّع میں دہر کے
تصویر ہوں، ولے لبِ حسرت گزیدہ ہوں

صیّاد! اپنا دام اُٹھالے کہ جوں صبا
ہوں تو چمن میں، پر گُلِ عشرت نچیدہ ہوں

اے آہ و نالہ! مجھ سے نہ آگے چلو کہ مَیں
بچھڑا ہوں کارواں سے، مسافر جریدہ ہوں

غم ہوں، الم ہوں، درد ہوں، سوز و گداز ہوں
سب اہلِ دل کے واسطے مَیں آفریدہ ہوں

صاحبو! دُنیاے دُوں، نیرنگیِ زمانۂ سِفلہ پرور، بوقلموں

عبرت و دید کی جا ہے۔ گرما گرم آیندہ رَوِندہ کا بازار ہے۔ کس و ناکس جنسِ ناپایدار، لہو و لعب کا خریدار ہے۔ اپنے کام میں مصروف قضا ہے۔ جو شَے ہے، ایک روز فنا ہے۔ معاملاتِ قضا و قدر سے ہر ایک ناچار ہے، یہی مسئلۂ جبر و اختیار ہے۔ کوئی کسی کی عداوت میں ہے، کوئی کسی کا شیدا ہے۔ جسے دیکھا، آزاد نہ پایا؛ کسی نہ کسی بکھیڑے میں مبتلا ہے۔ ایک کو اِتنا سوجھتا نہیں کیا لین دین ہو رہا ہے۔ سُود کی اُمید میں سَراسَر زِیاں ہے؛ بِرَہنہ ہونے کا سودا ہے۔ اُس کی قُدرتِ ناطِقہ دیکھو: مجھ سے ناچیز، بے زباں کو یہ تکلّفِ گویائی عنایت کیا؛ تم سب کا سامعوں میں چہرہ لکھ دیا، باتیں سُننے کو ساتھ چلے آتے ہو۔ جُدائی میری شاق ہے، جو ہے وہ مشتاق ہے، حالِ زار پر رحم کھا آنسو بہاتے ہو۔ یہ رحیمی کی صفت ہے؛ شانِ قہّاری دیکھو: اُسی تقریر کی دھوم سے، ایک ظالمِ شوم سے مجھ مظلوم کا مُقابلہ ہوتا ہے۔ یقینِ کامل ہے کہ وہ قتل کرے گا، بے گُناہ کے خون سے ہاتھ بھرے گا۔ سَوادُ الوَجْہِ فِی الدّارَیْن ہو گا، تب اُسے آرام اور چین ہو گا۔ یہ گُویائی، گُویا پیامِ مرگ تھا۔

دُنیا جائے آزمایش ہے۔ سَفیہ جانتے ہیں یہ مقام قابلِ آرام و آسایش ہے۔ دو رُوزہ زیست کی خاطر کیا کیا ساز و ساماں پیدا کرتے ہیں۔ فرعونِ باساماں ہو کے زمین پر پاؤں نہیں دھرتے

ہیں۔ جب سر کو اُٹھا آنکھ بند کرکے چلتے ہیں، خاکساروں کے سر کچلتے ہیں۔ آخر کار حسرت و ارماں فقط لے کر مرتے ہیں۔ جان اُس کی جُستجو میں کھوتے ہیں جو شے ہاتھ آئے ذِلّت سے، جمع ہو پریشانی و مَشقّت سے، پاس رہے خسّت سے، چھوٹ جائے یاس و حسرت سے۔ پھر سر پہ ہاتھ دھر کر روتے ہیں۔ صُبح کو کوئی نام نہیں لیتا ہے، جو کسی اور نے لیا تو گالیاں دیتا ہے۔ ناسخ:

دُنیا اک زالِ بیسوا ہے بے مِہر و وفا و بے حیا ہے (1)
مَردوں کے لیے یہ زن ہے، رہ زن دنیا کی عدو ہے، دیں کی دشمن
رہتی نہیں ایک جا پہ جم کر پھرتی ہے بہ رنگِ نَرد گھر گھر

انجامِ شاہ و گدا دو گز کفن اور تختۂ تابوت سے سوا نہیں۔ کسی نے اَدھر سا، یا محمودی کا دیا، یا تحریرِ کربلا؛ کسی کو گزی گاڑھا مُیسّر ہوا بہ صَد کرب و بَلا۔ اُس نے صندل کا تختہ لگایا، اِس نے بیر کے چیلوں میں چھپایا۔ کسی نے بعد سنگِ مَرمَر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مَرمَر کے گُور گڑھا پایا۔ کسی کا مزار مُطلّا، مُنقّش، زنگار رنگ ہے۔ کسی کی، مانندِ سینۂ جاہل، گُور تنگ ہے۔ حسرتِ دنیا سے کفن چاک ہوا، بستر دونوں کا فرشِ خاک ہوا۔ نہ امیر سمّور و قاقُم کا فرش بچھا سکا، نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا بُوریا لا سکا۔ بعدِ چندے، جب گردشِ چرخ نے گُنبد گرایا، اینٹ سے اینٹ کو بجایا؛ تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گُورِ شاہ ہے، یہ لَحدِ فقیر ہے۔ اِس کو مَرگِ جوانی نصیب ہوئی، یہ اُستخوانِ بُوسیدۂ پیر ہے۔ سو یہ بھی

خوش نصیب، نیک کمائی والے گور گڑھا، کفن پاتے ہیں؛ نہیں تو سیکڑوں ہاتھ رکھ کر مرجاتے ہیں، لوگ "درگور" کہ کر چلے آتے ہیں۔ کُتّے بِلّی، چیل کوّے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دامنِ دَشتِ عُریاں کفن، گور بےچراغ، صحرا کا صحن ہوتا ہے۔ یاس وحسرت کے سوا کوئی نہ سِرھانے رُوتا ہے۔ تمنّا چھُٹ کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے۔

سالہا مقبروں کی عماراتِ عالی اور ساز و ساماں کی دیکھا بھالی میں سَریعُ السَّیر رہے، ہزاروں رنج گورِ بےچراغِ غَریباں کی دید میں بیٹھے بِٹھائے سہے؛ طُرفہ نقل ہے کہ والی وارث اُن کے سَریرِ سلطنت، مسندِ حکومت پر شب و روز جلوہ افروز رہے؛ مگر تنبیہِ غافلوں کو، قُدرتِ حق سے، گنبدوں میں آشیانۂ زاغ و زَغن، میناروں پر مَسکنِ بُومِ شوم، قبروں پر کُتّے لُوٹتے دیکھے۔ میرؔ:

مزارِ غریباں تماشے کی جا ہے وہ سُوتے ہیں، پھرتے جو کل جابجا تھے (1)

رنگِ چمن صرفِ خزاں دیکھا۔ ڈھلا ہوا حُسنِ گُل رُخاں دیکھا۔ اگر گُلِ خنداں پر جُوبن ہے، بہار ہے؛ غور کیا تو پہلوے نازنیں میں نَشتر سے زیادہ خَلِشِ خار ہے، گِریاں اُس کے حال پر بُلبلِ زار ہے۔ دُنیا میں دن رات زَق زَق بَق بَق ہے۔ کوئی چہچہے کرتا ہے، کسی کو قلق ہے۔ نُوش کے ساتھ گزَندِ نیش ہے۔ ہر رہ رَو کو کڑی منزل درپیش ہے۔ ایک فقیر کے اِس نکتے نے بہت جی کُڑھایا، مگر سب کو پسند آیا کہ بابا! دن تھوڑا، سر پر بوجھ بھاری، منزل دور ہے؛ مسافر کے پاؤں میں حرص کے چھالے، ہوس کی بیڑیاں، غفلت کا نشہ،

راہ بے دیکھی، راہ بر ناپیدا؛ لیکن چلنا ضرور ہے۔ مؤلّف:

بلبل کو خزاں میں جان کھوتے پایا صیّاد کو سر پٹک کے رُوتے پایا
گُل چیں کی بھی نیند اُڑ گئی، لیک سرور جو اَہلِ دِوَل تھے، اُن کو سوتے پایا

مدّتوں صدائے مُرغِ سحر کے رنج اُٹھائے؛ کبھی دم نہ مارا، شکوہ لب پر نہ لائے۔ برسوں ندائے اَللّٰہُ اَکۡبَر کے صدمے سہے؛ شُکر کیا، چُپ رہے۔ مہینوں گجر کی آواز نے دم بند کیا؛ قلق جی پر لیا، نالہ نہ بلند کیا۔ سوچے تو وصلِ مہ رُویاں خوابِ شب تھا۔ لطف اُن کا عینِ غضب تھا۔ تمام عالم کی خوب سیر کی؛ کبھی حرمِ مُحترَم میں مسکن رہا، گاہ دھونی رمائی کُنشت و دَیر کی۔ عالم سے آیہ، فاضل سے حدیث، ناصح سے پند سُنا۔ ناقوسِ برہمن سُن سُن بُت ہو گئے، سر دُھنا۔ وہ بدکیش: مانعِ مِلّتِ صنم، لُطفِ زیست، حظِّ نَفس کا دشمن تھا۔ یہ کوتہ اَندیش: رَخنہ پردازِ اَہلِ ایماں، دین کا رہ زن تھا۔ تامّل کیا تو اِن دونوں سے دور حسد، بُغض، بَیر ہونا معلوم۔ اپنے نزدیک اِن کا انجام بہ خیر ہونا معلوم۔ وَاللّٰہُ اَعلَم یہ لوگ کیا سمجھے! خود اچھّے ٹھہرے، اَور کو بُرا سمجھے۔ مطلب کی بات ہَیہات دونوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ اِفراط تفریط نے گونگا بہرا کیا، لوگوں کو بے بَہرہ کیا، ذلّت دلوائی۔ سب سے بہتر نظر آیا کُنجِ تنہائی۔ مؤلّف:

اچھے کو بُرا، بُرے کو اچھا سمجھے کتنی یہ بُری سمجھ ہے، اچھا سمجھے

دُنیا فقط راہ گُذر ہے۔ ہر دم مثالِ تارِ نَفس در پیش سفر ہے۔

تا زیست ہزاروں مفسدے ہیں، ڈر ہے۔ مرنے کے بعد باز پُرس مدِ نظر ہے کسی طرح انسان کو مفر نہیں۔ کون سا نفع ہے، جس کی تلاش میں بے سود ضرر نہیں۔ حاصلِ کار یہ ہے: دُنیا کی محبّت دل سے کم کرے، کسی کے جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم کرے، تا مقدور خاطرِ فردِ بشر نہ برہم کرے! وگرنہ، شعر:

نیم شبے آہ زند پیرِ زال   دولتِ صد سالہ کند پایمال

دل شکستہ کی دِل داری، پا فتادہ کی مددگاری کرے۔ ہوا و ہوس جو دل سے دور ہو جائے، تو مال سے یا کمال سے عُجب و نخوت نزدیک نہ آئے۔ عنایتِ ایزدی پر قانع ہو۔ شکرِ ہر نعمت، سپاسِ خدمت کر کے، مَنہیات کا مانع ہو۔ رنج کا حامل رہے، سب رنگ میں شامل رہے۔ زمانے کے مکروہات سے گھبرائے نہیں۔ صحبتِ غیر جنس سے نفرت کرے، تو بدنامی پاس آئے نہیں۔ دولت کا اعتبار کیا، مفلسی سے ننگ و عار کیا۔ ایک دن مرنا ہے، جینا مستعار ہے، اِس پر کس کا اختیار ہے۔ نیک عمل کا خیال رکھے کہ قیدِ ہستی زیست کا نام ہے۔ رہائی ایک دن یہاں سے انجام ہے۔ با ہمہ بے ہمہ رہنے میں مزہ ہے، باقی بکھیڑا ہے۔ شعر:

کسی کی مرگ پر اے دل نہ کیجے چشم تر ہرگز①
بہت سا روئیے اُن پر جو اِس جینے پہ مرتے ہیں

عُمرِ خضر کی تمنّا اور حشمتِ خسرو، خزانۂ قاروں کی فکر میں ہر ایک صباح و مسا ذلیل و خوار ہے۔ تحصیل لاحاصل ہے، کوشش اِس

اَمر میں سراسر بے کار ہے۔ بہ قولِ ناسخ:

ہاتھ آتی ہے کب علم و ہُنر سے دولت ملتی ہے قضا اور قدر سے دولت ①
جو علم و ہُنر رکھتے ہیں، وہ ہیں محروم مانوس ہے بَل اَحمق و خَر سے دولت

روپے کا جمع ہونا، جواہر کی تلاش میں ہیرا کھانا، دن کا جاگنا، چاندی سونے کی اُمید میں رات کا نہ سونا، سیمیں تن، لعل لبوں سے بہم ہونا جنھیں مُیسّر ہر بار ہے، اُنھیں مُفارقتِ دُنیا ناگوار ہے اور یہ کلام ہے، مؤلّف:

یاں کے جانے سے جی اُلجھتا ہے
کیا ہی دل کش سرائے فانی ہے

لیکن کبھی صُبحِ عشرت، گاہ الم کی شام ہے، دُنیا عجب مَقام ہے۔ نہ امیر ہوتے عرصہ لگتا ہے، نہ فقیر بنتے کچھ دیر ہے، اِس کارگاہِ بے ثبات میں یہ اندھیر ہے۔ سَلَف سے اَہلِ کمال دُنیا کے مال سے محروم رہے۔ جو سزاوارِ حکومت تھے، وہ محکوم رہے۔ شعر:

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم ②

یہاں کی نیرنگیوں سے فارغُ البالوں پر عرصہ تنگ رہا، مگر گردشِ چرخ کا وہی ڈھنگ رہا۔ سوؔدا:

ہے چرخ جب سے اَبلَقِ اَیّام پر سوار
رکھتا نہیں یہ ہاتھ عناں کا بہ یک قرار ③
جن کے طَوِیلے بیچ، کئی دن کا ذکر ہے
ہرگز عِراقی و عَرَبی کا نہ تھا شُمار

اب دیکھتا ہوں مَیں کہ زمانے کے ہاتھ سے
مُوچی سے کَفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار

اور جب وعدہ آپہنچا تو نہ روپیہ کام آتا ہے، نہ فوجِ ظَفَر مَوج سے کچھ ہو، نہ تَہمتَنِ جرّار بچاتا ہے۔ نہ کوئی آشنا دوست آڑے آئے، نہ عزیز و اَقرِبا پنجۂ مَلَکُ المَوت سے چُھڑائے۔ اگر یہی اَمر مانِعِ قضا و قَدَر ہوتے؛ جَمشید و کاؤس، دارا و سکندر بہ صد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے۔ نیک عمل کرے تو وہ ساتھ جاتا ہے۔ بُرے وقت میں اِحتیاج کسی کی بر لائے، یا لِلّٰہ کسی کو کچھ دے؛ یہ البتّہ کام بناتا ہے۔ اگر اپنے حال کو سوچے، تو مُنہ نوچے۔ بَینَ العَدَمَین آدمی ہے، دُنیا یہ بیچ کی سَرا ہے؛ وگرنہ دُنیا سَراب، نقش بر آب، زندگی بدتر اَز حَباب ہے۔ پابند اِس کا خراب، ترک کرنے والا نایاب ہے۔ ناسخؔ:

ترکِ دُنیا کا سوچ کیا ناسخؔ   کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں①

شعر:
اِس گلشنِ ہستی میں عجب سَیر ہے، لیکن②
جب آنکھ کھُلی گُل کی تو مَوسم ہے خِزاں کا

قَطعَہ:

دُنیا خوابیست، کَش عدم تعبیر است③
صَیدِ اجل است گر جواں ور پیر است
ہم روی زمیں پُر است و ہم زیرِ زمیں
ایں صفحۂ خاک ہر دو رُو تصویر است

اِلّا، مُقتضائے عقل یہ ہے کہ عالَمِ اَسباب میں کسی اَسباب کا پابند نہ ہو، تعلّقِ خاطِر نہ رکھے۔ ہمیشہ اِس نے بھلے سے بُرائی کی ہے۔ جو گیا یہاں سے، یعنی جہانِ گُذراں سے، اِس کا شاکی تھا بادشاہ سے فقیر تک، جوان سے پیر تک۔ حقیقت میں یہ نَفسِ اَمّارہ سخت ناکارہ ہے، اِس کو بہ ہر کیف زِیر کرے، زبردستی پچھاڑے۔ گَردِ ہَوا و ہَوَس سے دامنِ ہمّت جھاڑے۔ شعر:

دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند
آنرا کہ عقل بیش، غمِ روزگار بیش

یہاں کوئی ایسی بات خدا کی عنایات سے پیدا کرے تا صَفحۂ روزگار پر چندے بہ نیکی نام یاد رہے۔ شعر:

اِس طرح جی کہ بعد مرنے کے[1]
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

دُنیا میں کسی سے دل نہ لگائے کہ یہ کارخانہ بہت بے ثَبات ہے۔ وَصل سے فرحت، ہجر کی مصیبت اپنے سر پر نہ لائے کہ مرجانے کی بات ہے۔ معشوقِ باوفا عَنقا کی طرح ناپیدا ہے اور پُر دَغا ہرجائی ہر جا مُہیّا ہے۔ خواہش کا انجام کاہش ہے۔ تمنّا دل سے دور کرنے میں جان کی آسایش ہے۔ مؤلّف:

کبھی نہ چَین سے رہنے دیا تمنّا نے
خراب و خستہ مَیں اِس دل کی آرزو سے ہُوا

مگر وائے غفلت، ہائے نادانی! کہ جب نشۂ جوانی کا مَوسَم پیری میں

خُمار اُتار ہوتا ہے، اُس وقت آدمی سر پر ہاتھ دھر کر رُوتا ہے۔ وقتِ اَز دست رَفتہ و تیرِ اَز شَست جَستہ کب ہاتھ آتا ہے۔ ناچار ہو، کفِ افسوس مَل کے پچھتاتا ہے۔ گُذشتہ را صَلوٰات کہ کے دل کو سمجھاتا ہے۔

آدمیوں کو بندر کی تقریرِ دِل خَراش، پُراثر سے عبرت وحیرت حاصل تھی۔ کبھی نصیحت و پند، گاہ کلامِ رنگین و دل چسپ بادِلِ دردمند کبھی سَخُنانِ وحشت اَفزا سُناتا چلا جاتا تھا۔ اہلِ دل، طبیعت کے گُداز رُوتے ساتھ آتے تھے۔ ہر فقرۂ پُر درد پر ضبط نہ ہو سکتا تھا، چِلّاتے تھے۔ خلقِ خُدا، جنازے کی طَرح ہاتھی کے ہمراہ تھی۔ ایک عالَم کے لب پر نالے تھے، فُغان و آہ تھی۔ اِسی سامان سے ملکہ کے جَھرُوکے تلے پہنچے۔ وہ مُنتَظِر تمام شب، نالہ بہ لَب، سوداگر سے فرمانے لگی: ایک دم ٹَھہر جا، میں بھی اِس اسیرِ پنجۂ تقدیر کی تقریر کی مشتاق ہوں۔ سوداگر نے ہاتھی رُوکا۔ ملکہ نے کہا: اے مُقرّرِ بے زَباں، وطن آوارہ، گُم کردہ خانماں! اگرچہ اب ہم کس لائق ہیں، مگر تیری داستانِ ظُلم وجَور کے شائق ہیں۔ بندر نے آواز پہچانی۔ پہلے تو خوب رُویا، پھر جی کو ٹھہرا کر کہنے لگا، شعر:

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدؔی از دستِ خویشتن فریاد

میرؔ:

کیونکے کہیے، کوئی نہیں آگاہ ‌ ‌ ‌ اک قیامت بپا ہے یہاں سَرِ راہ (1)

کچھ چھپا اب نہیں رہا یہ راز
ہے جہاں اِس سے سب سخن پرداز
بس تغافُل نہ کر، ترَحُّم کر
گُوشِ دل جانبِ تکلّم کر

شعر:

قسمت تو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو تین ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! یار نے عیّاری کی، دغا سے یہ نوبت ہماری کی۔ جس کا رُونا ہمیں ناگوار تھا؛ وہ ہمارے لَہو کا پیاسا، قتل کا رَوادار تھا۔ یہ مَثَل سچ ہے: تیرھویں صَدی ہے، نیکی کا بدلا بدی ہے۔ محبوبوں کی تمنّا دل میں رہی۔ وطن جانے کی حسرت آب وگِل میں رہی۔ دوستوں کا کہا نہ مانا؛ وہ آگے آیا، پچھتانا پڑا۔ بے اَجَل جلّاد کے فَریب سے ذَبح ہوئے۔ طالِب و مطلوب جان جوکھوں میں پھنسے، زندہ دَرگُور ہوئے۔ اَلحَق، دُنیا دم مارنے کی جا نہیں۔ راز کسی سے کہنا اچھا نہیں۔ منصورِ حَلّاج نے کلمۂ حق کہا تھا، ناحق لوگوں نے دار پر کھینچا۔ غَرَض جو بولا، وہ مارا گیا، جان سے بے چارہ گیا۔

کہتے تو کہا، پَر کچھ سوچ کر بات بنائی۔ جی میں دہشت آئی کہ مَبادا یہ خبر اُس اَکفَر کو پہنچے، تو یقینِ کامل ہو، جان دَشنۂ ظلم سے نہ بچے۔ کہا: اے ملکہ! کوئی کسی کمال سے دُنیا میں نہال ہوتا ہے؛ یہ بے گناہ، گویائی کے سبب، ناحق حرام زادے کی بدولت

حلال ہوتا ہے۔ مؤلف :

کمالِ شَے، زَوالِ شَے ہے، اِس پر لاکھ حاسد ہوں
بھلا نازاں نہ ہوں کیوں کر میں اپنی بے کمالی کا
خدا جانے کہ دیکھا، دیکھ کر یہ چاند، مُنہ کس کا
ہوئی ہے عید غیروں کو، ہمیں ہے چاند خالی کا

میں نے دانستہ اپنے ہاتھ سے پاؤں میں کُلھاڑی ماری، فلک نے بنا کر بات بگاڑی۔ مصرع :

اے روشنیِ طَبع! تو بر من بلا شدی

شعر :

گُل و گُلچیں کا گِلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر (1)
تو گرِفتار ہوئی اپنی صدا کے باعِث

اب سَرِدست کچھ تدبیر بن نہیں آتی ہے۔ صورتِ مَرگ آئینۂ چشم میں مَدِّ نظر ہے، ہماری ہمیں کو خبر ہے، کوئی گھڑی میں مُفت جان جاتی ہے۔ جو جانتا ہے، وہ دیکھتا ہے؛ جسے خبر نہیں، اُس سے کہہ دو: تمھارے واسطے غریبِ دِیار ہوئے اور تمھارے سبب سے قتل کے سَزا وار ہوئے۔ شعر :

بجرمِ عشقِ توام می کُشند و غوغائیست (2)
تو نیز بر سَرِ بام آکہ خوش تماشائیست

اِن باتوں سے رہے سہے شک ملکہ کے بَرطَرف ہوئے، سمجھی

جانِ عالم یہی ہے۔ جواب دیا کہ جو جانتے تھے، اُن سے کیا ہو سکا، اَن جان کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ! اور تُوتے کی گردن مروڑ، پنجرہ باہر نکالا۔ بندر کی نگاہ پنجرے پر پڑی، سمجھا: ملکہ پہچان گئی، یہی فرصت کا وقت ہے۔ ہنگامہ و تَلاطُم تو مچا تھا، کسی نے دیکھا نہ بھالا؛ بندر سوداگر کی گُود میں لیٹ کر تُوتے کے قالِب میں پَرواز کر آیا۔ تُوتا پھڑکا، ملکہ کا خوشی سے دِل دَھڑکا، پنجرہ اندر کھینچ لیا۔

سوداگر نے دیکھا: بندر مر گیا۔ چاہا: ہلاک ہو جائے، بدنامی کا قصہ پاک ہو جائے۔ جو شخص خَواصی میں بیٹھا تھا، سمجھانے لگا: بندہ پَرَوَر! شُکر کرنے کی جا ہے، شکایت کا موقع کیا ہے۔ حُرمت رہی، جان بچی۔ مرگِ فرزند سے ماں باپ کو چارہ نہیں۔ مرجانا بجُز حُمقا عقل مند کو گوارا نہیں۔ اگر بادشاہ جَبر سے بندر کو چھین کر مار ڈالتا، جان کھونے کی جگہ تھی۔ صبر کیجیے، جو خدا کی مرضی۔ اُس کی رَضا میں مجبوری ہے، جائے صَبُوری ہے۔ صابِروں کا مرتبہ بڑا ہے، اُن کے حق میں اللہ فرماتا ہے، تم نے سُنا ہے کہ نہیں: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔

تماشائیوں پر یہ حال کھلا، رُونے پیٹنے کا دُونا شُور و غُل مچا۔ سب نے مُتّفِق یہی کہا: بس کہ بندر عَقیل تھا، یہ پیامِ طَلَب، کُوسِ رَحیل تھا۔ سامنے جانے کی نوبت نہ آئی، سوداگر کی گُود خالی کر کے جان گنوائی۔ اپنا قتل جو ثابت ہوا، خوف سے مر گیا، داغِ تقریر

ہمارے صَفحۂ دل پر دَھر گیا۔ یہ خبر اُس کافرِ اَکفَر کو پہنچی۔ اِس پر بھی چَین نہ آیا؛ لاش منگا، جَلا کے دل ٹھنڈا کیا۔ خاک تک برباد کی، جب تسکین ہوئی۔

وہاں ملکہ مہر نگار پنجرہ لے بیٹھی، لوگوں کو پاس سے سَرکا دیا۔ میاں مِٹّھو نے ھُوَ ھُوَ اِبتِدا سے اِنتِہا تک مُفَصَّل سب حال سُنا دیا کہ اِس طَرح نشے کی حالت میں اُس کے رُونے پر عَمَل بتایا؛ وہ ہمیں پر عَمَل میں لایا، بندر بنایا۔ پھر چڑیمار کے جال میں پھنسے، دوست رُوئے، دشمن ہنسے۔ وہاں سے سوداگر مَتاعِ خوبی سمجھ کر، اپنے پاس لایا۔ فلک نے بعدِ خرابیِ بِسیار آج تم سے مِلایا۔ ملکہ نے کہا: خاطرِ پریشاں جمع رکھیے، اِنْشاءَاللہ تعالیٰ جلد کوئی صورت ہوئی جاتی ہے۔ یہاں یہ گفتگو تھی کہ اُس نُطْفَۂ شیطاں کی آمد ہوئی۔ ملکہ باہر نکل آئی، تعظیم و تَواضُع کرنے لگی۔ ہمیشہ یہ معمول تھا: جب وہ آتا، ملکہ بات نہ کرتی، مُدارات نہ کرتی؛ طَیش میں آتا، خَفیف ہو کر اُٹھ جاتا۔ اُس روز جو گفتگو ہوئی، وہ مَردَک سمجھا: بندر کا مرنا بہ چشم ملکہ نے دیکھا، اِس سے دب گئی، بے اِعتِنائی کی بات اب گئی۔ جلدی نہ کرو، اِمروز فَردا مُقدَّمہ درست ہو جائے گا؛ لیکن پہلے اِسی سے فیصلہ شرط ہے۔ ملکہ کے باپ کا بہت ڈر تھا، اِس باعث ملکہ کا پاس کرتا تھا کہ اُن کے باپ سے ہِراس کرتا تھا۔ جب رخصت ہونے لگا، ملکہ نے کہا: ایک بکری کا بچّہ خوب صورت سا ہمیں بھیج دو،

پا لیں گے، رنج کو ٹالیں گے۔ یا تو چُپ رہتی تھی، آج بچّہ مانگا؛ یہ بچّہ بہت خوش ہوئے۔ اُسی وقت ایک بَربَری کا بچّہ تُحفہ بھجوا دیا۔ دوسرے روز جو آیا، ملکہ کو زیادہ مُتوَجِّہ پایا۔ اُس کے رُو بہ رُو بچّے سے کِھلا کی۔ دو تین روز یہی صُحبت رہی۔

ایک رُوز ملکہ نے بچّے کو دبا کر اَدھ مُوا کر دیا اور چوبدار دوڑایا کہ شہ زادے کو جلد بُلا لا، عرض کرنا: اگر دیر لگاؤ گے، جیتا نہ پاؤ گے۔ یہ خبر سُن کر وہ محل سَرا کا عازِم ہوا۔ ملکہ نے پنجرہ اُس ہُمائے اَوجِ سلطنت کا پلنگ کے پاس رکھ لیا۔ جب وہ نابکار رُو بہ رُو آیا، ملکہ نے بچّہ گُود میں اُٹھا کے اِس زُور سے دبایا کہ وہ مر گیا۔ اُس کا مرنا، اِس کا نالہ و فریاد کرنا۔ گِریباں چاک کرنے کی، بکھیڑا پاک کرنے کی تدبیر کی۔ وہ بے قرار ہو کر بہ مِنّت بولا: ملکہ! ہزار بچّہ اِس سے اچّھا ابھی موجود ہوتا ہے، تم کیوں رُوتی ہو، جی کھُوتی ہو۔ ملکہ نے اُسی حالت میں کہا: میں کچھ نہیں جانتی، تم اِسے ابھی جِلا دو، جو میری خوشی چاہتے ہو۔ وہ بولا: مُردہ کہیں جِیا ہے؟ کبھی کسی نے، سِوائے مسیح، ایسا کیا ہے؟ ملکہ نے رُو کر کہا: واہ! تم نے میری مَینا جو جِلائی تھی، جب میں بِلبِلائی تھی۔ یہ دل میں سمجھا: شاید شہ زادے نے یہ حرکت کی ہو گی! کارخانے مُسَبّبُ الاَسباب کے مشہور و معروف ہیں۔ دُنیا میں، مَثَل ہے: کہ کرد کہ نیافت۔ جس نے جیسا کیا، ویسا

پایا۔ ہر فرعونے را موسیٰ۔ رُباعی:

① اے یار! جو کوئی کسی کو کلپاوے گا یہ یاد رہے، وہ بھی نہ کل پاوے گا
اِس دارِ مُکافات میں، سُن اے غافل! بیداد کرے گا آج، کل پاوے گا

وہ بدحواس پوچھنے لگا: ہم نے مَینا کیوں کر جِلائی تھی؟ ملکہ بولی: تم پلنگ پر لیٹ رہے تھے، وہ جی اُٹھی تھی۔ یہ پتا بھی درست پایا اور قضا کا زمانہ قریب آیا، کہا: بچّہ گُود سے رکھ دو۔ ملکہ نے پھینک دیا۔ وہ پلنگ پر لیٹا، اپنی روح بچّے کے قالب میں لایا، وہ اُٹھ کر کودنے لگا۔ ملکہ مہرنگار نے گُود میں لیا، پیار کیا۔ وہ سُوچا دو گھڑی ملکہ کی طبیعت بہل جائے، پھر روح قالب میں لے جاؤں گا، مطلب تو نکل آئے۔ یہ نہ سمجھا فلک کی گھات ہے، فریب کی بات ہے؛ چرخ کو کچھ اور چکّر منظور ہے، اب اُس جسم کے نزدیک جانا بہت دور ہے۔ شہ زادہ جانِ عالم یہ سب مُعاملے پنجرے سے دیکھ، سُن رہا تھا؛ قالب کو خالی پایا، فوراً اپنی رُوح اپنے جسم میں لایا، مُنہ سے اِلّا اللہ کہا، اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بُزدِلا جانِ عالم کو دیکھ کر تھرّا گیا، خوف چھا گیا۔ سمجھا قسمت اب بُری ہے، کوئی دم کو گلا ہے اور چھری ہے۔ ملکہ نے جلد دو اَنجھر وہ پڑھ کر پھونک دیے کہ وہ اَور کے قالب میں روح لے جانا بھول گیا۔

پھر انجمن آرا کو بلایا، کہا: لو صاحب مبارک ہو! اللہ تعالیٰ نے تمھاری ہماری حُرمت و آبرو کو بچایا، بِچھڑے سے مِلایا۔ یہ

آپ کا اَحْمَقُ الَّذِی شہ زادہ ہے۔ وہ بکری کا بچّہ؛ بے دین، حرام زادہ وزیر زادہ ہے۔ یہ کہ کر تینوں عاشق و معشوق گلے مل مل خوب روئے۔ جو جو محرمِ راز تھیں، دوڑیں، مبارک سلامت کی دھوم ہوئی، بشّاش ہر ایک مغموم ہوئی۔ جانِ عالم نے اُسی وقت سوداگر کو طلب کیا، اپنی سَرگذشت سے آگاہ سب کیا۔ بعدِ ادائے شُکرِ نعمت، خِلعتِ مُکلّف اور انعام ہر اَقسام کا مع ہاتھی، پالکی عنایت کیا۔ وطن آنے کا وعدۂ حتمی لیا۔ پھر چڑیمار اور اُس کی جورو کو بلایا۔ روپیہ اشرفی، زر و جواہر دے کر فکرِ دنیا سے بری کر دیا اور بہ مشورۂ غضنفر شاہ اُس مملکت کے چڑیماروں کا چودھری کر دیا۔ پھر لشکرِ ظفر پیکر کو حکمِ تیاریِ سامانِ سفر فرمایا، آپ رخصت ہونے کو غضنفر شاہ پاس آیا۔ آخر کار بہ دِقّتِ تمام و طوُلِ کلام، درازیِ اَیّامِ مُفارَقتِ والِدین کہ کر اُسے راضی کیا۔ پیش خیمہ اُسی دن لد گیا۔ دو چار دن رخصت کی دعوتوں میں گزرے۔ اخیر چلے خوب دھوم دھڑکّے کے ہوئے۔ اپنے عَمَل تک غضنفر شاہ ساتھ آیا۔ تمام لشکر نے اُس کی سرحد تک پکّا پکایا پایا۔ پھر رخصت ہوئے۔ وہی دو چار کوچ، ایک دو مُقام کرتے بہ راحت و آرام چلے۔

ناقہ بِٹھانا تقدیر کا پھر اُسی دشتِ پُر خوف و خطر میں۔
لبِ حوض خیامِ شاہی ہونا، ساحرہ کا آنا، تمام لشکر کو
نصف پتّھر بنانا۔ سب کا رونا، پھر ملکہ کے باپ کا آنا،

آفت سے چھڑانا۔ صفوف آرائیِ افواجِ شاہی۔ جادوگر اور جادوگرنیوں کی لڑائی۔ شہپال کا قتل، لشکر کی رہائی۔

نظم:

نگارِندۂ داستانِ عجیب — یہ لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب
طِلسمِ جہاں دید کا ہے مکاں — پھنسے اِس میں رہتے ہیں پیر و جواں
ولیکن ہنسا جو کوئی غنچہ ساں — ہُوا مثلِ گُل دستِ بُردِ خزاں
جسے ہم نے دیکھا، وہ تھا دِل حزیں — خوشی کی جگہ، سچ ہے، دُنیا نہیں

مُحرِّرانِ جادو نگار و سحر ساز، راقمانِ فسانۂ ہوش رُبا و حیرت پرداز نے لکھا ہے کہ جانِ عالم ہر صُبح مثلِ مہرِ درخشاں قطعِ منازِل و مَراحِل یعنی کوچ، و ہر شام مانندِ ماہِ تاباں مُقام کرتا؛ چند عرصے میں پھر اُسی دشتِ اِدبار و صحرائے خار خار، جہاں حوض میں کود پڑا تھا، وارِد ہوا۔ حوض کے مُتَّصِل سراپردۂ خاص نصب ہوئے۔ گردِ لشکرِ نُصرت اثر اُترا۔ انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کو وہ چشمہ دکھایا، ماجرائے گذشتہ زبان پر لایا۔ جب دن تمام ہوا، نمازِ شام کے واسطے جُدا خیمے میں تشریف لایا۔ بعدِ ادائے فریضۂ باری، راہ کے کسَل سے لیٹنے کی تیاری کی۔ پلنگڑی جواہِر نگار بچھی تھی، اُس پر اِستراحت فرمائی۔ سُستی کے باعث غنودگی سی تھی کہ دَفعَۃً ایک خواصِ خاص انجمن آرا کی بدحواس دوڑی آئی، کہا: شہ زادۂ عالم

کی عُمر دراز ہو، قضا مُطیع، قَدَر دم ساز ہو؛ نصیبِ دُشمناں شہ زادی کی طبیعت ناساز ہے، سب کی عقل کو پرواز ہے۔ شدّت سے کلیجے میں درد ہوتا ہے، چھوٹا بڑا محل کا روتا ہے۔ وہ نقشِ سُلَیمانی اور لَوح دیجیے، دُھوکر پلادیں۔ یا اور کوئی تجرِبے کی چیز عنایت ہو کہ کھلادیں۔

عارِضۂ مزاجِ مطلوب، بَدمزگیِ طبیعتِ محبوب سُن کے بے قرار ہوا۔ عقل اُڑ گئی، حواس فرار ہوا۔ کچھ نیند کا خُمار، کچھ طبیعت کا اِنتشار، دیکھا نہ بھالا، نہ وقفہ کیا نہ ٹالا، لَوح و نقش حوالے کیا۔ نقش دیتے ہی نقشہ بگڑ گیا، مُقدّمہ سب خراب ہوا، ثواب کے بدلے عذاب ہوا۔ ایک آوازِ مَہیب پیدا ہوئی کہ اے جانِ عالَم! بہت دنوں اُڑا پھرا، مدّت کے بعد پھنسا، خبردار ہوجا! ایسی آوازِ ہَولناک تھی کہ سب لشکر ڈر گیا، شُجاعوں کے دل تھرّا گئے، محل میں رنڈیوں کو غش آگئے۔ گھبرا کر شہ زادے نے اُٹھنے کا قصد کیا، جگہ سے ہِلا نہ گیا۔ غور جو کیا تو آدھا جِسم پتّھر کا تھا۔ پھر تو جہاں بیٹھا تھا بیٹھا رہ گیا۔ جو کھڑا تھا، وہ زمین میں گڑا تھا، اینٹھا رہ گیا۔ ہر طرف غُل اور شُور تھا۔ جو پڑا تھا، زندہ در گور تھا۔ کچھ دُکھ، کچھ ہنسی تھی۔ تمام فوج آفتِ ناگہانی میں پھنسی تھی۔ عجب کُھل بَلی مچی، نامَردوں کی بائی پُہنچی۔ کُل لشکر انسان سے حیوان تک نیچے کا دَھڑ پتّھر کا، اوپر کا جِسم بہ دستور۔ آہ و نالہ، فریاد و بُکا سب لشکر میں بَپا تھا۔ اور محل سَرا میں بھی یہی ہنگامہ مچا تھا، ہر ایک گرِفتارِ بلا تھا۔ وہ رنڈیوں کی زاری، انجمن آرا کی بے قراری! علَی الخُصُوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسماں کانپتا تھا، جب وہ یہ کہتی تھی، شعر:

ہر دم زمانہ داغِ دگر گو نہ در دہد یک داغ نیک ناشدہ داغِ دگر دہد

تمام لشکر میں، اَز شام تا پگاہ ، ہر ایک کے لَب سے نالۂ جاں کاہ بُلند رہا۔ جس وقت ماہ دَمِ سرد بھرتا نقابِ سِیاہ رُوئے تاباں پر ڈال کر غم کدۂ مغرب کی طَرف روانہ ہوا اور آفتابِ جگر سُوختہ مشرق سے نکل کر خَدَنگِ آہِ بے کَماں کا نشانہ ہوا ، ایک اَبْرِ تیرہ وتار نمود ہوا۔ آدمی سب خوف زَدَہ دیکھنے لگے۔ اُس اَبْر سے اَژدَہا خوں خوار، شُعلہ فِشاں، آتَش دَہاں نکلا۔ ایک رنڈی اُس پر سوار، وہ بھی آتَش بار، شہ زادے کے خیمے میں اُتری۔ جانِ عالم نے پہچانا کہ وہی جادوگرنی ہے ، دل سے کہا : شہر اپنا دور رہا ، موت قریب آئی ، قسمت نے کس جگہ لاکر نیرَنگی دِکھائی! وہ بولی: جانِ عالم! کہو اب کیا قَصد ہے؟ شہ زادے نے کہا : وہی جو تھا۔ اُس نے کہا: اب وہ نقشِ سُلیمانی اور لَوح پیرِ مرد کی نشانی کہاں ہے، جس کے بھروسے پر کودتے تھے! اگر زِندَگی مَعِ لشکر درکار ہو، اور دُوش پر سر نہ بار ہو تو ملکہ اور انجمن آرا سے انکار کرو۔ ہماری اِطاعت اور مَحبّت مُقدَّم جانو، جو کہیں مانو، ہم سے دار و مَدار کرو۔ نہیں تو ایک دم میں سب کو بے گُور و کَفَن ، طُعمۂ زاغ و زَغَن کردوں گی۔ دَشْت لاشوں سے بھر دوں گی۔

شہ زادے نے کہا : ہماری لَوحِ دل پر نقشِ اِرادَتِ باری، جو حافظِ حقیقی ہے، کِلکِ قُدرت سے مُنَقَّش ہے۔ عادت سے مجبور ہوں ، بے وفائی کے کُوچے سے دور ہوں۔ جو کہا سُو کہا، کیا جُو کیا۔ اگر قضا

آئی ہے، مرنے سے کیا چارہ ہے؛ مگر جیتے جی بات جانی کب گوارا ہے۔ یہ سن کر جل گئی، غُصّے سے رنگت بدل گئی۔ کچھ بڑبڑا کر جانِ عالم پر پھونکا۔ یا نصف پتّھر تھا، اب حلْق تک ہوگیا۔ حسرت و یاس سینے میں بھری تھی، تصویرِ آزری سی پَلنگڑی پر بے حس، خالی دَھری تھی۔ وہ تو اژدہے پر چڑھ کر اُڑی اور پکاری: اے اَجَل رَسیدہ! آج کے دن اور رات کی مُہلت ہے؛ اگر صُبح کو بھی انکار کیا، تو یاد رکھنا، لشکر کا خون اپنی گردن پر لیا۔ یہ سُنا وہ تو ہَوا ہوئی۔

اب یہاں کا حال سُنو۔ جب تک شہ زادہ آدھا پتّھر تھا، تو ملکہ اور انجمن آرا اپنے اپنے خَیموں سے گھبرا کر پکارتی تھیں، جانِ عالم جواب دیتا تھا۔ یہی آواز کا سہارا اُن کی زیست کا سبب تھا۔ اب تا حَلْق پتّھر ہونے سے، وہ جَرَسِ قافلۂ گُم کردہ راہِ دَشتِ غُربت، بے صدا ہوگیا۔ وہاں صبر کا راہ بر جُدا ہوگیا۔ ہر چند دونوں چِلّائیں، شہ زادہ جانِ عالم نے مطلق جواب نہ دیا، بُولا ہی نہ گیا۔ پھر تو ملکہ مہر نگار بادِلِ فِگار سر پیٹ کر کہنے لگی، میر حسن:

فلک نے تو اِتنا ہنسایا نہ تھا①
کہ جس کے عِوَض یوں رُلانے لگا

مُژدہ اے مرگِ غریبُ الوطنی! خوب حیلہ ہاتھ آیا؛ تو بدنامی سے بچی، ہم نے ناکامی میں جان دی۔ چرخِ ستم شِعار زور رنگ لایا۔

انجمن آرا بے چاری مصیبت کی ماری سب کا مُنہ حیرت سے تکتی تھی اور رُوتی تھی ۔ نہ بَین کر آتے تھے، نہ غُل مچایا جاتا تھا، گھُٹ گھُٹ کر جان کھوتی تھی ۔ خواصیں سِر کھول کر کہتی تھیں : ہَے ہَے! ہم اِس جنگل ویران میں لُٹ گئے، وارِث سے چھُٹ گئے ۔ شعر:

تو وہ کریم ہے، ناشاد کو جو شاد کرے
مراد مند کو ہر طَرح بامُراد کرے

لوگو! ہم کدھر جائیں، کیوں کر اِس بلا سے نَجات پائیں! کوئی کہتی تھی : شیطان کے کان بہرے، خدانخواستہ اگر جانِ عالم کے دشمنوں کا رُونگٹا مَیلا ہُوا؛ شہ زادیاں خاک میں مل جائیں گی، غمِ جُدائی سے جانیں گنوائیں گی ۔ ہم اِن کے ماں باپ کو مُنہ کیا دِکھائیں گے، اِس دَشتِ اِدبار میں سِر ٹکرا کر مر جائیں گے ۔ یہ جادوگرنی 'قربان کی تھی' لاشوں کو گُور و کفن نہ دے گی ۔ اور آتو، محل دار جگر اَفگار سِر سے چادریں پٹک، مدینے کی طرف پکار پکار یہ کہتی تھیں، شعر:

تَصدُّق اپنے نَواسوں کا یا رسولَ اللہ
کہو کہ حل کریں مشکل ہماری حضرتِ شاہ

ایک طرف مُغلانیاں غم کی ماریاں دَمِ گرم، آہِ سرد بھرتی تھیں۔ ایک سِمت اَنیسیں، جلیسیں نَجَف کی طرف بال کھول کر اِلتجا سے، گِریہ و بُکا سے یہ عَرض کرتی تھیں، شعر:

تم نے مدد کر نوح کی طوفاں سے کشتی پار کی یا مُرتضیٰ مشکل کُشا! کیوں بار میری بار کی

کوئی کہتی تھی : ہمارا لشکر اِس بلا سے جو نکلے گا، تو مُشکل کُشا کا کھڑا دونا دوں گی۔ کوئی بولی : مَیں سہ ماہی کے رُوزے رکھوں گی، کونڈے بھروں گی، صَحنک کھِلاؤں گی، دودھ کے کوزے بچّوں کو پِلاؤں گی۔ کسی نے کہا : مَیں اگر جیتی چھُٹی، جنابِ عبّاس کی درگاہ جاؤں گی۔ سقّاے سکینہ کا عَلَم چڑھاؤں گی۔ چہل مِنبری کر کے نذرِ حسین سبیل پِلاؤں گی۔

غَرَض کہ لشکر سے زیادہ خیموں میں تلاطُم پڑا تھا۔ صداے حزیں، نالۂ ہر غمگیں سے ہنگامۂ محشر بَپا تھا۔ اِتّفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا رشید، فنِ سحر میں دید نہ شنید اُس مردِ بزرگ کی ملاقات کو بہ رؤے ہوا اُڑا جاتا تھا۔ یہ نالۂ بلند، صداے ہر دردمند اُس کے کان میں جو پہنچی، زمین کا مُتوَجِّہ ہوا۔ دیکھا تو ایک لشکرِ عظیم بہ حالِ سقیم سحر کا مُبتلا ہے، شُور و غُل ہو رہا ہے۔ جب قریب تر آیا، طُرفہ ماجرا نظر آیا کہ انسان سے تا جانور سب آدھے پتّھر ہیں۔ سمجھا سحرِ شَہپال میں خراب حال ہیں۔ لوگوں سے پوچھا: یہ ستم رسیدہ لشکر کس کا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس نے یہ حال بنایا ہے؟ وہ ملکہ مہرنگار کے ملازم تھے، اپنا حال سب نے بیان کیا۔ جب اُسے یہ اَمر معلوم ہوا کہ اُستاد زادی کی خانہ بربادی ہے اور شَہپال کی بیٹی کو مسرّت ہے، شادی ہے ؛ درِ خیمۂ ملکہ پر آیا، سر پیٹا، چِلّایا۔ ملکہ نے آواز پہچانی، کہا: بھائی! اِس وقت پردہ کہاں کا! یہاں آ کے بِالمُشافہہ ہمارا عذاب اور حالِ خراب دیکھو۔ وہ اندر آیا، ملکہ کو بھی اُسی عالَم میں پایا۔ اُس نے فرمایا: عداوتِ ساحرہ سے ہمارا

قافلہ تباہ ہے۔ وہ عرض کرنے لگا: فِدوی کو اُس کی ہمسری کی طاقت نہیں اور وَقفہ کم، صُبح سب کارخانہ درہم و برہم ہوجائے گا۔ بجز آپ کے والدِ بزرگوار کے تشریف لائے یہ بلا ٹلتی نہیں، خادم کی یہاں دال گلتی نہیں۔ تُو خُدا حافِظ و ناصِر ہے! یہ کہہ کر بہ حالِ خستہ و تباہ، لب پُر نالہ و آہ، اِس تیز قدم سے چلا کہ اَدہَمِ صبا کی ڈَپَٹ ہر قدم نثار تھی، ٹھوکروں میں صَرصَر بے قرار تھی۔ پہَر بھر میں وارِدِ باغ ہوا: گُل سا چاک گریباں، شبنم نَمَط اشک رَواں، غنچے کی صفت گاہ خموشش، بلبل کے ڈھنگ سے گاہ نالے کا جُوشش و خَروش۔ پیر مرد نے فرمایا: خیر ہے! اُس نے شِمّۂ گرِفتارِیِ جانِ عالم، ملکہ کی بے قراری، انجمن آرا کا اَلَم، لشکر کا حالِ بَتَر کہہ کر عرض کی: جلد چلیے؛ اگر شام تک نہ پہنچے، وہاں صُبح ہے۔ دَمِ سَحَر مَلَکُ المَوت کا بازار گرم ہوگا، ارمان سب دل میں رہے گا، کُشتوں کو عالَم بے والی و وارِث کہے گا۔ کوئی گورو کفن نہ پائے گا، خاتمہ بِالخَیر ہوجائے گا۔ پیر مرد نے آہِ سرد بھر کر فرمایا: افسوس! شہ زادے کو سب کچھ سمجھایا تھا مگر عَمَل میں نہ لایا۔ میر سوز:

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا ①
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ، نئی

اُسی دم شاہینِ تیز پرواز پر سوار ہوا، مغرب کی نماز لشکر میں داخل ہوکر پڑھی۔ پہلے جانِ عالم کے خَیمے میں آیا، حال دیکھ کر سخت گھبرایا۔ پھر انجمن آرا کی جاکر تسکین کی، وہ رُونے لگی۔ وہاں سے ملکہ کے پاس

آکے فرمایا: تمھاری بدبختی نے ہماری وضع میں فرق ڈالا، برسوں کے بعد باغ سے نکالا۔ ملکہ نے رُو کر عرض کی: یہ وقتِ تدبیر ہے نہ ہنگامِ تعذیر؛ بعد رہائی اِس آفتِ سماوی کے جو چاہنا فرمانا۔

اَلقِصّہ مجبور و ناچار وہ عارفِ باوَقار شہ زادے کے خَیمے کے نزدیک دور تک حِصار کھینچ کر بیٹھا۔ یہ مردِ بزرگ، نیک صِفات، فنِ سِحر کے سِوا، عامل اِسمِ ذات کا تھا؛ کچھ پڑھنے لگا۔ کبھی مُناجات بہ درگاہِ مُجیبُ الدَّعوات کرتا کہ اے یاوَرِ زیر دَستان و سَرفِرو کُنِندۂ گردن کشاں! اِس بوڑھے کی شرم تیرے ہاتھ ہے۔ قَبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، آخیر وقت کا تو حافظ و نگہباں ہے۔ مجھ پر جو مشکل ہے، تیرے رُوبہ رُو آساں ہے۔ سفید ڈاڑھی کو بدنامی کے وَسمے سے نہ رَنگانا۔ تیرہ بختی کا دھبّا بہ ایں ریشِ سفید نہ لگانا۔ شعر:

مشکل، ز توجہِ تو آساں آساں، ز تغافلِ تو مشکل

جب کہ سَجّادہ نَشینِ چرخِ اوّل باجمعِ مُریدانِ کَواکب حُجرۂ مغرب میں رُو پوش ہوا، اور ساحرِ فَلکِ چہارم پُرشوکت و باحَشَم طِلسمِ مشرق سے نَمودار باجُوش و خَروش ہوا، اور وہ عِبادت گُزار پیرِ جواں مرد شب زِندہ دار وَظائفِ صُبح سے فرصت پاچکا؛ یکایک وہ نابکار شیطان صفت، ناپاک عورت اژدہے پر سوار، بہ چشمِ خوں خوار

عزمِ قتلِ جانِ عالم، اور لشکر میں تنہا آئی۔ پہلے ملکہ کے باپ پاس گئی، آنکھیں لال لال، طیش کمال اور بہ آوازِ کرخت وہ نگوں بخت پکاری اے مردِ پیر، سست تدبیر! تیری اَجَل بھی دامن گیر ہو کر، کشاں کشاں اِس دشتِ جاں فشاں میں لائی! مجھے شرم آتی ہے کہ تو پیرِ نَوَد سالہ ہو چکا ہے، بے مارے مر رہا ہے، تیرے قتل میں بدنامی چھٹ فائدہ کیا ہے۔ جدھر سے آیا ہے، سیدھا چلا جا۔ میں بہ یک نگاہِ کج نشانِ لشکر اِس صفحۂ زمیں سے مثلِ حرفِ غلط کارِدِ سحر سے مٹائے دیتی ہوں۔

مردِ بزرگ نے آشفتہ ہو کر فرمایا: اے ننگِ فرقۂ بنی آدم، مردودِ عالم! تجھے جوشِ شہوت، وَلولۂ مباشرت نے آمادۂ قتلِ ہزارہا بندۂ اللہ، بے جرم و گناہ، کیا۔ میں مرگِ عزیزاں دیکھوں، مرنے سے ڈروں! بہ قول تیرے: آج نہ مُوا، کل مر جاؤں گا؛ یہاں سے جو چلا گیا، خلق کو منہ کیا دکھاؤں گا! ہم چشموں سے ناحق آنکھ چھپانی پڑے گی! تو بدبخت مجھ سے کیا لڑے گی! یہ سن کر وہ فاحشہ جھلّا، آستین چڑھا سحر کی نیرنگیاں دکھانے لگی۔ اِن کی بھی دعا کی تاثیر سپر بن کے، اُس کا سحر اُس پر ڈھال، رنگ مٹانے لگی۔ صبح سے پہر دن باقی رہا، کوئی دقیقہ طرفین سے نہ باقی رہا۔ طول اِس مقام کا بے جا تھا، اِسی کلمے پر تمام کیا کہ جب وہ عاجز ہوئی، تب سحر کی طاقت سے شیر کی صورت بنائی۔ پیر مرد بھی اَسَدُ اللہِ الغالِب کو یاد کر، وہ

مُہیب بَبَر بنا اور اِس طرح للکار کر گُونجا کہ جنگل کے چارپایے نعرے کے خوف سے دریا میں گرے اور پانی کے جانور خُشکی میں پِھرتے پھرے۔

کچھ دیر اِس ہیئت میں لڑائی، زُور آزمائی رہی۔ آخرکار وہ رُوباہ خِصال، اُس ہِزبَرِ نَیَستانِ شجاعت کی تاب نہ لائی، گیدڑ بھبکی دِکھائی اور عُقاب بن کر اُڑ چلی۔ وہ شاہینِ اَوجِ دِلیری سُوچا: بے گرِفتاریِ طائرِ مطلب، یعنی اِس ڈھڈّو کے، لشکر جنجال سے نہ نکلے گا؛ اِسی طَرح یہ پھٹکی پھٹکی ٹٹّی کی آڑ میں شکار کھیلے گی۔ بلا سے کچھ ہو، اِسے پھنساؤ۔ زُور میں کم پایا تھا؛ فوراً بازِ تیز پرواز ہو کے، اِس سَنّاٹے سے چنگلِ آہنی میں اُسے دَبُوچا، ایسا نُوچا کہ اُس کی جان سَنسَنا گئی۔ بھاگتے وقت رِجالُ الغَیب سامنے تھا، مَوت پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑی۔ بہت تڑپی، پنجۂ قضا سے نہ چُھٹ سکی۔ اُسی کشمکش، اینچا کھینچی میں مُرغِ روح اُس کا مجروح، قفسِ تن سے اُڑ کر آشیانۂ جہنّم میں پہنچا۔ غُلغُلۂ حشر، شُورِ نشُور اُس صحرا میں نزدیک و دور مچا، ہر طَرَف سے دار و گیر کی صدا آئی۔ آسمان چکر میں آیا، زمین تھرّائی، دَشت تیرہ و مُکَدّر ہوا، آندھی چلی، سِحر کا کارخانہ اُڑ گیا، اَبتَر ہوا۔ قریبِ شام وہ سیاہی موقوف ہوئی، خورشید نے رُخِ انور دِکھایا، اپنا بے گانہ نظر آیا۔ جانِ عالم گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اہلِ لشکر نے رِہائی، اَز سَرِ نو زِندگی پائی۔

جانِ عالم خیمے سے نکل، نادِم و خَجِل، پیرمرد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سب نے دیکھا: دُور حصار میں ایک رنڈی، اَسّی نوّے برس کا سِن، ضُعف کا زُور شُور، بُڑھاپے کے دن۔ قد خمیدہ جیسے چڑھی کمان۔ مرنے پر لیس، مُنہ اُترا، آنکھیں تودۂ طوفان۔ جسم کا ہر پٹّھا درپئے ژولیدگی گھنی ہوئی رگیں صاف نظر آتی تھیں۔ ہڈیاں پسلیاں بوسیدہ جلد کے باہر سے گِنی جاتی تھیں۔ دُرجِ دہاں بے دُرِ دنداں، حقّۂ خالی کی طرح وا۔ ڈاڑھ، دانت کے نام سے مُنہ میں خاک نہیں، بھاڑ سا کُھلا۔ نیلے نیلے مسوڑھے سڑے۔ تالو توے کا پتّا؛ جیب جُھلسی، چھالے پڑے۔ ہاتھ دہنا برگد کا ٹہنا۔ بایاں جو زمین پر ڈالا تھا، وہ ساکھو کا ڈالا تھا۔ سینۂ پُر کینہ تنگ۔ چھاتیوں کے تکّے تکّے کی صورت لٹکتے، دمِ رفتار ٹانگوں میں اٹکتے۔ پیٹ کے پیٹ کی انتہا نہیں، بے خاکِ گُور کبھی بھرا نہیں۔ دل پہاڑ کی سِل۔ گُردہ توپ کا مُقابل۔ بغلوں سے کیچڑ بہتی۔ ناف جیسے گھنٹا بیگ کی گڑھیا۔ ٹانگ ہر ایک تاڑ سے بڑی۔ کھڑی ہو تو سقفِ بے سُتوں کی اَڑواڑ ہو، گنبدِ چرخ کی پاڑ ہو۔ پھیلائے پڑی تھی، گویا پتھورا کے محل کی کڑی تھی۔ ہڈّی سے گوشت، گوشت سے کھال جُدا۔ پیر زال، فرہاد کُش بُڑھیا۔ چہرے کا یہ رنگ کہ سلہٹ کی سِپَر کا اُس کے رُو بہ رُو مُنہ سفید ہو جائے، شبِ فُرقت کی سیاہی میں کالی بلا سی نظر آئے۔ گھونبڑ کا وہ ڈھنگ کہ سب کہتے تھے: ہیچا ہے، لڑکوں کو نہ ڈرائے۔ ماتھے پر سیندُور کا ٹیکا دور سے نظر پڑتا اور سفید چونڈا چنوَر کی طرح لٹکتا۔ سیاہی کا دھبّا بجُز تیرہ بختی کہیں نہ دیکھا۔

ایسے سر کی مانگ میں بھی مانگ جا نچ سیندور بھرا۔ بالوں میں ناریل کا تیل۔ پھٹے پھٹے دیدوں میں ندیدوں کی طرح کاجل ریل پیل۔ گہنے کے عوض سانپ بچھو لپیٹے، کھوپڑی اور ہڈیوں کے ہار گلے میں پڑے، سحر کا سنگار وہ نابکار کیے، پُشت بہ بہشت، رُوئے نحس سوئے جہنم، چت پڑی تھی۔ قد کا ڈول سب سے نرالا، عوج بن عنق کی سگی خالہ۔ یہ دیکھ کے، شہ زادہ پیر مرد کو ساتھ لے کے محل سرا کے خیمے میں آیا۔ شہ زادیوں نے جان پائی، جلیسوں کے مُنہ پر رونق آئی۔ خواصوں نے شکرِ جنابِ باری کیا۔ ماما، اصیلوں نے پیر مرد کے قدم پر گر کر عرض کیا، مصرع :

اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما

اُس بزرگ نے فرمایا : ابھی اِس مَعرکے سے نجات نہیں ہوئی، آفتِ عظیم کا سامنا باقی ہے۔ جانِ عالم نے پوچھا : قبلہ ! وہ کیا ہے ؟ اُس نے فرمایا : اِس کا باپ شہنشاہِ جادواں ہے؛ کوئی دم میں ضرور آئے گا، بکھیڑا مچائے گا۔ ملکہ مہر نگار مُضطرب ہوئی۔ پیر مرد نے فرمایا : اللہ یار ہے، وہ کیا نابکار ہے۔ مصرع :

دشمن اگر قویست، نگہباں قوی تراست

یہ کہہ کر دو ماش چپ و راست پھینکے۔ دو جانور نئی صورت کے پیدا ہوئے : ہرن کے چہرے، طاؤس کا دھڑ، یاقوت کے سینگ، الماس کی آنکھیں، زمرد کے پر۔ اور دو ٹھیکریوں پر کچھ لکھ کر

اُن کے سامنے رکھا۔ وہ ہر ایک پنجے میں دبا اُڑ گیا۔

وہ رات بھی بیم و ہراس میں گزری۔ جس وقت ساحرِ شب گشت عاملِ صُبح کی آمد کے دَبدبے سے بھاگا؛ ہَوا تُند چلی، برق چمکی، رَعد کی آواز ہوئی۔ اہلِ لشکر ڈر گئے۔ مَثَلِ مشہور: مار گزیدہ از رِیسمانِ پیچیدہ می ترسد۔ پیر مرد کے گِرد سب جَمع ہوئے، کہ ایک سِمت سے غُول کے غُول، غَٹ کے غَٹ جادوگروں کے جھٹ پَٹ؛ باز، جُرّے، باشے، بُھجنگے پر ننگے دَھڑَنگے سوار، قَطار قَطار آئے۔ میدان میں مُرشِدِ کامل نے اِن کا پَرا جمایا۔ دوسری جانب سے جادوگرنیاں طاؤس اور ناگنوں پر سوار، آتَش بازی کے حُقّے اُڑاتی، ناریل اُچھالتی؛ اِکتارے چھڑتے، بادلے کی جھنڈیاں کُھلی، ہَوا سے اُڑتی ہوئیں؛ آپَس میں چھیڑ چھاڑ، سِحر آزمائیاں، ہاتھوں کی صفائیاں ہوتی، لڑائی کے عزم پر ہَرہَر کرتی موجود ہوئیں؛ اُسی پَرِے کے مُقابِل ٹھہریں۔

اِنھیں دیکھ کے جانِ عالَم کا جی کُلبُلایا، فوج کے سرداروں کو بلایا، فرمایا: گو آج دَغدَغۂ کامل ہے؛ اگر فضلِ الٰہی شامل ہے تو یہ جلسہ اور مَعرکہ دیکھنے کے قابل ہے۔ زندگی ہے تو ایسا روز کبھی کا ہے کو نظر سے گزرے گا، دگرنہ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ ہماری فوج بھی چمک دمک سے صَف آرا ہو، اسباب نیا سب نکالو۔ یہ خبر سُن کر پہلے بیلدار نکلے۔ پَست و بَلند زمین ہموار کر، کنکر پتّھر چُن کر، جھاڑی جھنڈی کاٹ ڈالی، جھاڑی ہوئی زمین صاف برابر نکالی۔ پلٹنوں کی خاطر مورچے درست کیے،

توپوں کے لیے دَمدَمے باندھے، جھانکی لگائی۔ کہیں سُرنگ کا پوشیدہ رنگ جمایا، باروت کو بچھایا، میدانِ جنگی بنایا۔ پھر سقّے آب پاشی کر گئے۔ توپ خانے والے بانچوں میں پانی بھر گئے۔

فوج کی آمد ہوئی۔ صفِ کارزار، موت کا بازار آراستہ ہوا۔ راس و چپ پانچ پانچ سے ہاتھی مست؛ پٹّے سونڈوں میں، گُل کاری بھسونڈوں میں۔ دانت سفید، آب دار، اُن پر چوڑی جواہر نگار چڑھی۔ ایک ایک پہلوان ثانیِ رستم دستاں؛ قوی ہیکل، زرہ پوش؛ گُرزِ گراں، کوہ شکن بردوش اُن پر سوار۔ پھر پلٹنیں اور توپ خانہ آیا، اُنھیں قرینے سے جمایا۔ کیا کیا توپ فلک شکوہ، شعلہ دہاں، آتش فشاں؛ سورج جھنکار اور نانک متّے کے پیتے کی، گردونِ گرداں پر چوٹ کرنے والی، غضب سے بھری، ترحّم سے خالی۔ مدد کو ہُوٹ، کوسوں کی چوٹ کی۔ اور وہ غُباری، جس کا گولہ قصرِ زرنگاری میں اُتارے۔ پھر سواروں کے پرے میں میمنہ، میسرہ، قلب، جناح، ساقہ و کمیں گاہ درست کر دیا۔ آگے ہراول۔ پیچھے سواروں کے پیدل فوجوں کے دَل۔

نقیب چار سُو سے نکلے؛ کلّے سے کلّہ، کنوتی سے کنوتی، پُٹھے سے پُٹھا، دُم سے دُم، سُم سے سُم مِلا دیا۔ نشان برداروں نے علَمِ سبز و سُرخِ زر افشاں کو جلوہ دیا۔ سرِ ہر علَم ماہیِ پرچم کی چمک چشمِ دلاوراں میں بادۂ جُرأت کا کام کر گئی۔ نامردوں کو ہَول ہوئی، بھاگنے کی فکر پڑی، پیٹ میں کھلبل مچی۔ کتنوں کی، چلتے چلتے گانڑ چلی۔ دریاے فوجِ ظفر موج موج زن ہوا۔ حشر کا میدان رَن ہوا۔ غرّشِ کوسِ حربی، صداے نقّارخانۂ جنگی چرخ پر برجِ ثور تک،

زیرِ زمیں گاوِ ثری کو پہنچی۔ اور صدمۂ دمامۂ تندرِ نہیب، آوازِ دہلِ گوش فریب سے کُرۂ اَرض و سما دہل گیا۔ اور کرنائے چینی نے غریو سے صوُر کی ہمدمی کا دم بھرا۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا کا وقت قریب آیا۔

جانِ عالم بھی بہ صد جاہ و حشم اسپِ پری پیکر پر جلوہ گر ہوا۔ چترِ زرنگار بالائے سر، تاجِ شہر یاری کج کر کر، شمشیرِ برق دم زیبِ کمر، فولادی سپر پُشت پر۔ دہنے ہاتھ میں نیزۂ اژدہا پیکر، دو زباں۔ بائیں ہاتھ میں مرکبِ رشکِ صرصر کی عناں۔ فتح و نُصرت جلو میں، اِقبال یاور تگ و دو میں۔ ہمّت و غیرت دست بستہ بہم، جرأت زیرِ قدم۔ قربُوسِ زیں میں کمانِ کیانی، چہرے پر رُعب و جلالِ کشور ستانی۔ سمندِ صبا دم کو گرمِ عناں، رخشِ تیز قدم کو جولاں کر کے پرے کے برابر باگ لی۔ چاؤشِ طرّار "خبردار باش" للکارا۔ مرّیخ سا خنجر گُذار، بالائے چرخ "اَلْاَمان" پکارا۔ فوج کو ملاحظہ فرمایا۔ کڑکیتوں نے کڑکا شروع کیا۔ نقیبوں نے نہیب دی کہ دِلاورو! آج عرصۂ جنگ جگہ نام و ننگ کی ہے۔ دُنیا میں زِندگی چار دِن ہے۔ لڑنے بھڑنے کا، نوجوانو یہی سِن ہے۔ کسی کو بقا بجز ذاتِ خدا نہیں۔ ہمیشہ دُنیا میں کوئی جیتا رہا نہیں۔ شعر:

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا①

مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

اِس صدا سے، جو سدا کے بہادُر، صاحبِ جُرأت تھے؛ اُن کا دریاے شجاعت سینے میں مَوج زَن ہوا۔ موچھیں کھڑی، آنکھیں سُرخ، چہرے بَشّاش ہوگئے۔ بَسانِ شیر وہ دلیر قبضہ ہاے شمشیر دیکھنے لگے اور چُست و چالاک ہو کر مُستَعِدِ کارزار ہوئے، جاں فِشانی کو تیّار ہوئے۔ ہر دم باہم یہ اِخْتِلاط تھا: دیکھیں، آج تلوار کس کی خوب کاٹتی ہے! کس کس کا لَہو چاٹتی ہے! پہلے نیزہ کس کا سینۂ عدُو پر چلتا ہے! اور نیزے کی طَعْن پر کون کون چھاتی تانتا ہے، لَوہا کون مانتا ہے! کس کے تیر کے نِشانے سے خون کا فُوّارہ اُچھلتا ہے! آبِ پَیکاں سَرِ میداں دُشمن کے حَلْق میں کون اُتارتا ہے! سَرِ پیکاں کس کا تالَبِ سوفار سُرخ رُو ہوتا ہے! کس کو کون للکار کر، ڈانٹ کر مارتا ہے، دَدا کو کون پکارتا ہے! عرصۂ کارزار میں حَقِّ نمک آقا کا ادا کیجیے، دشمنوں کا لہو پیجیے۔ جب بِگڑے تو وہ کام بنے جس سے رُستم کی گُور تھرّائے، سام و نَریمان کا رنگ فَق ہو جائے۔ کُوہ کو بَرِ کاہ کی طَرح اُکھاڑے۔ دِیو سامنے آجائے تو پچھاڑے۔ رئیسِ قَدرداں سَرِ میداں سَرگرمِ نظّارہ ہے؛ دیکھیے کون کام کا ہے، کون ناکارہ ہے! کس کے ہاتھ کھیت رہتا ہے، کون کون کھیت رہتا ہے! مَن چلا پَن کر لو، زرِ سُرخ و سفید سے سِپَریں بھر لو۔ آج ہی تو آن بان ہے۔ یہ گُو، یہ میدان ہے۔

ڈِھل گنڈوں کا 'لاحولَ وَلا'، عجب ڈَول ہوا کہ ہَول سے

چہرے زرد ، لب پر آہِ سرد۔ مُنہ پر ہوائیاں اُڑتی تھیں ، ہر بار بھاگنے کو باگیں مُڑتی تھیں۔ کھڑے ہوئے اپنے مُنہ نوچتے تھے ، بھاگنے کی راہ سوچتے تھے۔ پیٹ پکڑے پھرتے تھے ، دست سَرِ دست چلے آتے تھے۔ ڈر کے مارے بے مارے مُوئے جاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا : میاں ! جی ہے تو جہان ہے۔ نوکری نہ ملے گی، بھیک مانگ کھائیں گے ، جانیں کہاں پائیں گے! حُرمت گئی تو گئی، جوتی پیزار سے، جان تو رہے گی، لہو کی ندی بدن سے نہ بہے گی۔ یہی نا کوئی نامرد کہے گا ، آبرو جائے گی ؛ جی تو رہے گا۔ یہاں بگڑی ، اور کہیں بنالیں گے۔ تیر تلوار کی گولی بچاکر، گالیاں کھالیں گے۔ لڑنے کو سپاہیوں نے کمریں باندھی ہیں ؛ کوسنے کو ہم موجود ہیں ، کوسوں بھاگنے کو آندھی ہیں۔ جوکیں لگانے میں ، ہمارے ماں باپ بھنگ پلاتے تھے ، معجون کھلاتے تھے۔ کسی کی فصد کھلی دیکھ کر ہمیں غش آتے تھے۔ ہم تو دوست ہو یا دشمن ، دونوں کی خیر مانگنے والے ہیں۔ سب سے پہلے مَعرکے سے بھاگنے والے ہیں۔ ہمیشہ گالی گلوچ کو خانہ جنگی ، ڈھول دھپے کو میدان داری سمجھے۔ لڑائی بھڑائی سے کبھی بھڑ کے نہ نکلے۔ تمام عمر بدن میں سوئی نہ گڑی۔ یہ سر وہ سِپَر ہے جس پر جوتے کے سوا کوئی چیز نہیں پڑی۔ بے غیرتی کا بھلا ہو، جس کے صدقے میں آج تک جان سلامت رہی۔ اِس پر بھی قسمت نے یہ روزِ سیاہ دِکھایا ! خُدا نے ہمیں ہیجڑا کیوں نہ بنایا !

فوج میں تو اِس طرح کی کھلبل، ہلچل مچی تھی ؛ اُدھر انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار نے ایک اونچا ٹیکرا تجویز کر، خیمہ بپا کیا۔ چلمن چھوڑ آ بیٹھیں، سیر دیکھنے لگیں۔ اِس عرصے میں لشکرِ غنیم کی آمد ہوئی، یعنی شہپال جادو سیاہ رُو نولاکھ ساحر کا پرا ہمراہِ رکابِ شکست انتساب لے کر، تخت پر سوار، چالیس اژدرِ خوں خوار تخت اُٹھائے، شعلے نکلتے، بھاڑ سا منہ ہر ایک پھیلائے۔ بڑے کرّ و فر سے آیا۔ فوجِ بے قیاس وہ خدا ناشناس لایا اور سامنے جوانانِ تہمتن و گُردانِ صف شکن کے اپنا پرا جمایا۔ پھر علَم کالے آگے نکالے اور پرچمِ سیاہ ہم صورتِ بخت اُس گم راہ کے، کھُلے۔ دَف و نَے اور جھانجھ بجنے لگے، اِدھر کُوس و کُورگرجنے لگے۔ دونوں لشکر لڑائی پر تُلے۔ وزیر اُس کا کچھ پیام پہلے پیرمرد کے پاس لایا، دستِ ادب باندھ کر عرض کی: اِیلچی کو زوال نہیں، زیادہ گوئی کی مجال نہیں، شہپال نے فرمایا ہے: تمھارا جینا مرنا برابر ہے کہ گرم و سردِ زمانہ دیکھ کر عمرِ طبعی کو پہنچے ؛ مگر اِن نوجوانوں پر، اپنے بےگانوں پر رحم نہ کیا۔ اِن کے خون کا حساب اپنے اعمال کی کتاب پر لکھوایا، بوجھ اپنے ذِمّے لیا۔ پیرمردِ خوش تقریر نے فرمایا: اُس اَجَل رسیدہ پیرِ نابالغ سے کہنا: طرفین سے جس کا خون زمین پر بہے گا؛ اُس کا مَظلِمہ، مُواخَذَہ؛ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی، اُس کی گردن پر رہے گا۔ ہم سمجھتے تھے وہی ننگِ خانداں تھی ؛ لیکن اب معلوم ہوا: وہی زمین سے اُگتا ہے، جو بوتے ہیں ؛ ایسوں کے ویسے ہی ہوتے ہیں۔ تجھے سفید ڈاڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مری، تیرا کلنک کا ٹیکا مٹا۔

تؤ تو اُس سے زیادہ بے حیا، بیہ قلب نکلا۔ یہ مقامِ رزم ہے جائے نیزہ و شمشیر، یا بزم ہے جو محلِ تقریر ہو؟ گفتگو بے فائدہ ہے، لاطائل باتوں سے کیا حاصل۔ جو منظور ہو، بسم اللہ، اُس میں دیر نہ کر۔ دیکھیں آج کس کے حصے میں تخت و تاج ہوتا ہے اور گور و کفن کو کون محتاج ہوتا ہے!

وزیر مجذوب پھرا، شہپال سے سب حال کہا۔ پھر تو وہ کافرِ غدار، گبرِ ناہنجار مثلِ مارِ دُم بُریدہ برخود پیچیدہ ہو، شعلۂ غضب سے وہ ناری جل گیا۔ چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ پہلے تو آپ حقۂ آتشی پیرمرد پر مارا، پھر لشکر کے سرداروں کو، جادوگرناہنجاروں کو للکارا۔ دو پہر تک عجیب و غریب سحر سازی، ہنگامہ پردازی، جادوگر اور جادوگرنیوں کی لڑائی رہی کہ دیکھی نہ سُنی۔ کسی نے کسی کو جلایا، کسی نے بجھایا۔ کسی سنگ دل نے پتھر برسائے، سب کچھ سحر کے نیرنگ دکھائے۔

آخر کار جب جادوگری ختم ہوئی، لڑائی کی نوبت بہ گرز و شمشیر و نیزہ و تیر آئی؛ پھر تو شہ زادۂ جانِ عالم کی بن آئی، باگ اُٹھائی۔ فوجِ جرارِ غازیانِ نام دار خبردار ہوئی، سپاہ مانندِ ابر چار سمت سے گھر آئی۔ صف کی صف دھڑ دھکی، برقِ شمشیر چمکی۔ پہلوانوں کے نعرے نے رعد کا کام کیا۔ خوب لوہا برسا، بوند بھر پانی کو ہر ایک زخمی ترسا۔ یہ سب تازہ دم، وہ دو پہر کے شل، سیکڑوں ٹاپوں میں کچل گئے، گھوڑوں کی جھپٹ میں کھندل گئے۔ شمشیر

صاعقہ خصالِ جانِ عالم کا یہ حال تھا: جس کے سر پر پڑی، خُود و سر اُس خُود سَر کا کاٹا۔ حَلق میں قطرۂ سیماب کی طرح اُتر، سینۂ پُر کینہ کا لہو چاٹا۔ وہی سر جو پناہِ خُود میں تھا، پلک جھپکی تو گُود میں تھا۔ پھر گھوڑے کے تنگ سے چُست گزر، زخم کشادہ کر، خانۂ زیں سے زمین میں قرار لیا۔ سَرِ بالیں اُس کے قضا کو رُوتے دیکھا، اُسے خوابِ مرگ میں پاؤں پھیلائے سُوتے دیکھا۔ مَلَکُ المَوت کی صدا آئی: وہ مار لیا۔ جس پر لپک کر ایک وار کیا، دُو کیا؛ دُو کو چار کیا۔ حَواسِ خمسہ کسی کے درست نہ تھے، ششدر ہو گئے۔ ساتوں طبق زمین کے تھرّائے، آسمان کو چکر ہُوا، مُردے قبروں سے چونک کے باہر نکل آئے۔ جو اَٹکا، اُسے مار لیا، بھاگتے کا پیچھا نہ کیا۔

گھڑی بھر میں خون کا دریا بہ گیا، لاشوں کا اَنبار رہ گیا۔ کاسۂ سَر حَبابِ دریا کی طرح بہتے نظر آتے تھے۔ مَوجِ خوں میں دَھڑ، دَھڑا دَھڑ غُوطے کھاتے تھے۔ دشمنوں کی کشتیِ زیست طوفانی تھی، آبِ تیغ کی طُغیانی تھی۔ فوجِ عدو کا زندگی سے دل سیراب اور اُچاٹ تھا۔ لہو لہان ہر تلوار کا گھاٹ تھا۔ کُوسوں تک لاشے پٹے تھے، یہ پاٹ تھا۔ آخر کار فوج کو شکست ہوئی۔ شَہپال کو مارا، سر اُس خُود سَر کا مِثلِ خیارِ تَر اُتارا۔ سپاہِ باقی ماندہ اُس تیرہ بخت، نِگُوں نسار کی فَرار ہوئی، زندگی دشوار ہوئی۔ پھر تو غازیانِ فتح نصیب و جادُوانِ مُہیب لوٹ پر ٹوٹ پڑے۔ سب کچھ لوٹا، ساز و ساماں اُن کا ذرّہ نہ چھوٹا۔

اِدھر نشان کُھلے، شادیانے بجے۔ وہ سب چادر پھراتے، ماتم کرتے، گِریباں چاک، سَر و رُو آغشتۂ خاک، دَمِ سرد بھرتے، جس کا مُنہ جدھر اُٹھا، بھاگ نکلے۔ میدان کُشتوں سے اَٹ گیا۔ جنگل لاشوں سے پَٹ گیا۔ آج تک طُعمۂ زاغ و زَغَن اُسی بَن سے ہے۔ صَحرائی دَرِندوں کے خوب پیٹ بھرے؛ بلکہ جانوروں کی دعوتوں کو، گوشت کے مُچّے قیمہ کیے اُٹھا رکھے۔ بہت ہَیضہ کر کر مرے۔ وہ سَرزمیں، قَلْعَہ، خَزانہ جانِ عالم کے قبضے میں آیا۔ بڑی جُستجو، تگاپُو سے وہ لَوح اور نقش پایا۔ پیر مرد رخصت ہوا اور جتنے مَدارِجِ پند و نصیحت تھے، مُکرّر سمجھائے۔ راہ کا خطَر، مصیبتِ سفر، ہر منزل و مَقام کا نَفْع و ضَرَر کہہ کر، کہا: میری جان! اب ایسی حرکت، وہ سامان نہ کرنا جو پھر کوئی روزِ سیاہ دشمنوں کے سامنے آئے، دوستوں سے دیکھا نہ جائے۔ ہم سے باغ چھوٹے، کوہِ الم ٹوٹے۔ تُو اللہ حافِظ و ناصِر رہے! رسول اُس کا تمھارا مددگار و یاوَر رہے!

روانہ ہونا شہزادۂ جانِ عالم کا اُس دشت سے بافتح و ظفر اور اُترنا دریاے شُور کے کَنارے پر۔ آنا جہاز کا، سوار ہونا یارانِ دم ساز کا۔ پھر جہاز کی تباہی، باہم کا تَفرِقَہ، معشوقوں کی جُدائی۔ پھر جوگی کا سمجھانا،

توتے کا مل جانا، ڈوبتوں کا ترنا۔

آشنایانِ بحرِ تقریر و غوّاصانِ محیطِ تحریر، شناورانِ شطِّ اُلفت و غریقِ لُجّۂ محبّت نے گوہرِ آب دارِ سخن کو سلکِ گفتار میں منسلک کرکے زیبِ گوشِ سامعانِ ذی ہوش اِس طرح کیا ہے کہ بعد فتحِ جنگِ جادو شہپال اور ہاتھ آنے خزانۂ مالا مال کے، ڈو مہینے تک تفریحاً لشکرِ نُصرت اثر شب و روز اُس دشت میں جلوہ افروز رہا۔ جب پیرمرد باغ کو تشریف فرما ہوا، جانِ عالم نے کوچ کیا۔ چند مدّت کے بعد ایک روز خیمہ لبِ دریاے شور ہوا۔ شہ زادہ معشوقوں سے باہم، تماشا بحرِ زخّار و نظّارہ امواجِ پیچ دار کا اور سیر دریاے ناپید اکنار کی، پانی کا زور، ہوا سے دریاے شور کا شور، کیفیتِ لطمہ و گرداب دیکھتا تھا، دید دریائی جانوروں کی کرتا تھا۔ نظم:

آب کیسا کہ بحر تھا زخّار   تُند و موّاج و تیرہ و تہ دار ①
موج کا ہر کنایہ طوفاں پر   مارے چشمک حباب، عمّاں پر
گُذرِ موج جب نہ تب دیکھا   ساحل اُس کا نہ خشک لب دیکھا

ناگاہ ایک جہاز پُرتکلّف، با نقش و نگارِ بِسیار صبا وار نمودار ہوا۔ شہ زادہ سمجھا: کوئی سوداگر کہیں جاتا ہے۔ جب قریب آیا، جہاز کو لنگر کیا اور ناخدا درِ دولت پر شرف اندوز ہوکر عرض کرنے لگا: ہم لوگ ملّاح ہیں؛ یہاں جو شاہ و شہریار رونق افزا

ہوتا ہے، ہم اُسے دریا کی سیر و شکارِ بحری، جانورِ آبی دکھاتے ہیں۔ مُوافقِ قَدْر، جو قسمت میں ہوتا ہے، انعام پاتے ہیں۔ یہ سُن کر خواہشِ سیرِ دریا شہ زادے کے سفینۂ دل میں موج زَن، لَطْمہ پیرا ہوئی، ملکہ سے کہا: چلتی ہو؟ اُس نے عرض کی: ہَنُوز گردابِ غم، تَلاطُمِ اَندوہ و اَلَم سے ساحلِ فرحت و طَرَب کی ہَم کِناری مُیسّر نہیں ہوئی؛ آپ کو اور لہر آئی، نیا ڈھکوسلا سوجھا۔ جانِ عالم نے کہا: دریا کی سیر جی مسرور کرتی ہے، خَفْقان دور کرتی ہے، طبیعت بَہَل جاتی ہے، لاکھ طَرح کی کیفیت نظر آتی ہے۔ تم نے سُنا نہیں قولِ سعدؔی، مصرع:

بدریا در مَنافع بے شمار است①

دو چار گھڑی دل بہلا چلے آئیں گے، ملّاح محروم نہ رہ جائیں گے۔ ملکہ مہر نگار نے مُتَرَدِّد ہو کر کہا: یہ سب سچ ہے جو آپ نے فرمایا، خَفْقان کیسا، تمھارے دشمنوں کو نِرا مالیخولیا ہے، میں نے بارہا انجمن آرا سے کہا ہے؛ سو یہ مَرَض لادَوا ہے، پانی سے دُونا ہوتا ہے۔ اِس کے سِوا، میرے دماغ میں بھی کیا خَلَل ہے؟ میرا دوسرے مصرِع پر عَمَل ہے، سعدؔی:

اگر خواہی سلامت، بر کنار است②

شہ زادہ بدمزہ ہوا، فرمایا: خَیر ہم تو سِڑی ہیں، تنہا جائیں گے؛ تم نہ چلو، بیٹھی رہو، آرام کرو۔ جُدائی کی تاب مَحبّت کے مُبتَلا کو کہاں ہے، اُلفت کا یہی بڑا امتحاں ہے؛ ناچار اُسی دم ملکہ مہر نگار اُٹھی اور

انجمن آرائیِ چند خَواص ہمراہ ہوئیں، جہاز پر پہنچیں۔ بادبان کھنچے، پالیں چڑھیں۔ مہر نگار مُضطَرِب وار یہ شعر پڑھنے لگی، حزیں:

دریں دریاے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا ①

دل افگندیم بِسمِ اللہِ مَجرِہَا وَ مُرسٰہَا

لوگ مصروفِ تماشا، ملکہ غَریقِ بحرِ تفکُّر، غُوطہ زَنِ گردابِ تَحَیُّر، نَطْمَۂ اَنْدُوہ و اَلَم کی آشنا۔ بار بار انجمن آرا سے کہتی تھی: خدا خیر کرے! دشمن نہ ایسی سَیر کرے! بے طَور موجِ اَلَم سر سے گزرتی ہے، خود بہ خود پانی دیکھ کر جان ڈرتی ہے، اللہ حافظ و نگہباں ہے۔ سَراسَر سامانِ بد نظر آتے ہیں، کلیجا خوف سے لَرزاں ہے۔

اَلْقِصّہ، چار گھڑی جہاز نے بادِ مُراد پائی، سَیر دِکھائی، پھر آفت آئی۔ ناخُدا چِلّایا، مَلّاح ہِراساں ہوئے۔ شہ زادے نے پوچھا: کیا ہے؟ عرض کی: طوفانِ عظیمُ الشّان اُٹھا ہے۔ ابھی یہ ذِکر تھا، ہَوا عالَم گیر ہوئی، جہاز تباہی میں آیا، بادبان ٹوٹ گئے، مَستول گرا؛ مَلّاحوں کے چھکّے چھوٹ گئے، سنبھالنے کا مقدور نہیں رہا۔ آخِرش تَلاطُمِ آب، صدمۂ پیچ و تابِ موج سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ملی، کون ڈوب گیا، کون جیتا رہا۔ ایک سے دوسرا جُدا ہو گیا۔ جانِ عالَم تختے کے سہارے سے ڈوبتا ترتا، چار پانچ دن میں کَنارے لگا۔ جب تکان پانی کی موقوف ہوئی، غَش سے آنکھ کھُلی، دیکھا: کَنارے گیا ہوں، بلکہ گُور کے کَنارے لگ رہا ہوں۔

بڑی جِدّ و کَد سے اُترا، آہستہ آہستہ بیٹھتا اُٹھتا ایک طرف چلا، بستی میں پہنچا۔ وہاں کے باشندے اِس کا چہرہ اور جمال، یہ خراب حال دیکھ کر بہت گھبرائے، قریب آئے۔ کوئی بولا: یہ پری زاد ہے، مثلِ سَرْو آزاد ہے، چمنِ حُسن و خوبی کا شمشاد ہے۔ کسی نے کہا: ابھی تو دِن ہے، یہ از قسمِ جن ہے۔ غَرَض کہ جن جن نے اِسے جِن کہا تھا، پاس آ، کچھ خوف سا کھا اِس طرح بولے، اُستاد، مصرع:

کون ہو، کیا ہو، سچ کہو حور ہو یا پری ہو تم①

شاہ زادۂ مَصائب دیدہ نے دمِ سرد دلِ سوختہ سے بھر کے، چشمِ خوں بار تَر کر کے اُن لوگوں سے کہا، لاَ اَعْلَم:

حالے دارم چناں کہ دشمن خواہد
جانے دارم کہ فرقتِ تن خواہد
ناکامیِ خویش را اگر شَرح دہم
دشمن بخدا زندگیِ من خواہد

اَیُّھَاالنّاس! مَیں گُم کردہ کارواں، جَرَس کی طَرح نالاں ہوں۔ دل گرِفتہ، نقشِ پاے یارانِ رفتہ، حُمُق میں گرِفتار ہوں، بچھڑوں کا طالِبِ دیدار ہوں۔ غریبِ دِیار، بے تاب، دانہ نصیب ہوا نہ آب، مُفارَقتِ یارانِ چند سے خَستہ و خراب۔ ہوش و حواس یک لَخت زائل۔ ضُعف سَدِّ راہ، ناطاقَتی حائل۔ یاروں کی صورت نظر آئی نہیں، دیدۂ دیدار طَلَب میں بینائی نہیں۔ نہ تابِ رفتار، نہ طاقتِ گُفتار۔ مؤلّف:

بسانِ نقشِ پا بیٹھے جہاں، واں سے نہ پھر سر کے
ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا

بہ یادِ دوستاں پہروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے
کہیں مذکور جب ہوتا ہے کچھ گزرے فسانوں کا

عَلَم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظَفَر ہم کو
کہ باعث فتح کا ہوتا ہے، کھُل جانا نشانوں کا

چھُڑائے جبر سے پیرِ فلک نے دوست سب میرے
مٹے گا داغ کب دل سے مرے اُن نوجوانوں کا

شرر مُنْہ سے نکلتے ہیں سُرورِ دل حزیں ہر دم
بھلا دیواں ہو کیوں کر جمع ہم آتش بیانوں کا

اِس حکایتِ جاں سوز، شکایتِ چرخِ بے مِہر، غم اَنْدُوز سے سب رُونے لگے، کہا: یہ شاہ زادہ عالی تبار ہے؛ اِلّا، دل اَز دست دادہ، مجبوبوں سے دور فُتادہ، اِس سبب سے دل اَفگار ہے۔ مِنّت و سَماجت سے مکان پر لے گئے۔ ہاتھ مُنْہ دُھلوا کھانا پانی حاضر کیا۔ شہ زادۂ جانِ عالم نے آب و طَعام دیکھ کر رُو دیا، یہ کہا، اُستاد:

ہو خاک بھوک کی اُس فاقہ مست کو پھر جھانجھ ①
جو اپنا خونِ جگر، روز ناشتا سمجھے

خدا جانے میرے بچھڑوں کا کیا حال ہوا! کسی کو دانہ پانی مُیَسّر آیا، یا کچھ نہیں پایا! میں بھی نہ کھاؤں گا، بھوکا پیاسا اِسی کُوفت میں مرجاؤں گا۔ وہ بولے:

حضرت سلامت! کھانے پینے سے انکار نادانی ہے، اِسی سے بَشَر کی زِندَگانی ہے۔ جو جیتے ہو تو کسی روز بِچھڑوں سے مل جاؤگے، وگرنہ غُربت کے مرجانے میں گُور و کفَن بھی نہ پاؤگے۔ ناچار سب کے سمجھانے سے، دو ایک نوالے بہ جَبر حَلق سے اُتارے۔ پانی جو پیا، ہاتھ پاؤں سَنسنائے، پیہم غش آئے۔ جب طبیعت ٹھہری، سب حالِ پُر ملال، جہاز کی تباہی، اَنیسانِ ہَم راز کی جُدائی، اپنا ڈوبتے اُچھلتے وہاں تک آنا، اَوروں کا پتا نہ پانا بیان کر کے، بہ قولِ میرزا حُسین بیگ صاحِب یہ کہا، بَیت:

ہمرہاں رفتند و ما ماندیم و دُزداں در کمیں ①
خانۂ ملّاح در چین است و کشتی در فرنگ

سب تَاَسُّف کرنے لگے۔ ایک شخص نے کہا: یہاں سے دو منزل ایک پہاڑ ہے، کوہِ مطلب بَرآر نام ہے، اُس پر جُوگی کا مَقام ہے؛ مردِ باکمال، شیریں مَقال۔ ہزاروں کوس سے حاجت مند اُس کے پاس جاتے ہیں، سب کے مطلب بَر آتے ہیں۔ بس کہ اُس پر عنایتِ باری ہے، چشمۂ فیض اُس سے جاری ہے۔ مشہور ہے کہ آج تک کوئی شخص محروم، ناکام اُس مَقام سے نہیں پھرا۔ یہ مُژدہ سُن کر چہرے پر بَشاشَت چھاگئی، گئی ہوئی جان اُسی آن بدن میں آگئی، گھبرا کر یہ شعر پڑھا، حافظ:

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند آیا بُوَد کہ گوشۂ چشمے بما کنند ②

اُسی دم چلنے کا عَزم کیا۔ وہ لوگ مانع ہوئے، کہا: ابھی جانے کی طاقت آپ میں آئی نہیں، پاؤں میں راہ چلنے کی تاب و توانائی نہیں۔ دو چار روز یہاں آرام کرو۔ قوّت آجائے تو مختار ہو۔ غَرَض کہ جانِ عالم نے اُن لوگوں کے سمجھانے سے وہاں مُقام کیا۔ عجب پریشانی میں صُبح کو شام کیا کہ گِرد وہ سب حلقہ زَن، یہ بہ اَندُوہِ معشوقاں گِرِفتارِ رنج و مِحَن۔ کبھی تو مَحزُوں چُپ رہتا، گاہ مِثلِ مجنوں خود بہ خود بَکنے لگتا۔ اور جب حَواسِ خَمسہ دُرُست ہوتے، یہ خَمسہ پڑھتا، اُستاد:

ہر سو خبَرِ اُلفت کیا آپ سے پہنچائی ①
آگے بھی مرے لب پر فریاد کبھی آئی
کیوں مجھ سے بگڑتا ہے اُو کافرِ ترسائی
تا داشت دلم طاقت، بودم بہ شکیبائی
چوں کار بجاں آمد، زیں پس من و رُسوائی

گاہے مرے لب پر ہے فریاد، گہے اَفغاں
پیارے! غمِ دوری سے میں سخت ہوں اب نالاں
یہ جائے تَرَحُّم ہے، کر رحم ذرا جاناں
در زاویۂ الفت دور از تو چو مہجوراں
تنہا منم و آہے، آہ از غمِ تنہائی

ہے دن کو تو یہ عالَم ظالم، ترے مجنوں پر
ہیں گرد کھڑے لڑکے، جھولی میں بھرے پتّھر

سونے کی کسے فرصت، اے یار اِسے باور کر
شبہا منم و اشکے، وز خوں ہمہ بالیں تر
عشق ایں ہنرم فرمود، از عیب نفرمائی

اَعضا شِکنی گاہے، گہ دردِ جگر، دیکھو
رومال بھگوتا ہوں لاکھوں ہی کبھی رُو رُو
گردن زدنی ہوں میں، شکوہ کروں تیرا، گو
صد رنج ہمی بینم اے راحتِ جاں از تو
از دیدہ تواں دیدن چیزیکہ تو بنمائی

تھا تاب و تحمّل میں یکتا جگرِ خسرو
آگے تو نہ بہتی تھی سِلکِ گہرِ خسرو
تم اب تو نوازش لو چل کر خبرِ خسرو
بس دُر کہ ہمی ریزد از چشمِ ترِ خسرو
کز دست بروں رفت است سررشتۂ دانائی

آخر شِش، وہ رات کی رات بہ ہزار عقوبات تڑپ تڑپ کر سحر کی، نمازِ صُبح کے بعد پہاڑ کی راہ لی۔ چار دن میں ناچار وہ راہ طے کی، پہاڑ پر پہنچا۔ سنگِ سفید کا پہاڑ بہت آب دار، مانندِ ہمتِ جواں مردانِ صاف باطن سر بلند اور مثالِ طبعِ سخنوراں فرح افزا و دل پسند۔ دَرہ ہائے فَراخ کُشادہ، رُوشن۔ جوشِ نباتات، رُوئیدگیِ ریاحین و لالہ زار سے اور خروشِ مُرغانِ خوش اِلحاں سے رشکِ صد گلشن۔

چشمہ ہاے سرد و شیریں جا بہ جا، فرہاد کی روح کا ٹھیکا۔ ہر قِسم کا میوہ دار درخت قدرتِ حق سے اُگا، پھولا پھلا۔ پتّھر ہر ایک مَعدنِ لعل۔ پَرِند چَرِند صاحبِ حُسن و جمال۔ یہ سَیر دیکھتا چلا۔ ایک طرف درخت گنجان، گھنے؛ پُختہ مزار بیدار دِلوں کے بنے۔ اور مَنڈھی کا گُنبد بسانِ گُنبدِ گرداں، بیستوں کا جواب بنا۔ ترسُول کھڑا، کھارُوے کے جھنڈے پھُر پھُر اُڑتے، کلمۂ شَہادت بہ خطِ جَلی اُس پر لکھا صاف معلوم ہوا۔

جب اُس کے نزدیک آیا؛ دور دور تک مکان صاف، صَحن شَفّاف پایا۔ مَنْھ کے رُو بہ رُو درخت کے تلے چبوترے کے اوپر ایک جُوگی، سو سَوا سے برس کا سِن و سال، مگر ٹانٹھا کمال۔ ڈاڑھی ناف سے بڑھی، گرہ لگی۔ جٹا ہر ایک راکھ سے بھری، قدم بُوس ہو رہی، پاؤں پر پڑی۔ پلکیں دیدۂ حق بیں کا اَسرار چھپانے کو، چشمِ حاسد کی گزند بچانے کو مونچھوں سے مِلیں۔ جسم میں موجِ دریا کی طرح جھُرّیاں پڑیں۔ کمر میں کَردھنی مُونٹی سی مَہین بان کی، عجب آن بان کی۔ کھارُوے کا لنگوٹ سَترِ عَورتین کی اُوٹ۔ گلے میں محمودی کی کَفنی، سامنے گریبان پھٹا، کارِ سوزنی، سِر پوشیدہ نہیں، کھلا، حُقّہ چَوگانی مُنْھ سے لگا۔ اَفیونیوں کی شکل بنائے، شیر کی کھال بچھائے، بَھبُوت رَمائے، دید وا دید سے بہ ظاہر آنکھیں بند، مگر دیدۂ دل کُھلا۔ خموشی پسند، قَلبِ گویا بولتا۔ سوتا نہ جاگتا، آسَن مارے، دُنیا سے کنارے خُدا جانے کس پینک میں بیٹھا۔ پیٹ بیٹھ

سے لگا۔ تیر سا قدِ راست مثلِ کماں خمیدہ، گویا چِلّہ کھینچ چکا ہے۔ زُنّار آسا
رگیں عیاں۔ کھال سے ہڈیوں کے جوڑ شمعِ فانوس نمط نمایاں۔ تسبیحِ
سُلیمانی، ایمان کی نشانی ہاتھ میں۔ "ہر بھجو، ہر بھجو" تکیہ کلام بات میں۔ قشقہ،
ٹیکا ماتھے پر ہندوؤں کا، اور سجدے کا گھٹّا بذرِ کامل کی صورت چمکتا۔
زرد مٹّی بدن میں، ذِکرِ حق دل و دہن میں۔ کہیں مُصلّے پر سُبحہ و سجدہ گاہ
رکھی، کپڑے کی جانماز بچھی۔ کسی جا پوتھی کھلی، دھُونی رمی؛ دونوں سے
راہ رکھی۔ عجب رنگ کا انسان، خُلاصہ یہ کہ ہندو نہ مسلمان، بہ قولِ مرزا سودا:

کس کی مِلّت میں گِنوں آپ کو، بتلا اے شیخ! [1]
تو کہے گبر مجھے، گبر، مسلماں مجھ کو

ایک طرف تکیے میں دو چار کیاریاں، بیلے چنبیلی کی بہار، گُل کاریاں۔
کہیں مُرشدوں کے ڈھیر، گرُو کی چھتری، بزرگوں کے مزار؛ اُن پر
مَولسری کے درخت سایہ دار قطار قطار۔ درختوں کی ٹہنیوں میں
پنجرے لٹکتے، جانور باہم بحث کرتے، اٹکتے۔ فاختہ کی کوکو، قُمری کی
حق سِرُّہٗ، کوکُلا کے دم، سنّاٹے کا عالَم۔ کہیں مِرگ چھالا بچھا،
شیر چوکی دیتا، دھُونی لگی، لکڑ سلگتا۔ کسی جا ببر کی کھال کا بِسترا،
آہوے صحرائی اُس پر بیٹھا؛ اُداسا، تونبا، بے مِنّتا دھرا۔ ایک
سمت بھوانی کا مَٹھ، تُلسی کا پیڑ ہرا بھرا، گرد چشمہ پانی کا بھرا۔
جاے دل چسپ، مکانِ رُعب دار، گُلِ خود رُو کی جُدا بہار۔ ایک
طرف بھنڈارا جاری، کڑھاو چڑھا، موہن بھوگ ملتا۔ کہیں پُلاو،

قلیے کی تیاری، چھانڈا بٹ رہا تھا۔ کچھ مہنت بانکے، کچھ مُرید حال قال کے۔ کوئی چلّے میں بیٹھا، کوئی دُنیا سے ہاتھ اُٹھائے کھڑا۔ کسی کے خرقہ و تاج سر و تن میں، کوئی چو اگن میں۔ کہیں کتھا ہوتی، کوئی وعظ کہہ رہا۔ ایک طرف خنجری بجتی، تنبورا چھڑتا، بھجن ہوتے۔ ایک سمت حلقہ مُراقبے کا بندھا، توجّہ پڑ رہی، لوگ رُدتے۔ عجیب وہ گرو مرشد، غریب یہ مُرید چیلے۔ روز ایک دو کو مونڈتا۔ تیسرے چوتھے دن عُرس، ہر ہفتے میں میلے۔ حاصلِ کلام یہ کہ وہ عجب جلسہ تھا کہ دیکھا نہ سُنا۔ یہ اجتماعِ نقیضین آرام و چین سے۔

شہ زادے کے پاؤں کی آہٹ جو پائی؛ مردِ آگاہ دل، رُوشن ضمیر نے پلک ہاتھ سے اُٹھائی، آنکھ مِلائی۔ دیدے لال لال چڑھے پُر رُعب و جلال۔ جانِ عالم کو بہ غور دیکھا۔ اِس نے جُھک کر مؤدّب سلام کیا۔ اُس خوش تقریر، شیریں مقال نے کہا: بھلا ہو بچّہ! بڑی مصیبت فلک نے دکھائی جو یہ صورت یہاں تک آئی۔ آؤ بیٹھو، گرُو بھلا کرے۔ مُرشد کی دُعا سے حق، حاجت روا کرے۔ ہم تمھارے امانت دار ہیں؛ سواری کھڑی ہے، چلنے کو تیار ہیں۔

جانِ عالم متحیّر تو ہو رہا تھا، زیادہ حیران ہوا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ پاس جا بیٹھا۔ جوگی اُٹھا، چشمے میں جا کر نہایا۔ گیروا چادرا پھینک، سفید اوڑھ، عطر لگا، جانِ عالم کے نزدیک آ، یہ نکتہ زبان پر لایا: بابا! ایک دن ذوق شوق کے عالم میں ہمارے

مُرشِد گُرُو نے تیرے حال سے خبر دی تھی کہ ایک شہ زادے کا جہاز تباہ ہو جائے گا، وہ بہ سُراغِ مطلب یہاں آئے گا؛ اُس کا کام تجھ سے، تیرا کام اُس کے سامنے پورا ہو جائے گا۔

اِس بات کے سُننے سے شہ زادے کو نہایت مسرّت ہوئی، کہا: جوگی جی! تمھارے نام سے میری زِندگی ہوئی؛ وگرنہ دو چار دن میں گریبانِ صبر چاک ہو جاتا، میں سر پٹک کر ہلاک ہو جاتا۔ خوب صورتی کا بھی عجب مزہ ہے، جہان اِس کا شیدا ہے۔ عالَم کو مَرغوب ہے، طَرَح دار سب کا محبوب ہے۔ پیر فقیر، غریب امیر سب کو عزیز ہے۔ اِس کا خواہش مند ہر باتمیز ہے۔ جوگی سمجھانے لگا کہ یہ اِضطِراب عالَمِ اَسباب میں بیجا ہے۔ دیر آید، دُرست آید۔ بابا! دُنیا کا یہ نقشہ ہے: کسی شَے کو ایک وَضع پر دو گھڑی ثَبات و قرار نہیں۔ اِس کی نَیرنگی کا اِعتِبار نہیں۔ گاہ خوشی، کبھی غم؛ یہ دونوں اَمر باہم ہیں۔ کبھی وصل کی شام کو دِل کیسا بَشّاش ہوتا ہے، کبھی ہجر کی صُبح کو کلیجا پاش پاش ہوتا ہے۔ ایک شب بستر پر لذّتِ ہم کِناری ہے۔ ایک روز پہلو تہی، گریہ و زاری ہے۔ کبھی شبِ وصل کیا کیا اِختِلاط ہوتے ہیں۔ گاہ فَصل کے دن سر پیٹتے ہیں، رُوتے ہیں۔ آدمی جب رنج سے گھبرائے اور غمِ مُفارَقتِ دوست جان ہونٹوں پر لائے؛ دل کو یہ تسکین دے کر بہلائے، مصرع:

چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند [1]

مصرع:

در پسِ ہر گریہ، آخر خندہ ایست [2]

مُصحفی : زِندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن (1)
فصلِ گُل جیتوں کو پھر اگلے برس آئے گی

جو وصل میں راحت و آرام پاتا ہے؛ وہی ہجر کے دُکھ، قَلَق اُٹھاتا ہے۔ تو نے اُن دونوں بھائی، جو تَوَام پیدا ہوئے تھے، اُن کا قصّہ سُنا نہیں، کہ پہلے اُنھوں نے کیا کیا صُعوبت اُٹھائی، پھر ایک نے سلطنت پائی، دوسرے کے ہاتھ شہ زادی آئی۔ جانِ عالَم نے کہا: اِرشاد ہو، کیوں کر ہے؟

حکایتِ پُر عبرت، جاں سوز، حیرت اَفزا، غم اَندوز؛ یعنی سانحۂ برادرانِ تَوَام۔ جانا شکار کا، دامِ قضا میں پھنسنا طائرانِ پُر اعجاز، عجائبِ روزگار کا۔ پھر ایک نے سلطنت پائی، دوسرے کے ہاتھ بہ صد خرابی شہ زادی آئی۔

جوگی نے کہا: ایک شہر میں دو بھائی تھے تَوَام، پرورش یافتۂ ناز و نِعَم، رُوزگار پیشہ، نیک اندیشہ۔ سوائے رشتۂ برادری، سَررِشتۂ دوستی و اِتّحاد وہ نیک نِہاد باہم مُستحکَم رکھتے تھے؛ مگر دونوں کی طبیعت مُتوَجّہِ سیر و شکار، ہمّت مصروفِ سَیاحیِ دِیار دِیار تھی۔ ایک روز شکار کھیلتے جنگل میں جاتے تھے، ہرَن سامنے آیا۔ چھوٹے بھائی نے تیر لگایا، کاری نہ لگا۔ ہرَن

کنوتیاں اُٹھا کے بھاگا۔ دونوں نے تعاقب کیا۔ تمام دن رَوان ودَواں،
اُفتاں وخیزاں چلے گئے۔ قریبِ شام موقع پا کے بڑے بھائی نے جو تیر مارا، ہرن
ڈگمگا کر گرا۔ یہ گھوڑوں سے اُترے، ذَبح کیا۔ دن بھر کی دَوڑ سے
گھوڑے شَل، خود بھی مُضمَحِل ہو گئے تھے۔ تمام رَوز کے بے دانہ و آب،
بھوک پیاس سے بے تاب تھے۔ لکڑیاں چُن کر، پانی بہم پہنچا کر
کباب لگائے، بہ خوبی تمام دونوں نے کھائے؛ مگر اُس روز جو کیفیت اور
لذّت خُشک کباب میں پائی، مُرغ کی زِیرِ بریانی تر تَراتی کبھی ایسی
نہ کھائی تھی۔ پانی جو ڈَگڈَگا کے پیا، سُستی معلوم ہوئی اور رات بھی ہو گئی تھی؛ لیکن
شبِ ماہ، پورن ماسی کا چاند، اللہ اللہ! جنگل کی فِضا، سبزۂ نَورُستہ
جا بہ جا۔ اُنھوں نے کہا: آج کی شب اِس صحرا میں سَحَر کیجیے، چاندنی
کی بہار، صنعتِ پرَوَردگار دیکھ لیجیے۔ پھر دل میں سوچے کہ تنہائی کی
چاندنی گُور کے اندھیرے سے بدتر ہے۔ سچ ہے: جب ماہ رُو
بَر میں نہ ہو، تو نور نظر میں نہ ہو، اندھیرا اُجالا آنکھ میں برابر
ہے۔ ناسخ:

دھوپ بہتر، پر شبِ فرقت کی بدتر چاندنی ①
صاعقے کے طَور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی

خیر، یہ دونوں ایک درختِ سایہ دار چشمے کے قریب دیکھ؛ شَطرَنجی،
چاندنی تو ہمراہ نہ تھی؛ زِین پُوش چاندنی کے عِوَض بچھا، چاندنی
کی سَیر کرنے لگے۔ باگ ڈور سے گھوڑے اَٹکا دیے۔ چھوٹا بھائی

بڑا متین، ذی شعور، نکتہ سنج، دوربیں تھا، بڑے بھائی نے کہا:
آج ہم تمھاری عقل کا امتحان کرتے ہیں؛ بتاؤ تو اِس وقت ہمارے
شہر کا ہم سے کتنا فاصلہ ہے؟ اور یہ سمت کون سی ہے؟ تیسرے،
کباب کی لذّت، پانی کا زیادہ مزہ آج مِلا، اِس کا سبب کیا تھا؟
اُس نے جواب دیا: یہ باتیں سہل ہیں۔ شہر ہمارا یہاں سے سَو کوس
ہے اور دلیلِ کامل یہ ہے کہ بارہا تجربہ کیا ہے، میرا گھوڑا تمام دن میں
سَو کوس اِسی چال سے پہنچتا ہے۔ اور سمت، ستاروں سے ثابت
کہ شمال ہے۔ رہا کھانے پانی کا لطف، خلافِ وقت سے تھا؛
اِلّا، نیا مُقدّمہ یہ سُنیے: یقینِ کامل ہے کہ صبح کو عنایتِ خالق اور
مَددِ طالع سے وہ سامان مُہیّا ہو جو کدُورتِ سابق دور ہو،
آیندہ آسایش رہے، طبیعت مسرور ہو۔ بڑے بھائی نے
اِس کی وَجہ پوچھی۔ اُس نے کہا: آج سَو کوس کی مَسافت بہ صد
آفت طے کی، بھوکے پیاسے رہے، لیکن دل بشّاش ہے۔ وہ سُن کے
چُپ ہو رہا۔ یہ قصّہ رَفت و گُذشت۔

پھر مشورہ ہوا کہ یہ جنگل سُنسان، ہُو کا مکان ہے؛ یہاں
دَرِندہ و گزِندہ، سانپ بچھو، شیر بھیڑیے کے سوا پَرِندَہ، دَوِندَہ
نظر نہیں آتا؛ جو ہم تم دونوں سو رہے، تو اَلنَّوْمُ اَخُوالْمَوْتِ،
خُدا جانے کیا معاملہ رو بہ کار ہو۔ تین پَہَر رات باقی ہے؛ ڈیڑھ پَہَر ہم جاگیں،
پھر تم ہُشیار رہو۔ یہ صَلاح پسندِ خاطرِ طَرَفَین ہوئی۔ پہلے

بڑے بھائی نے آرام کیا، چھوٹے نے جاگنے کا سر انجام کیا۔ تیر و کماں ہاتھ میں اُٹھا ٹہلنے لگا۔ جب زُلفِ لیلائے شب کمر تک آئی؛ اُسی درخت پر دو جانور آپس میں اپنی اپنی توصیف و تعریف زبانِ بے زبانی میں کرنے لگے۔ اور یہ شخص بہت جانوروں کی بولی سمجھتا تھا، آواز پر کان لگائے۔ ایک بولا: میرے گوشت میں یہ تاثیر ہے: جو کھائے؛ ایک لعل تو پہلے دوپہر کے بعد اُگلے، پھر ہر مہینے مُنہ سے نکلے۔ دوسرا بولا: جو شخص میرا گوشت کھائے، اُسی روز بادشاہ ہو جائے۔

یہ باتیں سمجھ دل میں نہایت خوش ہوا۔ تیر و کماں تو موجود تھا؛ اِلّا اللہ کہہ کر، تیر بے تامّل چلّے سے جوڑ کر کھینچا۔ لبِ سوفار کان کے پاس آ، بہ وعدۂ نشانہ سرگوشی کرکے روانہ ہوا۔ قضا نے ہر چند اُن کے سر پر "خبردار" پکارا، کمان کڑ کڑا کر چلّائی کہ وہ مارا۔ رات کا تیر سراسری اُٹکر لیس؛ مگر مرگ جو درپے ہو گئی، کسی گوشے میں جان نہ بچی۔ پیکان سے تا سوفار دوسار ہوا، زمین پر پھد کر دونوں ایک تیر میں گر پڑے۔ اِس نے تکبیر بِلا تاخیر کہہ کے ذبح کیا، طائرِ روح اُن کا اُڑ گیا۔ دن کی لکڑیاں بچی پھر سُلگا کباب لگائے۔ جس کے گوشت میں سلطنت کا ذائقہ سمجھا تھا، اُسے کھایا۔ دوسرا، بھائی کے واسطے اُٹھا رکھا اور ایسا خوش ہوا کہ تمام شب آپ پاسبانی کی، بڑے بھائی کو تکلیف نہ دی۔ جَلَّ جَلالُہٗ! معاملاتِ قضا و قدر سے مجبور بشر ہے،

انسان کے قبضۂ قُدرت میں نَفْع ہے نہ ضَرَر ہے۔

مصرع: تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ

شعر: آنچہ نصیب است، بہم میرسد
ورنستانی، بہ ستم میرسد

جس وقت زاغِ شب نے بَیضہ ہائے انجم آشیانۂ مغرب میں چھپائے اور صَیّادانِ سحرخیز دام بَر دُوش آئے اور سیمرغِ زرّیں جَناح، طِلابال، غیرتِ لعلِ بدخشاں بہ صد عُظم و شاں قَفَسِ مشرق سے نکل کے گلشنِ زنگاری میں جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گُزری، رُوز ہوا؛ بڑا بھائی نیند سے جو چونکا، چھوٹے نے وہ کبابِ پَس ماندۂ شب، رات کے بچے رُو بہ رُو رکھے؛ وہ نُوش کر گیا، اور حال کچھ نہ کہا۔ دو گھڑی دن چڑھے جب لعل اُگلا، تب سمجھا: ہم نے بہت تدبیر کی، مگر سلطنت بڑے بھائی کی قسمت میں تھی۔ پھر وہ لعل بہ طَریقِ نَذر رُو بہ رُو لایا اور رات کا فَسانہ مُفَصَّل سب کہہ سُنایا، کہا: اللہ کی عِنایَت سے جلد آپ کو سلطنت حُصول ہو، یہ نَذرِ غُلام کی قبول ہو۔ اُس کو اِس کی سعادت مندی سے خُرسَندی حاصل ہوئی؛ پھر کہا: سامنے آبادی سی معلوم ہوتی ہے؛ ہم جا کر اِس لعل کو کسی دَلّال کے ہاتھ بیچ آئیں، تم گھوڑوں کے پاس رہو۔ اگر اپنے شہر چل کر یہ اَمر کریں گے؛ حاکم کا خوف مانِعِ کار ہوگا، مفلسی کے باعِث کس کو ہمارا اِعتِبار ہوگا۔ یہ کہ کر سمتِ شہر چلا۔

جس دم شہر کے دروازے پر پہنچا، خَلقَت کا اَنبوہ نظر پڑا۔

اُس ملک کا یہ مَعمُول تھا: جب وہاں کا بادشاہ دارُالسَّلطَنَتِ عَدَم کا تختْ نَشیں ہوتا؛ وَضیع و شریف شہر کے، سُوم کی رَسْم کے بعد، وزیرِ اعظم کے ہمراہ صُبح دَم تختْ لے کے دروازے پر آتے تھے؛ جو اُس روز پہلے مسافر باہَر سے آتا، اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ قَضارا، وہاں کا بادشاہ قَضا کر گیا تھا، لوگ تختْ لیے مُنْتَظِر تھے، یہ داخل ہوا۔ سب نے تختْ پر بِٹھا نَذْریں دیں۔ نَوبت و نشان، جُلوس کا سب سامان موجود تھا، دھوم دَھڑَکّے سے دیوانِ خاص میں داخل کیا۔ مُنادی ہوئی، بہ قَولِ مشہور: اِن کی رائی دُہائی نزدیک و دور ہوگئی۔ اِس کو سُرورِ سلطنت اور اَحکامِ مَمْلَکت کے باعِث اُس دن بھائی کا خَیال نہ آیا۔ دوسرے روز جب تختْ پر رونق اَفروز ہوا اور سامنے لعل آیا، تب بھائی کا خَیال آیا۔ فَوراً جاسوس، ہَرکارے درخت کا پتا بتا روانہ کیے، کہا: اِس صورت کا جوان اور دُو گھوڑے وہاں ہیں، جلد حُضور میں حاضِر کرو۔

وہ سب دوپَہَر تک تمام جنگل کی خاک چھان، حیران و پریشاں پھر آئے، عرض کی: تمام دَشْت میں پِھر کر پاؤں تُوڑے، نہ آدمی ملا نہ گھوڑے۔ وہ کچھ رنجیدہ ہو سلطنت کے شُغْل میں مَشغُول ہوا، بھائی بے چارے کو بھولے سے بھی کبھی یاد نہ کیا؛ مگر وہ لعل جِسے بیچنے کو لایا تھا، جس کے بَیعانے میں تختْ و تاج مُیَسَّر آیا تھا؛

فالِ مُبارَک اور بے نشان بھائی کی نشانی سمجھ، ہر روز سرِ دربار لاتا، ملازموں کو دِکھاتا۔ وہ سب بہ خاطِرِ شاہ واہ واہ کہتے، یہ سن کر خوش رہتے۔

حکایتِ پُرشکایت چھوٹے بھائی کی، نَقْل سِپہرِ بے مِہر کی کَج اَدائی کی۔ اُٹھا لے جانا جانورِ مُہیب کا، بدولتِ سوداگر کُنوئیں سے نکلنا اُس بَلانصیب کا۔ میرِ قافلہ کی بُرائی، شہ زادی تک رَسائی، پھر تقدیر کی بھلائی۔

صَیّادانِ طائِرِ مَعانی، ذی ہوش و دام دارانِ بلبلِ خوش بیانی، خانہ بَدوش نے حال اُس مُنتَظِرِ زیرِ درخت کا یہ لکھا ہے کہ ہَمہ تَن چشم مَحوِ اِنتظارِ برادرِ فراموش کار بیٹھا تھا؛ ناگہاں ایک جانورِ مُہیب، بہ شکلِ عجیب آیا اور پنجے میں داب کر اُڑا۔ گھوڑوں نے ڈر سے باگ ڈور تُڑا کے جنگل کا رستہ لیا، کود بھاگے۔ اللہ کی قدرت دیکھیے بڑا بھائی سلطنت کا مالک ہوا، چھوٹا بِچارا موذی کے چَنگُل میں پھنسا۔ وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّواب وہ جانور وہاں سے کتنی دور اُڑا۔ آخر کار تھک کر، ایک درخت کُنوئیں کی جَگَت پر تھا، اُس پر جو بیٹھنے لگا، یہ پنجے سے چھُٹ کر چاہ میں ڈوبا۔ جامی:

فُغاں زیں چرخِ دَوُ نابی کہ ہر روز ①
بچاہے افگند ماہِ دل افروز

اِلّا ، رَسَنِ حیات مضبوط تھی ؛ نہ گزَندِ پنجے کی پہنچی، نہ چوٹ چپیٹ گرنے کی لگی۔ میر حسن :

② کُنواں وہ جو اندھا تھا، رُوشن ہوا جواں اُس میں وہ، سانپ کا مَن ہوا

وہ جانور تو دم لے کر اُڑ گیا ، یہ بے پَر کنُویں میں پڑا رہا۔ اِتّفاقاً اُسی روز ایک قافلۂ گُم گشتہ راہ خستہ وتباہ سَرِچاہ پہنچا۔ کنُواں دیکھ کر پانی کے لالچ سے وہاں قیام کیا۔ آدمی پانی بھرنے کنُویں پر آئے۔ اِس بے چارے نے رسّی کا سہارا جو پایا، اِس پھندے میں کنُویں سے باہر آیا۔ جس نے اِس کا چہرۂ رعنا مشاہدہ کیا، یَابُشْرٰی ھٰذَا غُلَام کا غُل برپا کیا۔ دُنیا کے عَجَب مُعاملے ہیں۔ شعر :

روزی نگر کہ طوطیِ جانم سوی لبش بر بوی پستہ آمد و بر شکّر او فتاد

جب لوگ حال پوچھنے لگے ؛ اِس نے جیسا موقع دیکھا، ویسا بیان کیا۔ غَرَض کہ میرِ قافلہ کی خدمت میں توقیر سے رہنے لگا۔ چند روز میں قافلہ منزلِ مقصود کو پہنچا اور مہینا بھی تمام ہوا ؛ جوانِ غم دیدہ، بلا رسیدہ نے دوسرا لعل اُگلا۔ رئیسِ قافلہ دیکھ کے تمام ملال بھولا۔ پست ہمّتی سے سوچا کہ ایسی گراں بہا شے کا سہل لے لینا مشکل ہے، مَبادا کچھ فساد اُٹھے۔ وہ بد افعال اِس کا خون حلال سمجھا، بُرے کام کا مطلق نہ مآل سمجھا۔ جوان کو قید کر کے کوتوال پاس بھیجا، کہا: یہ میرا غُلام ہے، آج اِس نے لعل چُرایا ، کچھ ایسا وَسوَسۂ شیطانی

دل میں آیا ؛ میں نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اِسے سزا ملے ، تا ، لوگ ڈریں، عبرت سے آیندہ ایسی حرکت نہ کریں ۔ کوتوال نے قاضی سے مسئلہ پوچھا ۔ اُس نے بے تحقیق ہاتھ کاٹنے کا فتویٰ دیا؛ مگر اُس شہر کا چندے سے یہ دستور تھا : جب کسی شخص پر گناہ ثابت ہوتا، تو مدّعی اور مدّعا علیہ بادشاہ کی بیٹی کے رُو بہ رُو حاضر ہوتے ۔ اظہارِ حال کے بعد ، مرافعۂ ثانی میں جو اُس کی راے معدلت پیرائے میں آتا، وہ ہوتا ؛ اِس واسطے کہ بادشاہ مُسن تھا ، بیٹی کے سوا اور کوئی تخت و سلطنت کا وارث نہ تھا ۔ اللہ رے اُس کے جمال کا جلوہ اور حُسن کا غوغا ! پری کو ہزار جان سے اُس کی پروا ، حور اُس کی شیدا ، خلقِ خُدا اُس مہ سیما پر نثار، آفتِ عصر، بلاے روزگار تھی۔ حُسنِ عالم فریب کے علاوہ طبعِ حلیم ، راے سلیم ؛ نکتہ فہم ، دقیقہ رس ، اپنے عصر کی حکیم ۔ حقیقۃً قابلِ ریاست وہ صاحبِ فراست تھی ۔ غنچۂ خاطر اُس گُل اندام ، یاسمین پیکر کا رُو نا دیدۂ صبا تھا ۔ دہنِ صدفِ مُراد تمنّاے قطرۂ نیساں میں بند ۔ کوچۂ عصمت و عفت میں اُس دُرِ نا سُفتۂ دُرجِ شہر یاری کے وہم و فکرِ تاج دارانِ دہر کا گُزر نہ ہوا تھا، اُس دم تک نا کتخدا تھی ۔

جس وقت وہ دونوں رُو بہ رُو ہوئے ، پہلے شاہ زادی نے میرِ قافلہ سے پوچھا ۔ اُس نے جو کچھ کوتوال سے قیل و قال کیا تھا، وہی

بے کم و کاست مکرّر عرض کیا۔ شہ زادی نے یہ مصرع برجستہ پڑھا، سعدی:

بار باطلست آنچہ مدّعی گوید①

پھر جوان کی طرف مخاطب ہوئی۔ بس کہ یہ زیست سے تنگ، آمادۂ مرگ تھا، بے تامّل بولا: شہ زادی! آپ روشن ضمیر ہیں، ہم مصیبت زدوں کی طرح سلسلۂ بے جرمی میں اسیر ہیں، یہ شخص سچّا ہے۔ وہ تو عقیلہ تھی، زیادہ شک ہوا، دل سے کہا: آج تک کسی چور نے حاکم کے رو بہ رو بجز انکارِ دست بُردی، دفعتہً اقرارِ دُزدی کیا نہیں۔ یہ بے گناہ ہے۔ تقریر اِس شاہد کی، شاہد ہے، خدا گواہ ہے؛ کچھ اِس میں بھید ہے۔ قافلہ باشی سے فرمایا: کل تو محکمے میں حاضر ہونا۔ جوان کو ڈیوڑھی پر قید کیا۔ یہ تو حسین، بلکہ مہر طلعت، ماہ جبیں تھا؛ طالع کا ستارہ جو چمکا، شہ زادی کا میلانِ خاطر جوان کی جانب ہوا۔ شب کو تنہا بُلا کے بہ دِل داری و تاسّف اِستِفسارِ حال فرمایا۔ اُس وقت جوانِ ناکردہ گُناہ نے دل سے آہِ سرد بھر مشروحاً از آغاز تا انجام عرض کیا۔ شہ زادی کا دل، یہ نیا قصّہ سُن کے، بہ مرتبۂ اتم مسرور ہوا۔ چوری کا شک اُس دُزدِ دل کی جانب سے دور ہوا۔

صُبح کو بادشاہ کے حضور میں لا، خود دستِ ادب باندھ کر عرض کی: قبلۂ عالم و عالمیاں کی عمر دراز ہو، قیصر و فغفور کی اِس در پر جبیں بہ نیاز ہو! شہر کا قاضی اور کوتوال بے دریافتِ حقیقتِ حال

حُکمِ سزا بندہ ہاے خُدا کو دیتے ہیں، رُوزِ جزا کی جواب دِہی اپنی گردن پر سے لیتے ہیں۔ غضَب کی جا ہے، عجیب ماجرا ہے واجبُ التّعزیر، صاحبِ تقصیر کو لعل ملے، بے گُناہ کا ہاتھ کٹے۔ بادشاہ نے پھر دونوں کی زَبان سے حال سُنا۔ بہ سببِ کِبرِ سِن کہ عقل کو زوال ہوتا ہے، یہ وہ دن ہیں کہ نِسیان بہ مرتبۂ کمال ہوتا ہے؛ ذِہن نہ لڑا، تامّل کیا۔ شہ زادی نے اِلتماس کیا: حضور! یہ اِمتحان بہت آسان ہے، ایک مہینے اَور اِس جوان کو قَید رکھیے؛ اگر دوسرا اُگلا، تو سچّا ہے؛ پھر ایسے دُرِ یتیم صَدَفِ راستی کو کیوں بے آب و تاب کیجیے، آبرو لیجیے؛ وگرنہ بہ ماہِ آیندہ یہ بدکردار دار کا سزاوار ہے، ہاتھ کاٹنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟

بادشاہ کو سَردَست جوابِ باصَواب بیٹی کا بہت پسند آیا، حاضرین نے تحسین و آفرین کی۔ بادشاہ نے جوان کو اپنی آنکھوں کے سامنے نظر بَند کیا۔ میرِ قافلہ کو شہ زادی نے مَجبَس بھیجا۔ قصّہ کوتاہ، وہ مہینا بھی تمام ہوا اور اِتنے دنوں میں شُعلۂ مَحبّت مَجمَرِ سینۂ شہ زادی سے بھڑکنے لگا، دَم پھڑکنے لگا، حال طَشت اَز بام اُفتادَہ ہُوا۔ جوان نے عرض کی: کل لعل اُگلوں گا۔ پھر صُبح کو سَرِ دربار رُو بہ رُوے حُضّار لعلِ بے بَہا دُرجِ دَہاں سے نکالا۔ سب کو حیرت، شہ زادی کو فرحت و مَسرّت حاصل ہوئی۔ اُسی دم مال و اسباب قافلہ باشی کا جوان کو مِلا۔

اُسے تشہیر کر کے شہر سے بدر کیا۔ جوان کی صورتِ دل پذیر، فصاحتِ تقریر پسندِ خاطرِ صغیر و کبیر تھی؛ بہ ایمائے شہ زادی سب نے مُتَّفِقُ اللَّفْظ بادشاہ سے عرض کی کہ یہ شخص حضور کی عنایت کے لائق ہے؛ تمنّائے مُلازمت رکھتا ہے، کَفش بَرداری کا شائق ہے۔ بادشاہ بھی اِس کی راست بازی سے خوش تھا، راضی ہوا۔ سعدی:

راستی موجبِ رضای خداست ①
کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

چند عرصے میں مُقرَّبِ بارگاہِ سُلطانی، مَوردِ عنایاتِ جہاں‌بانی ہوا۔ ہر مہینے لعل اُگل کے حُضور میں لانے لگا۔ روز بہ روز ہم چشموں میں سُرخ رُوئی حاصل کر کے آبرو پانے لگا۔ آخر کار، بہ مَشْوَرۂ مُلازِمانِ قدیم و بہ تحریکِ حُکَما و نَدیم بادشاہ نے اُس گوہرِ مُسَلَّمِ سِلْکِ تاج داری کو بہ رِشتۂ عَقْد اُس لعلِ بے بہا کے مُنْعَقِد کیا۔ یہ دونوں مشتاق بہ صَد اِشتیاقِ باہَم، لطف کے ساتھ بے اندیشہ و غم، اَیّام گُزاری بڑی دھوم اور تیاری سے کرنے لگے؛ مگر ہر رُوز بِلاناغہ جوان بادشاہ کے دربار میں حاضر رہتا تھا۔

ایک دن اِیلچی اِس کے بھائی کا کسی تقریب میں وارِد ہوا اور جواہر کا ذِکر نکلا۔ اِیلچی نے عرض کی: ہمارے بادشاہ کے پاس ایک لعل اِس رنگ، ڈھنگ، سَنگ کا ہے کہ آج تک جوہریِ چرخ نے باوُجودِ عینکِ مہر و ماہ و گردِشِ شام و پگاہ، سال و ماہ میں، اُس کے

سَنگ کا کِیا، پاسَنگ کے برابر نہیں دیکھا ہے۔ یہ کلمہ سُن کر، بادشاہ نے وہی لعل، جو سینۂ بے کینۂ جواں سے نکلے تھے، دس بارہ ایلچی کو دکھائے۔ وہ بھی جواہر شناس تھا؛ سخت حیراں، تادیر سر بہ گریباں رہا، پھر عرض کی: قِبلۂ عالَم! عَجَب کی جا ہے کہ رنگ، روپ، وَزن، نقشہ اِن کا اُس کا ایک سا ہے۔ اِتنا فرق مُقرّر ہے کہ وہاں ایک ہے، یہاں ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔ بادشاہ نے جوان کی طرف اِشارہ کیا کہ یہ میرا فرزند ہر مہینے ایک لعل بے رنج و ملال تھوکتا ہے۔ ایلچی نے غور سے جو دیکھا، اپنے بادشاہ سے مُشابہ کِیا، بِعَینِہٖ پایا۔ خَیر، رُخصت ہوا۔

جب اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ اُس کا تو معمول تھا، جب تخت پر آکر جلوہ گر ہوتا، وہ لعل پیشِ نظر ہوتا؛ ایلچی کو وہ سانحہ یاد آیا، دست بستہ عرض کی: قِبلۂ عالَم اِس لعل کو جُدا کرتے نہیں، بے اِس کے قَدَمِ مبارک تخت پر دھرتے نہیں؛ اِن رُوزوں خانہ زاد جس بادشاہ پاس گیا تھا، نیا ماجرا دیکھا: مَعدِنِ لعل کہ وہ اِمکان نہیں، لیکن وہ جواہرِ بے قِیاس رکھتا ہے۔ تعجّب کی بات ہے کہ وہ لعل کا پُتلا زندہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ بادشاہ نے اُس کا حال مُفصَّل پوچھا۔ اُس نے سب بیان کیا کہ داماد اُس شاہِ خُجستہ نہاد کا ہر مہینے لعل اُگلتا ہے۔ اور کیا گُزارِش کروں، جیسے حُضور کی صورت ملتی ہے، حقیقی بھائی ایسے دکھائی نہیں دیے۔ یہ سُنتے ہی اُس کو یقین ہوا کہ اب پتا مِلا، مُقرّر وہ میرا بھائی ہے۔ اُسی وقت نامۂ شوقیہ اُس کانِ گُہر کے اِشتیاقِ دید

میں بادشاہ کو لکھا کہ براے چندے اگر اُس فرزندِ اَرْجُمَنْد کو اِدھر روانہ کرو، محبّتِ دیرینہ سے بعید نہ ہو۔ ہمیں شوقِ دیدار اَزحدِ تحریر و اِظہار اَفزوں ہے۔ اور پوشیدہ خطِ تمنّا بھائی کو رَقَم کیا کہ آج تک تیری مُفارَقَت سے تختِ شاہی، بدتر از بُوریاے گدائی تھا؛ اب اِیلچی سے یہ خبرِ فرحت اثر سُن کر دل کو سُرور، آنکھوں میں نور آیا؛ لازِم کہ بہ مُجرّدِ وُرُودِ رقیمۂ وِداد اِدھر کو روانہ ہو۔ اور کچھ پتے حَسَب و نَسَب کے، سانحۂ شکار تفصیل وار قَلَمبَنْد کر دیے۔ ایلچی سے فرمایا کہ نامہ عَلیٰ رُؤُسِ الْاَشْہاد بادشاہ کو اور یہ خط خُفیہ اُس غیرتِ ماہ کو دینا۔

قاصدِ صبادَم، صَرصَر قدم جلد تر اُس شہر میں وارِد ہوا۔ بادشاہ کو نامہ دیا اور خطِ پُوشیدہ جوان کو حوالے کیا۔ وہ مکتوبِ محبّت دیکھ کر ایسا گھبرایا، یہ لہو نے جوش کھایا کہ اُسی دن رخصت کا ذِکر بادشاہ سے لایا۔ آخر وہ عاشقِ برادر، معشوقۂ روح پرور کو لے کر، جہاز پر سوار ہوا، تب اُس بے چین کو قرار ہوا۔ راہ میں ایلچی سے شہر کا نقشہ، راہ کا پتا، سب پوچھ لیا۔ فَرطِ شوق سے دن رات سَرگرمِ رفتار تھا۔ ساعت بھر مُقام کسی منزل کا ناگوار تھا کہ جلد پہنچیں، کہیں نہ ٹھہریں۔ نیرنگِ زمانۂ کج سَرِشتِ بُوقَلَمُوں کہ ہردم و ہر ساعت دِگرگوں ہے، کیا کہوں! جب دس بارہ کوس وہ شہر رہا، جہاز تباہ ہو کے بہا۔ جس کی قضا تھی تہِ آب و گرداب رہا۔ جس کی بقا تھی بہ نکلا۔

یہ قصۂ جاں گُداز دور دراز پہنچا، اِن کے بھائی نے سُنا؛ فوراً ہزار سوار تیز رفتار دوڑائے کہ جس ڈوبتے اُچھلتے کا پتا پاؤ، جلد حضور میں لے آؤ۔ آخر کار بہ ہزار جستجو و تگاپو شہ زادیِ خوش خو ہاتھ آئی، جوان کی خبر نہ پائی۔ اُسے بادشاہ پاس حاضر کیا، جوان کے ڈوبنے کا حال کہہ دیا۔ بادشاہ بہ حالِ تباہ گردابِ فراق میں پھنسا۔ شہ زادی صَف نشینِ ماتم، لُجّہ و لَطمۂ اَندوہ و غم میں اُلجھی۔ جوان کا حال یہ ہوا کہ تختے کے سہارے سے بہتا بہتا، پیاس کے صدمے، بھوک کی موجیں سہتا سہتا کئی دن میں کنارے پر پہنچا۔ فی الجُملَہ، جب کچھ تاب و طاقت آئی، پوچھتا پوچھتا اُس شہر میں داخل ہوا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی، رُو بہ رُو بلایا۔ بہ سَبَبِ طُولِ اَیّامِ مُہاجَرت اور درازیِ زمانۂ صعوبت مُطلق نہ پہچانا۔ اُستاد:

اِتنی مُدّت میں ملا مجھ سے وہ دھوکا دے کر (1)
یاد بھی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی

ہیئت تبدیل، خوار و ذلیل تھا۔ اِس اِختلاف کو دیکھیے: یہاں صحرا نَوَردی، بھوک پیاس، مصیبت؛ وہاں حُکم رانی، عیش و آرام و تختِ سلطنت۔ ناچار شہ زادی کو طَلَب کیا، اُسے بھی تامُّل ہوا۔ وہ شخص بولا: پہر بھر کا عرصہ باقی ہے، آج لعل اُگلنے کا دن ہے، پھر تم سب پہچانو گے۔ بادشاہ کو یقین ہوا، کہا: اگر یہ جھوٹا ہوتا، تو ایک پہر کا وعدہ نہ کرتا۔ شہ زادی نے کہا: اُس شخص

کی طبیعت کی جَودت مشہور ہے، ایک مُعَمّا پوچھتی ہوں؛ اگر بدیہہ جواب دیا، تو بے شک شک رفع ہوا: بھلا وہ کیا شَے ہے جسے گبر و مسلماں، یہود و نصاریٰ، سب انسان کا فرقہ آشکارا کھاتا ہے؛ مگر جب اُس کا سِر کاٹ ڈالو تو زَہر ہو جائے، کوئی نہ کھائے اور جو غصّے میں زیست سے خفا ہو کر کھائے تو فوراً مر جائے۔ جوان نے ہنس کر کہا: شہ زادی! "قَسَم" ہے۔ یہ کیا مُعَمّا پوچھا ہے! وہ پھڑک گئی، وحشت مِٹی، دل کی بھڑک گئی۔ بے باکانہ چلمن اُٹھا، پروانے کی طَرح اُس شمعِ بزمِ فرقت کے گرد پھری۔

بادشاہ مُتعجّب ہوا کہ ہم تو کچھ نہ سمجھے، شہ زادی کیا سمجھ کر سامنے ہوئی۔ جوان نے عرض کی: قبلہ! وہ چیز "قَسَم" ہے، تمام عالَم کھاتا ہے، سِر اُس کا "قاف" ہے، اُسے کاٹو تو "سَم" صاف ہے؛ "سَم" زَہر کو کہتے ہیں، کون کھاتا ہے؟ کھانے والا مر جاتا ہے۔ بادشاہ یہ سُن کر بغل گیر ہوا۔ اُس نے لعل اُگلا۔ شادیانے بجے، بِچھڑے ملے۔ اِس طَرح جامعُ المتفرِّقین سب بچھڑوں کی دوری کا بکھیڑا مِٹائے۔ جو جس کا مشتاق ہو، جس کی جدائی جسے شاق ہو، وہ اُس سے مل جائے۔

جوگی نے یہ رام کہانی تمام کر کے جانِ عالَم سے کہا: بابا! شعر:

مشکلے نیست کہ آساں نشود
مرد باید کہ ہراساں نشود

جوئندہ، یابندہ ہے یہاں سے منزلِ دوست قریب ہے۔ سب کچھ معلوم ہے؛ اِلّا، کہنا منع ہے، بُرا ہے۔ دُنیا مقام چُپ رہنے کا ہے۔ اِتنا اِس جگہ وَقفَہ کر کہ میری زیست کا ساغر بادۂ اَجَل سے لب ریز ہے، سمندِ جاں کو نَفَسِ سرد مہمیز ہے؛ مجھے زیرِ زمیں سونپ تشریف لے جانا۔ اور چند وَصیّت کیں۔ جانِ عالَم نے کہا: یہ قَلَق و رنج کس سے اُٹھے گا! بیٹھے بٹھائے یہ صدمہ کیوں کر دیکھا جائے گا! پتّھر کا کلیجا کہاں سے ہاتھ آئے گا کہ ایسے دوستِ غم خوار کو اپنے جیتے جی زیرِ خاک کیجیے، اُس کے ماتم میں گریبانِ صبر چاک کیجیے! یہ کہہ کر رُونے لگا، گریباں تا دامن بارشِ اشک سے بھگونے لگا۔ جوگی اِس کی مَحبّت کا گِرَوِیدہ ہوا، کہا: افسوس! دمِ واپسیں کا عرصہ بہت کم، دم نہیں مار سکتے ہم؛ وگرنہ تیرے ہمراہ شریکِ درد و غم ہوتا۔ بھلا آخری، فقیر کا، اگر تجھ کو یاد یہ لٹکا رہے گا، سائیں چاہے تو کہیں نہ اَٹکا رہے گا، قبر میں لے جا کر کیا کروں گا۔ پھر چند کلمے وہ بتائے کہ جس صورت کا دھیان لائے، فورًا ہو جائے۔

یہ مُقدَّمہ بتا، ہَر ہَر کر، گُرو کا نام لیا۔ پھر کلمہ جو پڑھا، دُنیا سے چل بسا، دم نکل گیا۔ جوگی مسافرِ عَدَم، بیکنٹھ باشی رَم گیا۔ جانِ عالَم کا روتے روتے دَم گیا، بے تابانہ نعرۂ اَنفِراق مارے۔ مُرید، چیلے جمع ہو کر "گُرو گُرو" "یا ہادی" کہہ کر بہت پکارے۔ بُولتا، نکل گیا، جوگی نے صدا نہ دی، منزلِ مقصد کی راہ لی۔ شہ زادے

نے بہ موجبِ وَصِیّت غُسل دیا، کفنایا؛ قبر تک لاتے لاتے کچھ نہ پایا۔ آخر کار برابر کفن پھاڑ دیا؛ آدھا چیلوں نے جلایا، نصف مُریدوں نے مَنڈھی میں گاڑ دیا۔ ہندوؤں نے راکھ پر چھتری بنائی۔ مسلمانوں نے قبر بنا کے سبز چادر اُڑھائی۔ وہ تَنْت مُندرا، سُبحہ و مُصلّیٰ، خِرقہ و جُبہ اُس کے منظورِ نظر کو دے کر جانشیں کیا۔ مُرید، چیلوں کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں سونپا۔ اُسے ایک ولولہ آیا، اَزسَرِ نَو اُن سب کو یہ تلقین کیا، رازِ سربستہ کھول کے ذہن نشیں کیا کہ سُنو بچّہ! گو جوگی ظاہر میں آنکھوں سے نہاں ہے؛ مگر مُرشِد کا جلوہ، سائیں کا ظہورا ہر برگ بار، بوٹے پتے، گُل و خار، بلکہ دَرِ مسجد و دیوارِ کُنشت سے دیدۂ دُور بیں میں عیاں ہے۔ عارِف کا یہ کلام ہے، سعدی:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار (1)
ہر ورقے، دفتریست معرفتِ کردگار

دیدۂ بینا، گوشِ شنوا اِس رَمز کو درکار ہے۔ ہر ذرّے میں اُسی کا جھمکڑا ہے۔ نمونۂ قدرت، نشانِ وحدت دُنیاے بے ثبات کا نقش و نگار ہے۔ بلبل کے پردے میں ترانہ سنجی ہوتی ہے۔ قُمری کی کوکو مُتلاشی کی جان کھوتی ہے۔ اُسی کے ذِکر میں سَرگرم ہے، جس کی زبان و مِنقار ہے۔ کسی کو حَرَمِ مُحترم میں نامَحرَم رکھا، بھٹکایا؛ کسی کو بَیتُ الصَّنَم میں بُلا کر جلوہ دکھایا۔ کعبے کا دھوکا، دَیر کا بہانہ ہے؛ دَوڑا کر تھکانا ہے۔ اور جس نے مَنْ یَشاءُ کو رہ بَر کر کے ڈھونڈھا، اُس نے گھر بیٹھے پایا ہے۔ امیر خسرو:

جن ڈھونڈھا، تِن پائیاں گھرے پانی بَیٹھ [1]
ہَوں بَوری ڈوبن ڈری، رہی کنارے بیٹھ

دُنیا کا مُعاملہ، مذہب و مِلّت کا جھگڑا، یہ اچھا وہ بُرا؛ پُر زِیاں، سَراسَر بے سُود ہے۔ حق بے شک داتا ہر آن موجود ہے۔ رنج میں دل کو خوش، اَلَم میں طبیعت کو شاد رکھو۔ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ نِرنکار ہے۔ شِرکت کرنے والا مُشرِک، حماقت شِعار ہے۔ مُرسَل رہ بَر ہیں، پوشیدہ راز سے ماہر ہیں؛ اُن کو رَستگار جانو، بَرپدِ یار سمجھ کر مانو۔ مُرشِد کی ذات، گُرو کی صِفات ہر جلسے میں یاد رکھو۔ بُود و نابُود کا غم نہ ہو۔ اور اَحباب کا دل کہ حَباب سے نازک تر ہے، خدا کا گھر ہے، آشُفتَہ و بَرہم نہ ہو۔ اللّٰہ بس باقی بے فائدہ ہوس۔ یہ کہہ کر قصہ مختصر کیا، بے خَبَروں کو باخَبَر کیا۔

جب اِس صُحبت سے جانِ عالَم کو فرصت ملی، چلنے کا عَزم کیا۔ اُس جانَشیں تَہمتَن نے رُوکا۔ اَور دو چار دن خاطِر سے مُقام کیا؛ پھر جس طرف جُوگی نے بتایا تھا، چل نکلا۔ پہاڑ سے جس دم آگے بڑھا، دریا ملا۔ ہر چند ڈھونڈھا؛ ناو، بیڑے کا تَھل بیڑا نہ لگا؛ مگر ایک لعلِ دَرَخشاں بہ رُوئے آبِ رَواں سامنے آیا۔ قریب اُس کے دوسرا نظر پڑا۔ اِسی طَرح تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بہت لعل بہتے دیکھے۔ تازہ فکر ہوئی کہ اِس حال کو کیوں کر دریافت کیجیے۔ کَنارے کَنارے سَیر دیکھتا چلا۔ دو کوس راہ جب طے کی، عمارت عالی شان دیکھی اور اُس چشمے کو اُس کے اندر سے رَواں پایا۔ دروازے

اور دَر کی بہت تلاش کی، تا اندر جانے کا باب مَفتوح ہو، نہ ہُوا۔ سوا ے دیوار، دَر نہ تھا۔ اُس وقت بلبل بن کر دیوار پر جا بیٹھا۔ مکان رَفیعُ الشّان، باغ بھی بہار کا؛ مگر سُنسان، اِنسان نہ حَیوان، فَقَط ایک بَنگلا نہایت نقش و نِگار کا۔ وہ نہر اُسی بنگلے کے اندر سے جاری تھی۔ چمن خالی اور بادِ بہاری تھی۔ آدمی یا جانور ناطِق و مُطلَق، مُطلق نہ تھا۔ باغ میں اُتر، صورتِ قدیم بدل کر بنگلے میں آیا۔ مُنقّش، مُطلّا، سجا سجایا پایا؛ لیکن طُرفہ حال یہ دیکھا: ایک پلنگ زمُرّد کے پایوں کا بِچھا ہے، اُس پر کوئی دوشالہ تانے سُوتا ہے۔ برابر، یاقوت کی تِپائی پر پھولوں کا دستہ: آدھے سرخ، نِصف سپید۔ جانِ عالَم نے قدم بڑھا دوشالہ سرکایا۔ وہ تنِ پری پیکر بے سَر نظر آیا۔ حسرت سے کہا: کس ظالم، ستم شِعار، بے رَحم، جفاکار نے اِس سَردفترِ خوبی، سراسر دل بری و محبوبی کا سر کاٹا ہے! نخلِ شمشاد کو تبرِ ظلم سے چھانٹا ہے!

بہ حَیرت ہر طرف دیکھتا تھا۔ چھت پر آنکھ پڑی: چھینکا بندھا، سر کٹا دھرا ہے۔ سر کے نیچے نَہر جاری ہے۔ جو خون کا قطرہ اُس حَلقِ بُریدہ سے پانی میں گرتا ہے، اللہ کی قدرتِ کاملہ سے وہ لعل ہو کر تیرتا ہے۔ اِس نے کہا: سُبحان اللہ! مُقرّر یہ سِحر کا کارخانہ ہے۔ قریب جا کر غور سے جو دیکھا، تو انجمن آرا کا چہرہ تھا۔ پہچانتے ہی سَر و تَن کا ہوش نہ رہا۔ چاہا کہ سر سے سر ٹکرا کر ہم سَر ہو، کسی کو نہ خبر ہو؛ بس کہ تجربے کار ہو چکا تھا، سُوچا:

مرنا ہر وقت ممکن ہے، پہلے حال مُفَصَّل معلوم کر لو، کہیں حَوض کا سا دُھوکا نہ ہو۔ ہر چند غوّاصِ عقلِ رَسا مُحیطِ فکر میں غُوطہ زن و آشنا ہوا؛ گوہَرِ مقصد صَدَفِ مراد سے ہاتھ نہ لگا، مُعاملے سے نا آشنا رہا۔

اِس عرصے میں شام نزدیک ہوئی۔ تُند ہَوا چلی، شُور و غُل مچا۔ یہ سمجھا: اب کسی دِیو یا ساحر کی آمد ہے، چھپا چاہیے۔ سَرِ گُلدستہ، گُلبُنِ مَحبّت کے رُو بہ رُو بھونْرا بن کے بیٹھ رہا۔ دَفعتہً دِیو آپہنچا قَوی ہَیکل، زَبوں شَمائل؛ مگر وحشی سا ہر سِمْت بو سونگھنے لگا۔ پھر اُسی گُلدستے سے سفید پھول توڑا، اُس یاسمین پَیکر کو سُنگھایا؛ سِر اُچھل کر بدن سے مِلا، انجمن آرا اُٹھ بیٹھی۔ دِیو نے میوۂ تر و خشک رُو بہ رُو رکھا؛ مگر پریشان، ہر سُو مُتحیّر نگَراں۔ شہ زادی نے کہا: خَیر ہے؟ اُس نے کہا: آج غیر انسان کی بُو آتی ہے اور تعجب یہ ہے خوف سے جان جاتی ہے۔ وہ کہنے لگی: ہمیں آج تک جانور کی پرچھائیں نہ نظر آئی، تو نے آدمی کی بُو پائی۔ طُرفہ خَبط ہے، یہ جُملہ بے رَبط ہے۔ غَرض کہ صُبح تک مَذکورِ ہر شہر و دِیار، عجائباتِ رُوزگار کا بیان رہا۔ دَمِ سَحر اُسی دستے سے سُرخ پھول اُس خوں آشام نے توڑ کر اُس لالہ فام کو سُنگھایا۔ سِر تو پہ چھینکے پر سَر بلند ہوا، تن نے پلنگ پر آرام فرمایا۔ دِیو دو شالہ اُڑھا راہی ہوا۔

جانِ عالَم نے چار گھڑی بہ جَبر صَبر کیا۔ پھر اپنی صورتِ اصلی بن کر، وہی سفید پھول توڑ کر سُنگھایا۔ انجمن آرا بہ دستورِ اوّل اُٹھی،

شہ زادہ بے چیخ مار کر لپٹ گیا۔ دونوں مہجور اِس زور شور سے رُوئے کہ تمام باغ ہِل گیا، زمین و آسمان دَہل گیا۔ جانِ عالم ہنوز اپنے مصائب، وہاں تک آنے کا حال، فرقت کا درد و ملال کہنے نہ پایا تھا کہ انجمن آرا نے یہ کہا، لا اَعلَمُ:

تجھ بِن مری اَوقات جو اکثر گزری — وہ حالتِ نَزع سے بھی بدتر گزری
تو تو کہے سَرگُذَشت اپنی ظالم! — میں کس سے کہوں جو کچھ کہ مجھ پر گزری

یہ کہ کر، پھر دونوں چلاّ چلاّ، آہ و بُکا سے رُونے لگے۔ دُنیا کے مُعاملے میں ہمیشہ سے کسی کی عقل نہیں لڑی، شکست ہوئی ہے۔ شعر:

بیک لحظہ، بیک ساعت، بیک دم
دگرگوں می شود احوالِ عالم

مُؤَلِّف:

اک وَضع پر نہیں ہے زمانے کا طَور، آہ!
معلوم ہو گیا ہمیں لَیل و نَہار سے

ہر عُقدَۂ مالا یَنحَلِ ناگُزیر کے واسطے ناخُنِ تدبیر خَلق میں خَلق کیا ہے۔ اور جہان میں، جہاں تدبیر کا دَخل نہ ہو سکا، اُسے تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔ اکثر جس بات میں عقل عاجز آتی ہے، وہی طَرفَۃُ العَین میں خود بہ خود ہو جاتی ہے۔

ناگہاں ایک سفید دیو زبردست، زُور کے نشے سے سَرشار، مست، بڑا طاقت دار، رُستم کا یادگار اُدھر سے گزرا۔ نالۂ حزیں،

صدائے غمگیں کان میں آئی۔ بس کہ بہ ایں زور و طاقتِ خُدا داد، وہ دیوِ نیک نہاد رَحم دل، غم رسیدوں کے رنج کا شامل تھا، گریہ و زاری سُن کر دل کو بے قراری ہوئی، سمجھا: کوئی انسان نالاں ہے؛ مگر اِس صحرائے پُر خار، وادیِ ہمہ تن آزار میں آدمی کا ہونا مُحال ہے۔ اگر ہے، تو حقیقت میں مُبتلائے اَلَم، اسیرِ پنجۂ ستم، خراب حال ہے۔ یہ سوچ کر باغ میں آیا۔ یہاں رُوتے رُوتے دونوں کو غش آگیا تھا۔ دِیو ڈھونڈھتا ہوا بنگلے میں آیا۔ دیکھا: مِہر و ماہ گردشِ سِپہرِ بے مِہر سے بُرجِ زمرّدیں میں بے ہوش ہیں۔ چہرے کے رنگ اُڑے ہوئے، سکتے کی حالت میں ہم آغوش ہیں۔ روے یار آئینہ وار درمیاں ہے، فلک بَر سرِ اِمتحاں ہے۔ سمجھا: مدّت کے بعد دونوں کا مقابلہ ہوا ہے، اِس سے کُسوف و خُسوف کا رنگ ڈھنگ پیدا ہے۔ سَرِ بالینِ بیمارانِ محبّت بیٹھ کر نہر سے پانی لیا، دونوں کے مُنھ پر چِھڑکا۔ آنکھیں کھولیں، ہوش و حواس درست ہوئے۔ دیکھا کہ ایک دِیو سرھانے بیٹھا ہے۔ سفید دِیو نے اُٹھ کر بہ آئینِ شایستہ سلام کیا، تسلّی کا کلام کیا، کہا: تشویش نہ فرمائیے، بندہ دوست دار، جاں نثار ہے۔

پہلے جانِ عالَم اُٹھا، بغل گیر ہوا۔ وہ حال پوچھنے لگا۔ بس کہ شہ زادۂ عالم لَسّان، خوش بیاں تھا؛ اپنی رام کہانی چرب زبانی سے کہہ سُنائی۔ دیو ماجرائے گُذشتہ سُن کر بے قرار، اَشک بار ہوا، عرض کی: آپ بہ دِلِ جَمعیِ تمام آرام کیجیے؛ اب وہ قرمساق

آئے، تو عملِ بد کی سزا پائے۔ جانِ عالم بہ شدّت لگاوٹ باز تھے؛ اُس سے بھائی چارا کیا، صیغۂ اُخوّت پڑھا۔ وہ بیچارہ بندۂ بے دام، حلقہ بگوش غلام ہوا۔ وہاں سے اُٹھ کر باغ کی سیر کرتے تھے کہ وہ جفاکار بھی آ پہنچا۔ یہاں اَور رنگ دیکھا کہ شہ زادی، آدمی زاد کے ہمراہ پھرتی ہے؛ سفید دیو کا ہاتھ میں ہاتھ ہے، مُصاحبت کرتا ساتھ ہے۔ جل کر جانِ عالم پر جھپٹا۔ دیوِ سفید نے بہ جلدیِ تمام اُس نطفۂ حرام کا ہاتھ پکڑا۔ وہ کافرِ اُس رحم دِل سے لپٹا۔ باہم کُشتی ہونے لگی۔ یہ کشمکش ہوئی کہ زمین جا بہ جا شق ہوئی۔ اَلغرض، بہ مددِ مددگار و قوّتِ پروردگار سفید دیو نے زمین سے لنگر اُکھاڑ، سر سے اونچا کیا، زمین پر پٹک کے چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ جانِ عالم قریب آیا، زور و طاقت کی تعریف کرنے لگا، کہا: جنابِ باری نے تجھ مسافروں کے مددگار کی یاری کی، جو ایسے مردود پر ایک دَم میں تجھے فتح و ظفر حاصل ہوئی؛ اگر ناگوارِ طبع نہ ہو، میں بھی ایک زور کروں۔ وہ بولا: بسم اللہ۔ شہ زادے نے ایک ہاتھ شانے پر دھر، دوسرے سے گردن اُس سرکش کی مضبوط پکڑ، دھڑ سے کھینچ کر زمین پر دھڑ سے پھینک دی۔ دیوِ سفید یہ طاقت دیکھ کر، سفید ہو گیا، شہ زادے کا چہرہ سُرخ ہوا۔ وہ زرد رُو، بے دین اَسفلُ السافلین پہنچا۔

اِس عرصے میں سفید دیو کے ملازم بھی حاضر ہوئے۔ دعوت کی تیاری، ضیافت کی اِضافت کی۔ ایک ہفتہ اَکل و شُرب، گانا ناچ خوب رہا۔

آٹھویں روز اُس ماہِ دو ہفتہ یعنی انجمن آرا نے رنجِ جُدائیِ ملکہ مِہر نگار، مَردُمانِ لشکر کا لَبِ دریا اِنتظار بیان کر کے کہا: بہ خُدا مُفارَقتِ ملکہ میں خواب و خُور حرام ہے، چَین دل کو نہ جی کو آرام ہے۔ تمھارے بارِ احساں سے دَب کر کبھی ہنسی لب پر آ گئی؛ وگرنہ دَورِ شراب و کباب خونِ دل، لَختِ جگر تھا۔ ہر گلاس بُرادۂ اَلماس تھا، فَقَط تمھارا پاس تھا۔ اُس نے عرض کی: میرے آدمی جائیں، پتا لگا آئیں۔ انجمن آرا نے کہا: اپنے تجسُّس میں زیادہ مزہ ہے، اپنا کام آپ خوب ہوتا ہے۔ ناچار رخصت ہو کر چلے اور آنے جانے کے باہم وعدہ ہاے مُستَحکَم ہو گئے۔ مگر ہر دم ملکہ کا خَیال، ہر گام دل پر فُرقت کا ملال تھا کہ خُدا جانے، ڈوب گئی یا ہماری طرح کسی آفت میں پھنسی۔ کبھی دو کُوس کبھی چار کُوس بہ صد حسرت و افسوس چلتے۔ دو تین دن میں پاؤں سوج گئے، پھالے پڑے، قدم اُٹھانے کے لالے پڑے۔ وہ سفر سخت، یہ نازک مسافر، وہ کالے کُوس مانِوِے کی طرح کے کافِر۔ انجمن آرا جھلّا کر کہنے لگی، میرؔ:

کب تھا یہ شور و نوحہ، ترا عشق جب نہ تھا①
دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی

آپ کی بدولت یہ ذِلّت و رُسوائی، پیادہ پائی، صحرا نَوَردی، عزیزوں کی جُدائی؛ غرض کہ کون سی مصیبت ہے جو نہ اُٹھائی۔ امیر سوزؔ:

چھُڑا کر مجھ سے میرے خانماں کو②
خُدا جانے چلا ہے اب کہاں کو

شہ زادہ ہنس کر چُپ ہو رہا۔ پھر وہ عَمَل جو جُوگی سے سیکھا تھا، انجمن آرا کو بتایا۔ دونوں نے تُوتے کی ہیئت بنائی اور تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ کہ کر، نظر بہ خُدا، ایک سمت سرگرم پرواز ہوئے۔ پہر دو پہر اُڑنا، پھر کسی درخت پر بسیرا، خیمہ پاس نہ کوئی ہمراہ ڈیرا۔ اِس روپ میں قاصدِ سیر ہوئے۔ سابق مُصاحِبِ انساں تھے، اب ہم نَشینِ وَحش وطَیر ہوئے۔ روز نیا پانی، نِت نیا دانہ۔ جس ٹَہنی پر بیٹھ رہے وہی آشیانہ۔ کبھی جنگل طے کر کے کسی بستی میں ہو نکلے۔ گاہ کوئی سُنسان ویرانہ نظر پڑا، اُس میں سے رُو نکلے۔ کبھی اپنی حکومت اور زمانہ جو یاد کیا؛ تو گھبرا کر فریاد کی، نالہ ایجاد کیا۔ اِسی طرح روز چلے جانا، دل بہلانے کو یہ شعر لب پر لانا۔ لا اَعْلَم:

شبِ عشرت غنیمت دان و دادِ خوشدلی بِستاں
کہ در عالَم کسے احوالِ فردا را نمی داند

بیانِ حال اُس غَریقِ بحرِ ملال کا، یعنی ملکہ مہر نگارِ جگر فِگارِ خوش خِصال کا۔ اور آنا اُس سبز پُوشِ ذِی ہوش کا مکتوبِ محبّت اُسلوب لے کے؛ پھر تُوتے کی رُخصت، ملکہ کی رِقّت اور مِل جانا انجمن آرا اور شہ زادۂ با اقبال کا۔

نظم:

اے جنوں تو دلِ شوریدہ کی اِمداد کو آ   تا لکھوں حال میں اک اور ستم دیدہ کا

چین دُنیا میں نہیں عشق کے بیماروں کو　　نت نیا رنج فلک دیتا ہے بے چاروں کو
بارِ فُرقت کبھی معشوق جو دھر جاتے ہیں　　جیتے جی دب کے یہ اُس بوجھ سے مر جاتے ہیں
زیست بے لطف گزر جاتی ہے بے چاروں کی　　کیا کہانی مَیں کہوں تم سے دلِ اَفگاروں کی

نگارِ ندۂ حالِ غریقِ شطِ فُرقت و کشتی شکستۂ لُجۂ مَحبّت، بادباں گُسِستۂ صَرصَرِ دوری و لنگر بُریدۂ کارِ دِ مہجوری، طوفاں رسیدہ، کنارِ کام یابی نہ دیدہ، یعنی ملکہ مہر نگار، خامۂ جگر اَفگار یوں رقم کرتا ہے کہ جب جہاز تباہ ہوا تھا؛ یہ بھی ایک تختے کے ٹکڑے پر، دِل ٹکڑے ٹکڑے، ڈوبتی ترتی چلی جاتی تھی۔ اُدھر سے کوئی بادشاہِ عالی جاہ جہاز پر سوار سَیر دیکھتا آتا تھا۔ دور سے تختہ بہتا دیکھا۔ جب قریب آیا، آدمی اُس پر پایا۔ خوفِ خُدا سے جلد پَنسو ہی دَوڑا جہاز پر منگوایا۔ ملکہ کو تلاطُمِ آب نے بے تاب کیا تھا اور جانِ عالم، انجمن آرا کے صدمۂ جُدائی سے جی ڈوب گیا تھا، یعنی غَش تھا؛ لیکن صورتِ رعنا، چہرۂ زیبا میں فرق نہ ہوا تھا۔ بادشاہ بہ یک نگاہ والہ و شیدا ہو گیا۔ جلد جلد عطر سُنگھا، بازو باندھا، اور تدبیریں کیں۔ دو تین گھڑی میں ملکہ کی غَش سے آنکھ کُھلی، دیکھا کہ نہنگِ اَجل کے مُنہ سے تو بچی، آفتِ لَطمہ و لُجّہ سے بَرکنار جہاز پر سوار ہوں؛ مگر شخصِ غیر سے دوچار ہوں۔ شرم سے سر کو جھکایا، تمام جِسم میں پسینا آیا۔ بادشاہ نے پوچھا: اِسمِ شریف؟ گو باعثِ حجاب بولنا گوارا نہ تھا، لیکن بے جواب دیے چارہ نہ تھا، آہستہ سے کہا: محرُوم، ناکام، آفت

کی مُبتَلا، ذلیل و خوار، فلک دَرپئے آزار، پُرآلام، جِگر خوں، دِل خَستہ و محزوں، کشتی تباہ، گُم کردہ راہ، ناخُداگُم، فتادۂ تلاطُم۔

اِس کی فَصاحَت و بَلاغَت، چہرے کی شان و شوکت سے ثابِت ہوا کہ یہ شہ زادی ہے، اور کلامِ دردناک نے گَریبانِ صبر و شکیب چاک کیا، بادشاہ نے رو دیا۔ پھر خاصہ طَلَب فرمایا۔ ملکہ نے انکار کیا، نہ کھایا۔ اُس نے بہت اِصرار کیا، لَجاجَت سے کہا: آپ کھانا نُوش فرمائیں، وطن کا پتا بتائیں؛ جب تاب و توَانائی تم میں آئے گی، وہاں بھجوادیں گے۔ ملکہ نے کہا: ہم جن کے دامنِ دَولت سے اُلجھے تھے؛ وہ تو گَردِ راہ کی صورت، خارِ صَحرا کی طَرَح جھاڑ، اِس دریاے ناپیدا کنار میں ڈوبے، خدا جانے کیا ہوئے، کدھر گئے، جیتے ہیں یا مر گئے۔ اگر سوُے عَدَم ہمیں روانہ کرو، بکھیڑا چُھٹے، غم واَلَم سے نَجات ملے، بڑا احسان ہو۔ اُس نے کہا، مُؤَلِف:

تم سلامت رہو زمانے میں ایسی باتیں زَبان سے نہ کہو

غَرَض کہ مجبور کچھ کھایا۔ دو چار دن میں تاب و طاقت بھی گُونہ آئی اور جہاز دارُالسلطنت میں پہنچا۔ ملکہ کے واسطے مکانِ عالی شان خالی ہوا۔ لونڈیاں، پیش خدمت، آتو، محل دار؛ جو کہ قَرینہ شاہ اور شَہریاروں کا ہوتا ہے اور جس طَرح شہ زادیاں رہتی ہیں، سب سامان مُہَیّا کر دیا۔ ایک روز وہ بادشاہ آیا، کہنے لگا: تم اپنا حَسَب و نَسَب چھپاتی ہو، مگر ہمیں معلوم ہوا تم شاہ زادی ہو، ہماری تمھاری ملاقات اِس حِیلے سے ہونی تھی؛ لازم ہے کہ مجھے فرماں رَوا نہ جانو، فرماں برداروں میں قبول فرماؤ، میری بات مانو۔ ملکہ نے

جواب دیا: میں نے تمام عمر سلطنت کا نام نہیں سُنا؛ اِلّا، آپ کو خالِق نے بادشاہ کیا ہے۔ اِنصاف شرطِ فرماں رَوائی ہے، اُس کو ہاتھ سے نہ دے۔ مَیں ظُلم رَسِیدَہ، آفت کَشِیدَہ، فَلَک کی ستائی ہوں۔ خُدا جانے کون ہوں اور کس طَرَح یہاں تک آئی ہوں۔ بہ قولِ اُستاد:

دیکھتے آنکھوں کے کیا کیا لوگ اُٹھّے پیشِ چشم (1)
ہوں لَبِ حیرت بہ دَنداں رنگِ دُنیا دیکھ کر

اگر بے گناہ کا خون گردن پر لینا گوارا ہے؛ مختار ہے، مجھے کیا چارہ ہے۔ اور جو خوشی سے یہ اَمر منظور ہے، تو بَرَس رُوز کی مُہلت مجھ کو دے۔ اِس عرصے میں کوئی ڈُو بار ترا، میرے وارِثوں کا پتا مِلا، کوئی مُوا جیتا پھرا تو خیر؛ نہیں، میں تیرے قبضۂ اِختیار میں ہوں۔ جَبْر کرنا کیا ضرور ہے، عدالت سے دور ہے۔ بادشاہ دل میں سوچا: آج تک ایسے غَرَق ہوئے، اُبھرتے نہیں۔ وہاں کے گئے، پھر اِدھر قدم دھرتے نہیں۔ اِتنے دنوں کی فرصت دو، حکومت نہ کرو۔ آنکھ بند کرنے میں سال تمام ہو جائے گا، پھر کون سا حِیلہ پیش آئے گا۔ کہا: بہت خوب، لیکن جو تمھیں ناگوار نہ ہو تو جی چاہتا ہے گاہ گاہ آنے کو، تمھارے دیکھ جانے کو۔ ملکہ نے یہ اَمر مُغتَنَم جانا، کہ حاکم محکوم کا فرق سب کو معلوم ہے۔ اب یہ انداز ٹھہرا: پانچویں چھٹے روز پہلے خواجہ سَرا آ کے اِطّلاع کرتا، پھر بادشاہ قدم دھرتا۔ دو چار گھڑی کی نَشَست ہوتی۔ قصہ ہر شہر و دِیار کا، تازہ اَخبار دربار کا بیان کر کے اُٹھ جاتا۔

یہاں سے دو کلمے یہ سُنیے، مُسَبِّبُ الْاَسْباب کی کارسازی کے سامان دیکھیے: وہ محل جو ملکہ کے رہنے کو مِلا تھا، اُس میں مختصر سا پائیں باغ بہت کیفیت کا تھا۔ طَرح طَرح کا میوہ دار درخت، باغ بہار کا۔ یک لَخت نئے نئے رنگ ڈھنگ کے وہ گُل بوٹے، جو بادِ خِزاں سے جَھڑے نہ ٹوٹے۔ پھل قصد سے مُنہ میں آجائے، ہاتھ بڑھانے کی بار نہ آئے۔ رَوِشیں مؤرت کی صورت کی سالم۔ آبِ رَواں میں پری کا عالَم۔ بھدّے نہ بد قُوارے؛ سُڈَول، سانچے کے ڈَھلے، نازک سُبک فَوّارے۔ کیاریاں پیچ دار، اُن میں آبشار۔ پُختہ ہر ایک رَوِش۔ جو کیاری تھی پیاری تھی، سَراسَر گُل کاری تھی۔ چمن بندی قَطَع دار، جا بہ جا چبوترے معقول؛ گُلِ پیادہ و سوار پُر بہار، مُساوی عَرض و طُول۔ باغبانیاں خوب صورت، نَوجوان، تکلّف کے سامان۔ طِلائی نُقرئی کُھرپیاں، مُرَصّع کار بیلچے ہاتھوں میں۔ غمزہ چال میں، ادا دیکھ بھال میں، لگاوٹ باتوں میں۔ کسی طرف کُنوئیں کی جَگَت پر کِھلی والی لال بے رنج و ملال ہو رہی۔ کوئی کچھ اُکھاڑتی، کوئی بُو رہی۔ کوئی پھول چُنتی، پھل اُٹھاتی، گھانس کُھرپی سے چھیل ڈالتی۔ کوئی ٹوٹا جھڑا پتّا، گرا پڑا کانٹا کیاری سے نکالتی۔ سرِ شاخِ ہر گُلِ رعنا بُلبُلوں کا غُنچہ۔ سَرو و شَمشاد پُر جُوبن، صدائے قُمریِ طَوق دَر گردن۔ ایک طرف طاؤسوں کا رَقصِ پُر ناز، ہر ایک خوش آواز۔ باغ کے گِرد مُلَبَّب جھیل۔ غنچوں کا چٹکنا کُوسِ رَحِیل۔ کہیں لالہ پیالہ دَر دست۔ کسی جا نرگسِ شَہلا

باچشمِ مست۔ تاکِ انگور پر مے خواروں کی تاک۔ عنبر بیز صحنِ گلشن کی خاک۔

ملکہ گہ وگاہ، شام وپگاہ؛ رفعِ پریشانی، دفعِ سرگرانی کو وہاں آکے، نظارۂ صحبتِ گرم جوشیِ گل وبلبل سے رشک کھاکے، بہ صد حسرت و افسوس سوئے گردونِ دوں سر اٹھاکے یہ پڑھتی، میر سوز:

وہ دن خدا کرے کہ خدا بھی جہاں نہ ہو[1]
میں ہوں، صنم ہو اور کوئی درمیاں نہ ہو
گل ہو شگفتہ خاطر و گلزار خندہ رو
بادِ صبا بھی ہووے، ولے باغباں نہ ہو
گلشن ہو اور یارِ دل آرام اور میں
اپنا ہو قصہ، غیر کی وہاں داستاں نہ ہو

کبھی پیچ وتابِ زلف اور گیسوئے معنبر کی پریشاں حالی جعدِ سنبل کو دکھاتی۔ گاہ سیاہیِ داغِ جگر لالے کی لالی سے لڑاتی۔ غنچۂ فسردہ سے جو کچھ دل گرفتگی کی تسکین ہوتی؛ تو گل کی ہنسی پر پھوٹ پھوٹ کے خوب روتی اور اِس غزل سے دل کو سمجھاتی،

مؤلف: لازم ہے سوزِ عشق کا شعلہ عیاں نہ ہو
جل بجھیے اِس طرح سے کہ مطلق دھواں نہ ہو
زخمِ جگر کا وا، کسی صورت، دہاں نہ ہو
پیکانِ یار اُس میں جو شکلِ زباں نہ ہو

اللہ ری بے حسی کہ جو دریا میں غرق ہوں
تالاب کی طرح کبھی پانی رواں نہ ہو
گُل خندہ زن ہے، چہچہے کرتی ہے عندلیب
پھولی ہوئی چمن میں کہیں زعفراں نہ ہو
بھاگو یہاں سے، یہ دلِ نالاں کی ہے صدا
بہکے ہو یارو، یہ جرسِ کارواں نہ ہو
ہستی، عدم سے ہے مری وحشت کی اک شلَنگ
اے زلفِ یار! پاؤں کی تو بیڑیاں نہ ہو
لینا بجائے فاتحہ، تُربت پہ نامِ یار
مرنے پہ یہ خیال ہے، وہ بدگماں نہ ہو
ناقہ چلا ہے نجد میں لیلیٰ کا بے مُہار
مجنوں کی بن پڑے گی، اگر سارباں نہ ہو
چالوں سے چرخ کی، یہ مرا عزم ہے ضرور
اُس سرزمیں پہ جاؤں جہاں آسماں نہ ہو

گاہ لبِ جُو کسی سروِ کے پاس یادِ قامتِ جانِ عالم میں مثلِ فاختہ کوٗکوٗ کرتی، دلِ بے تاب کو تڑپا کر لہو کرتی۔ غور کرو تو دُنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں۔ اِس کا سب کارخانہ، پیدا ہے کہ پایدار نہیں۔ کبھی تو روزِ روشن ہے، گاہ اندھیری رات ہے۔ یہ کائنات کی کائنات بے ثبات ہے۔ گلشن میں اگر بہار ہے، تو خزاں درپئے آزار

ہے۔ بلبل کو ہزار چہچہے یاد ہیں ؛ پر، باغباں آشیاں اُجاڑنے کی فکر میں ہے ، دام بردوش صیاد ہیں۔ نوش کے ساتھ گزندِ نیش ہے۔ کوئی دل شاد ، کسی کا سینہ رِیش ہے۔ عاشق ازَل سے غم کا مُبتَلا ہے۔ مَثَل مشہور ہے کہ : معشوق کی ذات بے وفا ہے۔ اور جو کبھی کسی قسمت کے زبردست کو اِتّفاقاً غم خوارِ وفادار ہاتھ آتا ہے ؛ تو سَرِ دَشت کسی نہ کسی پیچ سے فَلَکِ تفرِقہ پسند رشک کھا کے چُھڑاتا ہے۔ اِسی سہارے پر لوگ جان دیتے ہیں، جی بیچ کر یہ رُوگ مُول لیتے ہیں؛ اِتنا نہیں معلوم کہ اَلقَلِیلُ کَالمَعدُوم ۔

یہ جُملہ تو مُعتَرِضہ تھا ، پھر وہی قصّہ شُروع ہوا۔ ایک رُوز فَرح اَندُوز ملکہ بہ دستورِ قدیم ، بے یار و ندیم باغ میں گئی ۔ شہ زادے کی صُحبت کا خَیال اور انجمن آرا کی گرم جُوشی کا ملال ، تنہائی میں اپنا خراب حال دیکھ کر یہ شعر مُؤَلِّف کا پڑھا ، مُؤَلِّف :

ایک انقلابِ چرخ سے ، افسوس ! دیکھنا
وہ صحبتیں رہیں ، نہ تو وہ ہم نَشیں رہے

پھر ایسا رُوئی کہ ہچکی لگی۔ شام کا وقت تھا ، جانور درختوں پر بسیرا لیتے تھے ۔ جس درخت کے تلے ملکہ کھڑی تھی ، ایک تُوتا اُس پر آ بیٹھا۔ گِریہ و زاری اِس غم کی ماری کی دیکھ کر بے چَین ہوا ، پوچھنے لگا : شاہ زادی ! کیا حال ہے ، کون سا ملال ہے ؟ اور کون سا صدمہ ایسا جاں کاہ ہے جو اِس طَرح لَب پر نالہ و آہ ہے ؟ ملکہ نے کہا : سُبحانَ اللہ ! قسمت کی گردش سے یہ حال بَہم پہنچا کہ جانور ہم پر رَحم کھاتے ہیں ، احوال

پوچھنے کو اُڑکر آتے ہیں۔ زیادہ بے قرار اور اَشک بار وہ سُوگوار ہوئی۔ یہ قاعدۂ کُلّیہ ہے: جب کسی دل شِکَستہ کی کوئی دل داری کرتا ہے، تو بے شک اُسی کا دل اُمَنڈ آتا ہے۔ ملکہ نے بے اِختیار ہو کر کہا، آصفُ الدّولہ:

جو دو شخص خنداں بَہم دیکھتے ہیں فلک کی طرف رُو کے ہم دیکھتے ہیں

اے جانورِ خوش بیاں، سُخن سَنج مہرباں! کیا بتاؤں! گھر بار سے جُدا، بے کسی میں مُبتلا، عزیز اَقْرِبا سے الگ، جینے سے خفا ہوں۔ بسانِ آئینہ حیراں، مثلِ زُلفِ سیہ بَخت، پریشاں، نَے کی طرح نالاں، مَورِدِ صَد اَنْدوہ و بلا ہوں۔ شعر:

بے کسی سوخت، کسے می خواہم نَفَسے ہم نَفَسے می خواہم

شامِ تیرَہ بختی کی سیاہی میں بے قرار، صُبحِ قیامت کی صورت دامن چاک، گِرِیباں تار تار۔ شعر:

کس کو اب زیرِ فلک طاقتِ رُسوائی ہے کاش شَق ہووے زمیں اور سما جاؤں مَیں

دل میں اَلَم سے خار خار، غیر جِنْسوں کے دام میں گِرِفتار، سخت مجبور و ناچار ہوں۔ طائرِ رنگ پَر پِدَہ، ہزاروں جَور و ستم میں جَریدَہ، رُوئے راحت، کُوئے آشیاں نہ دیدَہ؛ شبِ غم کے اندھیرے میں سوجھتا نہیں، خوں بار ہوں۔ ناسِخ:

(1) صُبح سے کرتے ہیں معمار مرے گھر کو سفید شام سے کرتی ہے فرقت کی شبِ تار، سیاہ

تُوتے نے کہا: مجھے تم سے بُوئے مَحبّت آتی ہے، تمھاری باتوں سے چھاتی پھٹی جاتی ہے؛ برائے خُدا جلد اپنے رازِ سَربَستہ سے مجھے آگاہ

کرو، لِلّٰہ مُفصّل حال کہو۔ ملکہ نے قصّۂ عشقِ جانِ عالم، انجمن آرا کا آنا، وزیرزادے کی بُرائی، جادوگرنی کی کج اَدائی، جہاز کی تباہی، اپنا یہاں آنا، اَوروں کا پتا نہ پانا، جانِ عالم کا چُھٹ جانا؛ سب بیان کرکے کہا: وہ شاہِ گردُوں بارگاہ ہمیں مَنجدھار میں ڈوبتا چھوڑ، اپنا بیڑا پار لگا، مُنہ مُوڑ، خدا جانے کیا ہوا! ہم ہیں اور رنجِ تنہائی میں بے تابی اَنیس ہے؛ پریشانی ہمدم، خانہ ویرانی جَلیس ہے۔ جو دَم ہے، دَمِ شمشیر ہے۔ سانس، ناوک کا تیر ہے۔ جیتے جی صبر و قرار نہیں، بڑی مجبوری یہ ہے کہ مرجانے کا اِختیار نہیں۔ شعر:

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم، نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے (1)
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

تُوتے کو اِن باتوں سے سکتہ سا ہوگیا، سوچنے لگا۔ سنبھلا تو زمین پر گر پڑا، پَر نُوچنے لگا۔ ملکہ مہر نگار گھبرائی کہ یہ کیا ماجرا ہوا۔ افسوس:

(2) دیکھ کر مجھ کو وہ حاضر ہوا مرجانے کو وہی غم خوار جو یاں بیٹھا تھا سمجھانے کو

گھڑی بھر میں جب حواس و ہُوش اُس سبز پُوش کے دُرست ہوئے، بولا کہ اے ملکہ مہر نگارِ باوَقار! میں وہی تُوتا کم بَخت، سحر گُفتار، جفا شعار ہوں جس نے اُس رشکِ قمر کو دربدر کیا۔ مجھ سے انجمن آرا کا ذِکر سُن کر آوارہ ہوا تھا۔ باقی حال تو آپ نے سب سُنا ہوگا۔ پھر تو ملکہ اُسے گود میں اُٹھا یہاں تک رُوئی کہ بے ہوش ہوگئی۔ شہ زادے کے بَین بہ صد شور و شَین کرنے لگی۔ باغبانیاں دَوڑیں، خدمت گزار جھپٹیں کہ آج ملکہ پر کیا حادثہ پڑا۔

جب دونوں کے ہوش و حواس پاس آئے، طبیعت ٹھہری؛ توتے نے سمجھایا کہ آپ دل کو تسکین دیں، خاطرِ مبارک جمع رکھیں، جانِ عالم اور انجمن آرا دونوں خیریت سے زندہ ہیں۔ میں نے یہ مُقدّمہ مُنجّموں اور کاہنوں سے دریافت کیا تھا۔ بِالاِتّفاق سب کا قول ہے کہ سوائے رنجِ مُفارَقت، سفرِ غربت؛ جان کی خَیر ہے، سب آملیں گے۔ بس اب مجھے رخصت کرو۔ صُبح کو خدا جانے کس وقت بیدار ہو۔ ملکہ نے کہا: واہ! بعدِ مدت ایک غم خوار، محرمِ اَسرار ہاتھ آیا تھا، وہ بھی اِتنا جلد چلا۔ طالع برسرِ کجی ہے، بے لطف زِندگی ہے۔ دیکھیں یہ بُرے دن کب جاتے ہیں اور اچھے کیوں کر آتے ہیں! اُستاد: (1)

ایک عالم کو آزما دیکھا — جس کو دیکھا، سُو بے وفا دیکھا
حالِ بد کا شریک، دُنیا میں — نہ برادر، نہ آشنا دیکھا
کیوں دِلا! ہم نہ تجھ سے کہتے تھے — جی لگانے کا کچھ مزا دیکھا
مِٹ گیا ایک دَم میں مثلِ حَباب — یاں ذرا جس نے سر اُٹھا دیکھا
سچ ہے، دُنیا مریض خانہ ہے — رنج میں سب کو مُبتَلا دیکھا
کیفِ میں، کم بہت نوآزش ہے — عشقِ خوباں میں جو نشا دیکھا

آخر کار وہ رات باتوں میں کٹی، صُبح ہوئی، پَو پھٹی۔ توتا رخصت ہوا۔ چلتے وقت ملکہ نے تھوڑا حال اپنا پرچے پر تحریر کر دیا، کہا: جہاں شاہ زادے سے ملاقات ہو، یہ خط نشانی دے کر، جو کچھ دیکھا ہے، زبانی بیان کرنا۔ توتا وہ رَقیمۂ شوق لے کر راہی ہوا۔ شہر بہ شہر خستہ جگر ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ ایک روز قریبِ شام وہ سَرگَشتہ، ناکام تھک کر؛ لبِ چشمہ کچھ درخت تھے، اُن پر بیٹھ کر، سَیلِ سرِشک

چشمِ پُرنَم سے بہاتا تھا۔ اُسی دن حَسبِ اِتّفاق جانِ عالَم اور انجمن آرا تُوتے کی صورت بنائے اُسی درخت پر آئے۔ یہ توتا، ہم جِنس سمجھ دیکھنے لگا۔ وہ دونوں مُضطَرِبُ الحال، پُرملال ایک ٹَہنی پر بیٹھ گئے۔ تُوتا سمجھا کہ یہ مِنقار بستہ میری طَرح سے دِل خستہ ہیں، پھر رُونے لگا۔ انجمن آرا نے کہا: جانِ عالَم دیکھنا! یہ تُوتا رُوتا ہے؛ شاید ہماری صورت مصیبت دیدہ، مَصائِب کشیدہ ہے۔ تُوتا باتیں تو سمجھتا تھا، پھر بیٹھا اور بولا: خداے رحیم تمھیں وہ رنج نہ دے، عَدُو بھی تمھارا یہ ستم نہ دیکھے! مجھے وہ غم ہے اور دل پر ایسا اَلَم ہے کہ ہر دم یہ دُعا ہے دشمن کا دشمن یہ صدمۂ جاں کاہ اور ایسے روزِ سیاہ نہ دیکھے۔ میر سوز

جو دم لیتا ہوں تو شعلہ جگر کا، جی جلاتا ہے ①
جو چُپ رہتا ہوں تو اندر ہی اندر جان کھاتا ہے
جو کچھ احوال کہتا ہوں تو سننے والے، روتے ہیں
نہیں کہتا ہوں تو کوہِ الم سینہ دباتا ہے
جو جنگل میں نکل جاتا ہوں تو سب دشت پھُنکتا ہے
کبھی جو شہر میں آتا ہوں تو گھر بھول جاتا ہے
پہاڑوں میں اگر پھرتا ہوں، ٹکڑے ہو کے اڑتے ہیں
جو دریا پر کبھی جاتا ہوں، سر پر خاک اُڑاتا ہے

مجمعِ رنج و مِحَن، غریقِ شَطِّ خِفّت ہمہ تن ہوں۔ مُحسن میرا خانماں آوارہ ہوا، یہ نَدامت ہے۔ مُفارَقت اُس کی ظلم ہے، قیامت ہے۔

اِس کے وَرا‌ے، تازہ حال یہ دیکھا ہے کہ ایک عاشقِ صادق اپنے معشوق سے جُدا ہے، غیر جِنسوں میں اسیرِ بلا ہے۔ اُس کے ناوَکِ آہ سے چھاتی سوراخ دار ہے۔ سِنانِ نالہ سینے کے پار ہے۔ اگر گریہ وزاری یا تڑپ اور بے قراری اُس کی بیان کروں؛ پتّھر، پانی ہو کر بہ جائے۔ سیماب کی چھاتی خَجلت سے پارہ پارہ ہو؛ راہ چلتے، اَن جان کو رَحم آئے۔

جانِ عالَم یہ سُن کر پھر بیٹھا، پوچھنے لگا: وہ کون تھا جو سَرگَشتہ و آوارۂ دشتِ اِدبار ہوا؟ اور وہ کون ہے جو ناجِنسوں میں گرِفتار ہوا؟ تُوتے نے اِن کی داستانِ گُذَشتہ اور ملکہ کا حال بیان کیا۔ انجمن آرا، ملکہ کا نام سُن کر شِگُفتہ خاطر ہوئی۔ دونوں نے درخت سے اُتر کے صورت بدلی۔ تُوتا، پہچان کر پاؤں پر گرا۔ شہ زادہ گلے سے لگا کر خوب رُویا، کہا: اے ہمدم! تم سے جو ہم جُدا ہوئے، کس کس رنج و مصیبت میں مُبتَلا ہوئے۔ دَشت بہ دَشت، کُوہ بہ کُوہ خراب و خستہ، در بہ در محتاج پھرے؛ تم اُس دن کے گئے آج پھرے۔ پھر ملکہ کا حال پوچھا۔ اُس نے خط حوالے کیا۔ پہلے انجمن آرا نے آنکھوں سے لگایا، دل نے قرار پایا۔ مضمونِ اِضطِراب، بدحواسی کا مطلب سَرنامے سے کھُلا کہ جانِ عالَم کی جگہ "ملکہ" اور ملکہ مہر نگار کی جا "رَقیمہ شوقِ جانِ عالَم" لکھ دیا تھا۔ اِس اِنتِشارِ طبیعت کو سوچ کے شہ زادے کے ہوش گُم ہوئے۔ بس کہ نامۂ شوقیہ پیچ و تابِ دل اور اِشتیاقِ ملاقات میں تحریر تھا؛ جانِ عالَم

جب اُس کو کھولتا تھا، کاغذ بولتا تھا۔ اور اَثرِ شوقِ ہم آغوشی سے ہر بار خط ہاتھ میں لپٹا جاتا تھا۔ مضمونِ مُکرّر سو سو حُسنِ طَلَب دِکھاتا تھا۔ مُؤلّف :

نامۂ شوقیہ جب میں نے رقم اُس کو کیا
سَو جگہ مضمون تب اُس میں مُکرّر ہوگیا

آنسو دمِ تحریر، یعنی لکھنے کے وقت جو خط پر ٹپکے تھے ؛ دَھبّے اور نشان اُس کے دیدۂ مُنتظِر، چشمِ حیرت زَدہ کی طَرح ہر سَطر پر کھلے تھے، اور سرخ ہالہ ہر حرف نے نکالا تھا۔ ایک جَدوَلِ خونی ہُویدا تھی، لہو رُونے کی کیفیت پیدا تھی۔ لکھا تھا، حافظ :

از خونِ دل نوشتم نزدیکِ دوست نامہ (1)
اِنّی رَأیتُ دَھرًا مِنْ ھَجرِكَ الْقِیامَہ

شعر :

سوادِ دیدہ حل کردم، نوشتم نامہ سوی تو
کہ تا ہنگامِ خواندن چشمِ من افتد بروی تو

اے یارِ وفادار، صادِقُ الْاِقرار ! اللہ تجھے سلامت رکھے۔ شَرحِ اِشتِیاق، داستانِ فراق قصۂ طوُل وطوِیل ہے ؛ زندگی کا بکھیڑا، عرصہ قلیل ہے۔ اگر ہماری زیست منظور ہے، جلد آؤ، صورت دکھاؤ۔ نہیں تو تاَسُّف کروگے، پچھتاؤگے۔ تم نے آنے میں اگر دیر کی، تو ہم نے صدمۂ ہجر سے تڑپ کر جان دی ؛ مِٹّی کے ڈھیر پر رُو رُو کے خاک اُڑاؤگے۔ مُؤلّف :

شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے
جان جاتی ہے، اجی آؤ خدا کے واسطے

کوئی دم کا سینے میں دَم مہمان ہے، نام کو جِسم میں جان ہے۔ فلک نے ہماری صحبت کا رشک کھایا، بے تَفرِقَہ پَردازی ظالم کو چین نہ آیا۔ روز و شب رنجِ جدائی سے جان کو کھوتے ہیں۔ اِتنا کبھی کاہے کو کسی دن ہنسے تھے، جیسا بِلَک بِلَک کر فرقت کی راتوں میں روتے ہیں۔

میر:
بے تابیِ دل کسے سُنائیں
یہ دیدۂ تر کسے دِکھائیں

تمھاری تقریرِ دل پذیر ہر دم بر نوکِ زَباں ہے، بے تصوّر سے باتیں کیے چین آرام کہاں ہے۔ اُستاد:

(1)
یہ جانتے، تو نہ باتوں کی تجھ سے خو کرتے
ترے خَیال سے پہروں ہی گفتگو کرتے

ہمارے تڑپنے سے ہمسایہ سخت تنگ ہے۔ دَولت سَرا زِنداں سے تیرہ و تنگ ہے۔ میر:

گر یوں ہی رہے گی بے قراری تو ہو چکی زندگی ہماری

وحشت پیرامُونِ حال ہے۔ ہر گھڑی فرقت کی، ماہ ہے۔ جو پَہر ہے، وہ سال ہے۔ میر:

(2)
دل کوئی دم میں خون ہووے گا آج کل میں جُنون ہووے گا

تمھاری صورت ہر پَل رُو بہ رُو ہے۔ جس طرف دیکھا، تو ہی تو ہے۔

چشمِ فُرقت، دیدۂ دریا بار ہے۔ آنکھ نہیں، چشمۂ آبشار ہے۔ افسوس تو یہ ہے جن آنکھوں کو تم پُرنم نہ دیکھ سکتے تھے، اُن سے خون کے دریا بہ گئے۔ مؤلّف :

تم نے نہ ہماری، پر، خبر لی — چھاتی پتّھر کی، کیوں جی، کرلی

دن رات کی وہ صحبت تمھارے ساتھ کی جب یاد آتی ہے؛ نینْد اُچٹتی ہے، بے چینی کی رات پہاڑ ہوجاتی ہے، کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ چارپائی تنہائی میں پلنگ بن کر کاٹے کھاتی ہے، بالش پر نینْد اُڑاتی ہے۔ خواب میں سونے کا خیال نہیں۔ کھانا پانی ہجر میں حرام ہے، حلال نہیں۔ وہ سر، جو اکثر آپ کے زانو پر رہا ہے، اُس کو سو سو بار بالش و بالیں پر دے پٹکا ہے۔ مؤلّف :

جس میں بانْہیں تری حمائل تھیں — طوقِ حسرت میں اب وہ گردن ہے

میرے جاگنے کے، اے پیارے! ستارے شاہد ہیں۔ گواہِ شرعی زاہد ہیں۔ مُرغِ سحر کو بے قراری سے چونکاتی ہوں۔ مؤذن کی نینْد آہ و زاری سے اُڑاتی ہوں۔ شبِ وصل یہ ہمیں جگاتے تھے، ستاتے تھے؛ اب ہجر کی رات ہم اُنھیں سونے نہیں دیتے ہیں، مَن مانتے بدلے لیتے ہیں۔ دل ہر ساعت گھڑی سے زیادہ نالاں ہے، ہر پہر گجر سے فزوں شور و فغاں ہے۔ چشمِ ثوابت و سیّار معائنۂ حالِ زار، پُرملال سے بہ صد حیرت وا ہے۔ چرخِ گرداں میری گردش دیکھ کر چکّر کر رہا ہے۔ اُستاد :

کھا لیجے تھوڑا زہر منگا، ہم اور کہیں تم اور کہیں[1]
کیا لطف ہے ایسے جینے کا، ہم اور کہیں تم اور کہیں

اِفشائے حال باعثِ ندامت، موجب دشمنوں کی خوشی کا، سبب

دوستوں کے ملال کا ہے۔ لا اَعلَم :

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

اگر جیتے جی کبھی مل جائیں گے، رنجِ فرقت کے دُکھڑے مفصّل زبانی کہ سُنائیں گے۔ اور جو فلک کو یہ نہیں منظور ہے، تو انسان بہ ہر عُنوان مجبور ہے؛ یہ حسرت بھی در گور، گور میں لے جائیں گے۔ سعدی :

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ①

بہ خُدا نمازِ پنجگانہ میں یہ دُعا ہے، جامعُ المُتفرّقین سے یہی التجا ہے کہ تم سے جلد ملاقات ہو، باہم شکوہ و شکایت ہو۔ دلِ بے قرار تسکین پائے، جانِ زار کو چین آئے۔ زیادہ دیکھنے کا اشتیاق ہے، اشتیاق ہے۔ شام و پگاہ جدائی کا صدمۂ جاں کاہ سخت شاق ہے، شاق ہے۔ خوگرِ وصل، ہجر کے الم کا مُبتدی ہے یا مَشّاق ہے۔

یہ خط کا مضمون جو پڑھا، دونوں نے رو دیا۔ اَز سَرِ نَو مع سَرنامہ سَراسَر وہ نامہ بِھگو دیا۔ اُس رات کو تو چار و ناچار وہاں مُقام کیا؛ صُبح ہوتے ہی صورت بدلی، کوُچ کا سَرانجام کیا۔ آگے آگے تُوتا رہ بَر، پیچھے پیچھے وہ دونوں تیز پَر۔

پہنچنا شہ زادۂ والا جاہ کا مَرکبِ صبا پر مع انجمن آرا ملکہ مِہر نگار کے پاس بہ ہمراہیِ رفیقِ کاملِ سبز لباس۔ اور مُطّلع ہونا وہاں کے بادشاہ کا، بھیجنا سپاہ کا، پھر

بدولتِ نقش مطیع ہوجانا اُس فوج کا، داخلہ لشکرِ دریا موج کا۔

نظم:

پلادے تو ساقی مےِ لالہ فام
ہُوا چاہتا ہے یہ قصّہ تمام

وہ مَے دے کہ ہوں دور دل سے الم
کہ ہوتے ہیں معشوق و عاشق بہم

جُدائی کے ایّام طے ہو چکے
شبِ ہجر میں خوب سا رُو چکے

مچا دوں کوئی دم بھلا چہچہے
کہ رنجِ جدائی بہت سے سہے

مَثَل ہے یہ مشہور اے ذی شعور
کہ ہے رنج کے بعد راحت ضَرور

مُحَرِّرانِ حالِ طالب و مطلوب و حاکیانِ حکایاتِ خوب و مرغوب لکھتے ہیں کہ وہ پَرِندۂ ہَوائے شوق یعنی جانِ عالَم، مع ماہ لقا انجمن آرا اور طائرِ زمرّد پیں لباسِ دَشت پیما، آٹھویں روز ملکہ کے پاس پہنچا۔ یہاں جس دن سے تُوتا رخصت ہوا تھا، ملکہ مہر نگار دونوں وقت بِلا ناغہ باغ میں آتی تھی، درخت خالی دیکھ کر گھبراتی تھی۔ بیش تر صبح و شام وہ ناکام، اُس درخت کے تلے جہاں تُوتا ملا تھا، یہ کہتی تھی، میر سوز:

مانندِ جَرَس پھٹ گئی چھاتی تو فُغاں سے [1]
فریاد کو پہنچا نہ کوئی راہ رَواں سے

اُس روز مُوافِقِ معمُول وہ دِل ملوُل قریبِ شام درخت کے نیچے حزین و زار، تُوتے کے اِنتظار میں کھڑی تھی اور آنکھ ٹہنی سے لڑی تھی۔

دیدۂ خوں بار سے دریا اُمڈا تھا، اشکِ مسلسل سے تا دامن یاقوت اور موتیوں کی لڑی تھی۔ جب دلِ سوختہ گھبراتا، تو سوزِ دروں مِثلِ دُخاں لب پر آتا۔ جی بہلانے کو یہ غزل پڑھتی، مؤلّف:

آتشِ فرقت سے سینہ جب سے مجمر ہو گیا بھُن کے لختِ دل مرا ہر ایک، اَخگر ہو گیا
باعثِ اِفشائے ذِلّت دم نہ مارا ہیں نے گاہ ورنہ زیرِ آسماں کیا کیا نہ مجھ پر ہو گیا
نزع تک تو آمدِ جاناں کا کھینچا انتظار وہ نہ آیا، وعدہ اپنا یاں برابر ہو گیا
کیا ڈراتا ہے ہمیں واعظ سُنا شورِ نشور شامِ فرقت، یاں عذابِ روزِ محشر ہو گیا
اب جو ہنستا ہوں تو ہنستے ہنستے بھی گرتے ہیں اشک روتے روتے، آخرش رونے کا خوگر ہو گیا
فکر پھر کس کو ہو دیواں جمع کرنے کی سُرور جب کہ ہو مجموعۂ خاطر ہی اَبتر ہو گیا

دَفعتہً تُوتے نے سلام کیا۔ وہ خوش ہو کر بولی: اے قاصدِ نیک صدا و ہُدہُدِ شہرِ سَبا! میرے سُلیمانِ حُسن و خوبی کا پتا، یا اُس بِلقیسِ محبوبی کا سُراغ ہاتھ آیا؟ تُوتے نے کہا: اے ملکۂ عالمِ قدر داں! خبر داروں کو خِلعت و اِنعام دیتے ہیں، جب دوست کا پیغام پوچھتے ہیں، عَلَی الخُصوص یہ خبرِ فرحت اثر! پہلے یہ اِرشاد ہو کہ اگر کچھ پتا بتاؤں گا، تو اُس کی اُجرت کیا پاؤں گا؟ یہ سُن کے ملکہ کی جانِ رفتہ بدن میں آئی۔ یقین ہوا، اِس نے مُفصّل خبر پائی۔ یہ کہا، اُستاد:

(1)
پیغامِ دوست جلد تو پیغام بر سُنا
گھبرا کے دم ہی جائے نہ میرا کہیں اُلٹ

تُوتا عرض کرنے لگا: حضور کا اِرشاد واقعی بجا ہے؛ مگر ایسی خبر کا جلد کہنا، حُمق

کا مُقتَضا ہے۔ اُستاد :

دفعۃً خوگرِ فرقت کو نہ دے مُژدۂ وصل[1]

خَبَرِ خوش نہیں اچھّی جو یکایک ہووے

تُوتا تقریر کو طوُل دیتا تھا۔ کبھی خوش، گاہ مَلوُل کر دیتا تھا۔ ملکہ بے چین ہوئی جاتی تھی۔ اِدھر شہ زادے سے زیادہ انجمن آرا گھبراتی تھی۔ غرض نہ رہ سکی، صورت بدلی۔ جانِ عالَم بھی مُجَسّم ہو کے سامنے آیا۔ آپس میں عاشق و معشوق و معشوق و عاشق خوب گلے مِل مِل کے رُوئے۔ غُبارِ کُلفَتِ پارینہ، داغِ مُہاجَرتِ دیرینہ دل کھول کر صَفحۂ سینہ سے دھوئے۔ رُونے کی آواز سے مُغلانیاں، خَواصیں جمع ہوئیں۔ جس کی آنکھ اِن دونوں پر پڑی؛ دوڑ کر صدقے ہوئی اور پاؤں پر گر پڑی۔ جَلَّ جَلالُہٗ! حُسنِ خوب سے، کوئی چیز زیادہ دل کش اور محبوب نہیں۔ دوست تو دوست ہے، دشمن غَش کر جاتا ہے۔ لڑکا ہو یا بوڑھا، شَیدا نظر آتا ہے۔ مال تو کیا مال ہے؛ سوُت کی اَنٹی بھی اگر پاس ہو، تو اَنٹی ماری سے خریدار بن جاتا ہے۔ جان عزیز نہیں، حُرمت کچھ چیز نہیں۔ غلام کی غلامی پر آقا فخر کرتا ہے۔ جانِ تازہ پاتا ہے جو کوئی کہتا ہے کہ : یہ اُس پر مرتا ہے۔ عِیاذاً باللہ یہ اَمر محمود نہیں۔ اِس میں غیرِ ضَرَر کچھ سوُد نہیں۔

غَرض کہ خُرّم و خَنداں بارہ دری میں آئے۔ انجمن آرا سے ملکہ نے حال پوچھا۔ اُس نے دیو کا اُٹھا لے جانا، باغ کی

بے سَروپائی؛ پھر جانِ عالَم کی رَسائی اور سفید دیو کا آنا، باہم کی لڑائی، پھر اُس کو قتل کر کے آفت سے چھُڑانا؛ اپنی پیادہ پائی، صحرا نَوردی، ہَوا گرم، پاؤں کا وَرَم؛ پھر وہ عَمَل جوگی کا بتایا ہوا شہ زادے کا سِکھانا، بادِ ہَوائی سفر، توتے سے درخت پر مل جانا سُنا دیا۔ پھر اُس نے جانِ عالَم سے سَرگُذشت پوچھی، اپنی صَعوبَت کہی۔ گُذَشتہ کا حال میں ذِکر کر کے، جو کچھ دھیان بندھا، پھر سب رُونے لگے۔ تُوتا بدمزہ، خفا ہوا، کہا: صاحبو! اب یہ قصہ بکھیڑا دور کرو، سجدۂ شُکر بجا لاؤ، کھیلو کھاؤ، ہنسی خوشی کا مذکور کرو۔ یاد رکھو یہ بات: گذشتہ را صَلوات۔ مُصحفی:

جُز حسرت و افسوس، نہیں ہاتھ کچھ آتا
ایّامِ گذشتہ کو کبھی یاد نہ کیجے

ملکہ بولی: اے شیریں مَقال، مُبارَک قَدَم، خُجَستہ فال! شہ زادے کے برابر عقل کا دشمن کسی نے دیکھا نہ سُنا ہوگا۔ سَوز:

معلوم ہم کو دل کے سُلوکوں سے یہ ہوا (1)
نادان ہے جو دوست، وہ دشمن ہے جان کا

اِس نے جتنی محنت و مَشقّت اُٹھائی، اپنی بدعقلی کی سزا پائی۔ بھلا عالَمِ تنہائی میں جو کچھ کیا سُو کیا؛ دو تین بار اپنے ساتھ ہم دونوں کو خراب، آفت کا مُبتَلا کر چکا ہے، آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر، دَر بہ رُوئے دشمناں بند، دوست بادِلِ خُرّسَند باہم بیٹھے اور دَورِ ساغَر

بے دغدغۂ فلکِ تفرقہ پسند و سفلہ پرور شروع ہوا۔ مطرب نے ساز کی ناسازی پر گوشمالی دی، صداے عیش و طرب بلند ہوئی۔

یہ خبر بارہ دری میں مشتہر ہوئی اور وہاں کے بادشاہ کو پہنچی کہ ایک مرد صاحبِ جمال، دوسری عورت پری تمثال ملکہ کے پاس تازہ وارد ہوئی۔ کہنے لگا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ گھر بیٹھے یہ عنایتِ پروردگار ہے۔ نصیب چمکا ہوا ہے، طالع یار ہے۔ ایک موجود تھی، دو اور آئے۔ اُسی دم دو ہزار سوارِ جرّار اور دو سپہ سالارِ تجربہ کار نگہ بانی کو بھیجے۔ جانِ عالم نے یہ ماجرا سُنا، کہا: فضلِ الٰہی چاہیے، بعدِ مدّتِ مدید یہ صحبتِ ہمدیگر میسّر ہے، صبح کو سمجھ لیں گے۔ سوار تو باغ گھیرے کھڑے رہے، یہاں تمام شب جلسے بڑے رہے۔

جس وقت خسروِ خاور آرام گاہِ مشرق سے برآمد ہو کے جلوہ گرِ تختِ زنگاری ہوا اور سپہ سالارِ انجم مع سوار، پیدل ثوابت و سیارہ کے، کوہِ مغرب کی طرف فراری ہوا؛ جانِ عالم حمّام سے غسل کر کے نکلا۔ اُس لوح سے اِسمِ تسخیر پڑھتا باغ کے دروازے پر آیا۔ جس کی نگاہ پڑی، دبدبۂ شوکت اور اِسم کی برکت سے آداب بجا لایا، دست بستہ رو بہ رو آیا۔ وہ دو ہزار سوار مع سپہ سالار فرماں بردار ہوئے؛ پھر تو دروازہ بہ کشادہ پیشانی کھولا۔

یہ خبرِ وحشت اثر اُس بادشاہ کو پہنچی؛ اور سوار پیادے،

لڑائی کے آمادے بھیجے۔ وہ بھی جب سامنے آئے، گھبرائے، حلقۂ غُلامی کان میں ڈالا، جنگ کا خَیال نہ رہا۔ پھر تو مشہور ہوا کہ ساحر ہے۔ اَلمُختَصَر، تمام فوج آکر شریک ہوئی۔ اُس وقت وہاں کا تاج دار طَیش کھا کے سوار ہوا۔ کہاں یَکّہ سوار، کُجا اَنبُوہِ بے شمار! تلوار چلی، دس بارہ زخمی ہوئے، کچھ جان سے گئے۔ اور فوج نے نَرغا کر، جان سے تو نہ مارا، کمندوں میں پھنسا لیا اور جانِ عالَم کے حوالے کیا۔ شہ زادۂ عالی حوصلہ خوفِ خدا سے اور نحوستِ طالِع نارَسا، کج ادا سے مِثلِ بید کانپا اور فرمایا: اللہ وہ وقت کسی کو نہ دِکھائے جو اپنی فوج یا رعیّت حاکم سے ناراض ہو۔ دوست دشمن ہو جائے، عداوت سے پیش آئے۔ یہ اِرشاد کرکے اُس سے بَغَل گیر ہوا، برابر بِٹھایا، قتل سے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ بے چارہ نادِم و پشیماں، سَر دَر گرِیباں، گھٹنے پر گردن جُھکا، مُنفَعِل، خاموش بیٹھا۔ شہ زادے نے کہا: مسافر کُشی صِفَتِ شاہی سے بعید ہے۔ ہم تمھارے مہمان تھے، تم نے دعوت کے بدلے عداوت کی؛ اللہ کو یہ بات پسند نہ ہوئی، عبرت کا تماشا دکھایا۔ یہ تخت، یہ سلطنت آپ کو مُبارک رہے۔ بندہ غریبِ دِیار، کمر باندھے چلنے کو تیّار ہے۔ اِس لڑائی کا قصّہ، فَسانہ ہو جائے گا۔ اِمرُوز یا فَردا یہ مسافر روانہ ہو جائے گا۔ وہ اِس کی فصاحت و بلاغت اور یہ سیر چشمی دیکھ کر حیران ہوا، کہ دشمن کو گرِفتار کیا، پھر مُلک بخش دیا۔ سِر جُھکا کر

بولا: بہ خُدائے عَزَّ وَجَلّ لائقِ حکومت، قابلِ سلطنت آپ کی ذاتِ فَرخُندہ صِفات ہے۔ جانِ عالَم نے کہا: آپ یہ اپنی تعریف کرتے ہیں، دگرنہ من آنم کہ خوب می دانم۔

اَلقِصّہ، وہ مَحجُوب ہو کر رخصت ہوا۔ فوج کو صُلحْ جو ثابِت ہوئی، اپنے بادشاہ کے ہمراہ چلی گئی۔ جب یہ جنگِ زرگری ہو چکی؛ مکان پر آکر بہت تیّاری اور تکلّف سے دعوت کی اور عُذرِ تَقصیر کرکے عَفْو کا اُمیدوار ہوا۔ شہر والے یہ خبر سُن کے ایسے مشتاق ہوئے کہ غُول کے غُول آنے لگے۔ رُوز باغ کے دروازے پر میلا رہتا تھا، کسی وقت وہ کوچہ نہ اکیلا رہتا تھا۔

پھر جاسوس، شُتُر سوار، ہرکارے فوج کے تَجَسُّس میں بھیجے۔ چالیس منزل پر لشکر ملا۔ جانِ عالَم کی مُفارَقت سے کسی میں جان نہ تھی۔ فرمانِ مُہری دیکھ کر سب نے جانِ تازہ پائی، مُہر آنکھوں سے لگائی۔ رات دن کوچ کرتی، بیسؔ پچّیسؔ دن میں بہ رسمِ یَلغار، فوج داخل ہوئی۔ شہ زادہ لشکر کو مُلاحظہ کرکے مسرور ہوا، ملال بھولا، رنج دور ہوا۔ اَرکانِ سلطنت نے ملازمت حاصل کی، سب نے نَذر دی۔ مُوافقِ قَدر و مَنزِلت خِلعَت اور انعام خاص و عام کو مَرحَمَت ہوا۔ اور رِعایا بَرایا، بازاری، دُکان دار، اہلِ حرفہ کو بھی کچھ دیا۔ فوج کے سرداروں کو خِلعَتِ جواہر نِگار، سِپَر و شمشیرِ مُرَصَّع کار عنایت کرکے، دُو ماہہ تمام فوج کو انعام میں دیا۔ اَز سَرِ نَو لشکر چمکا دیا۔ پھر وہاں سے

کوچ ہوا۔ وہی راہ میں جلسے، اِختلاط، فسانے، حِکایات، عیش و نَشاط۔ تُوتا ہنساتا، رَمز و کِنایے کرتا، لطیفے سُناتا، دِل بہلاتا جاتا تھا۔ ہر صُبح باخاطرِ شگُفتہ مثلِ نکہتِ گُل کوچ۔ ہر شام بسانِ فصلِ بہار بہ آسایش مُقام۔ روز و شب بہ راحت و آرام کبھی کوچ، کبھی مُقام کرتے چلے۔

وُرُودِ عَساکرِ فیروزی اثر صحرائے ہمیشہ بہار میں۔ دُفُورِ سَرما، شِدّتِ بَرد دشت و کُہسار میں۔ کیفیت باہم کے جلسے کی، ترقّی شراب کے نشے کی۔ خیالاتِ فاسد آنا، تُوتے کا سمجھانا، پھر شہ زادے کا پچھتانا۔

ناگاہ ایک روز گُذرِ موکبِ باحشمت و جلال، فرّ و شوکت سے، ایک صحرائے باغ و بہار، دَشتِ لالہ زارِ بے ملال میں ہوا۔ فِضائے صحرا قابلِ تحریر۔ کیفیّتِ دشتِ گُلشن آسا لائقِ تقریر۔ بُوباس ہر برگ و گُل کی رشکِ مُشکِ اَذفَر۔ صَفحۂ بیاباں مُعنبر و مُعطّر۔ چشموں کا پانی صفا میں آبِ گُہر سے آب دار تر، ذائقے میں بہ از شیر و شکر۔ چِلّے کے جاڑے، کڑاکے کی سردی تھی؛ گویا کہ زمین سے

آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ پرند چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے، بھوک اور پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے، دھوپ کھانے کو باہر نہ آتے تھے، قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا، دمِ تقریر ہر شخص کے مُنہ سے دھواں دھار دُھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی، مُنہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مارِ سیاہ اُوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا، سردی کے باعث دُم دبا کے بانبی میں دبکا جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا۔ عاشق و معشوق بھی اگر ساتھ سوتے تھے، گھٹتے تھے، مگر گھٹنے پیٹ سے جُدا نہ ہوتے تھے۔ اَشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اُولا تھا، پروانوں نے گرد پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔ شعلہ کانپتا تھا، فانوس کے لحاف میں مُنہ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا، پگھلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گواہِ شرعی شرر تھا؛ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔ تنورِ فلکِ چارم کی چھاتی سرد تھی۔ گلخن میں یہ بُرودت تھی کہ کشمیر گرد تھی۔ لُنجوں نے بٹیر پکڑے، لوے لوّوں کے ہاتھ آئے، لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سر زمینِ ہند میں مُردے نہ جلتے تھے، زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے۔ آتشِ رُخسارِ گُل شبنم نے بُجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اُوس برگ و بار کی،

صنعت پروردگار کی دِکھاتی تھی، مُرصّع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم، خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے برگ و بار میں الماس اور موتیوں کے سُبک آویزے تھے۔ عِذارِ لالۂ حمرا رشکِ زعفراں تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں، کہر بائی پتے، بہار میں رنگِ خزاں تھا۔ اِس سردی کا کہیں ٹھور ٹھکانا ہے، حمّام پر یہ پھبتی تھی کہ برف خانہ ہے۔ آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے، زرتُشت کا طریق اِختیار کرتے تھے۔ اُسی سردی کا یہ وُفور ہے کہ آج تک بُتوں کی سرد مہری مشہور ہے۔ آفتاب عازمِ بُرجِ حَمَل تھا، آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زیست سمندر کے عُنوان تھی، آگ میں خلقت کی جان تھی۔ عاشق تو کیا، معشوق ٹھنڈی سانس بھرتے تھے، گرمی نہ کرتے تھے۔ دانت سے دانت بجتا تھا۔ ہونٹ نیلم کو شرماتے تھے، پان کے لاکھے میں سوسن کی پنکھڑی سے نظر آتے تھے۔ عاشق تن، پریوں کو ساتھ لے کے سوتے تھے، اِس پر بچھونے گرم نہ ہوتے تھے۔ عالم اللہ کا جاڑے میں اَنمنت تھا۔ جس کو دیکھا، آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اُس دشت میں ایسا پالا پڑا، تمام اہلِ لشکر کو تپ لرزے کا عالم تھا۔ بانکے ترچھے خود بہ خود اینٹھے جاتے تھے، ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے۔ تمنچے، چقماق، پتھر کلے؛ لاٹھی سے بدتر تھے۔ بندوق میں لاگ نہ تھی، چانپ کے پتھروں میں آگ نہ تھی۔ اور توڑے دار کا یہ حال تھا، بوجھ کندھا توڑتا تھا، قدم اُٹھانا مُحال تھا۔ توڑا

ہر ایک ، گُل تھا ؛ تُوتے کی جگہ شورِ بُلبُل تھا۔ ملائم لوگوں کے حواس جَم گئے تھے ، جُگنو کو چنگاری کے دھوکے میں اُٹھانے کو تھم گئے تھے۔ اور ہوش ایسے کانپتے تھے ؛ کیچوے کی مِٹّی کو الاو سمجھ ، پھونکتے پھونکتے ہانپتے تھے۔ سردی بس کہ کارفرما تھی ، ایک کو دوسرے کی تمنّا تھی۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالم گیر ہوا تھا کہ کُرۂ نار ، زمہریر ہوا تھا۔

جانِ عالم نے فرمایا : آج خیمہ ہمارا یہیں ہو۔ جس دم تمام لشکر نے مِثلِ دَرمِثل قیام کیا ، خود مُتوَجِّہِ سامانِ عیش و نَشاط ہوا۔ ملکہ اور انجمن آرا سے پری پیکر محبوب۔ تُوتا مُصاحِبِ بے بَدَل ، بہ دِل مرغوب۔ گردش میں دَورِ شرابِ ناب آیا ، ساغر میں آفتاب آیا ؛ اِلّا ، کَشتیِ شراب کی ، نہ بَطِ مَے چلتی تھی ؛ نہ کباب بُھنتے تھے ، نہ آگ جلتی تھی۔ گلاس شراب کا برف کی قُفلی کو شرماتا تھا ، قطرۂ مَے اُس میں گرتے ہی جَم جاتا تھا۔ مینائے بے زَباں کے مُنہ پر رُوئی تھی ، ایسی سردی ہوئی تھی۔ گلا بیٹھا تھا ؛ جب بہت غُل کرتی ، تب قُلقُل کرتی۔ لبِ ساغر خُشک ، جِسم پر پسینا تھا ؛ پانی کا پیالہ فخرِ آبگینہ تھا۔ جاڑے کا لشکر میں ہر طرف شُور و غُل تھا۔ بازار میں رُوئی کا لین دِین بالکل تھا۔

جب دَورِ آفتاب ماہ جبینوں میں چمکا ؛ عالَمِ سُرور میں ، نشے کے وُفور میں جانِ عالَم کو خیالِ نزدیک و دور آیا۔ دل میں سُوچا کہ اِتنے عرصۂ دراز ، زمانۂ دیریاز تک ملکہ اور انجمن آرا کو ، ہم سے

فُرقت ، غیروں سے قُربت رہی ؛ رنڈی کا اِعتبار کیا ہے ، یہ قوم قدیم سے بے وفا ہے ۔ فِردَوسی :

اگر نیک بودے سَر انجامِ زن
زناں را "مَرزَن" نام بودے نہ "زَن"

یہ نَشیب و فَراز جو ذِہن میں آیا ؛ جَلی کَٹی باہم ہونے لگی ، کَج بحثی صُحبت کا لطف کھونے لگی ۔ وہ سبز پُوش ، خانہ بدوش ، موقع شَناس ، مزاج داں ، دِل سوز ، ادب آموز ، بے زَباں بلبلِ ہزار داستاں دل کا حال جانتا تھا ، اُڑتی چِڑیا پہچانتا تھا ؛ سمجھا : جانِ عالَم کی طبیعت کبیدہ ہوئی ۔ قریب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ ایسی گفتگو آغاز ہو ، جس کا انجام یہ صُحبت دَرہَم و بَرہَم کرے ۔ زندگی سب کی تَلخ ہو ؛ ہر کلمہ نَبات کا ، کارِ سَم کرے ۔ بات کو کاٹ ، طبیعت کو اُچاٹ ، کہنے لگا : شہ زادۂ عالَم ! نشہ اِس کیفیت سے حرام ہے کہ اِس کی ترقّی میں عقل کو تنزّل ہوتا ہے ۔ خیالِ بیہودہ ، لاطائل آتے ہیں ، احسان بھول جاتے ہیں ۔ فَقَط گُمانِ بے جا اور خَیال ، وہ بھی نشے کے حال کا ؛ اُس پر حقِّ خدمت ناحق بھول جانا ، رُوکھے ہو کے بگڑنا ، مُنہ بنانا ، گویا اِن تِلوں میں تیل نہ تھا ، کبھی مِیل نہ تھا ؛ آدمیّت سے بعید ہے ۔ اِن میں کوئی آپ کی زَر خرید ہے ؟ ایک ساعت اِدھر مُخاطَب ہوجیے ۔ اِس مدّتِ مُفارَقت میں بہت سانحے دیکھے ، افسانے اپنے بیگانے کے سُنے ؛ اگر بہ گوشِ ہوش اُنھیں سُنیے تو یہ تخیُّلاتِ فاسِد

دور ہوں۔ جانِ عالَم نے کہا: ایسی بات اِس وقت واجبات سے ہے، جلد کہہ۔

حکایتِ ہوش رُبا، نقلِ عبرت خیز، حیرت افزا قاضیِ مُتَشَرِّع اور مُفتیِ صاحبِ وَرَع کی۔ قاضی کا ایمان کھونا، بھاوج پر فریفتہ ہونا۔ اُس کا انکار کرنا، قاضی کا مُفتی میں بے گناہ سنگسار کرنا۔ اُس کی جان بچ جانا، بادشاہ کا آنا۔ سب حال ظاہر ہونا، عورت کی پاک دامنی سے ماہر ہونا۔

تُوتے نے کہا: جناب امام جعفرِ صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا مُتَدَیِّن، نیک طینت، باصفا، سخی، شجاع، عابد، پارسا۔ اُس کے عہدِ دولت میں دو بھائی تھے: ایک تو شہر کا قاضی، دوسرا مفتی۔ بہ ظاہر مردِ مسلماں، صاحبِ ایماں۔ مفتی کی بی بی نہایت شکیلہ، بہت جمیلہ تھی۔ اِتِّفاقاً عِندَ الضَّرورت مفتی کو بادشاہ نے کہیں دو چار منزل بھیجا۔ وہ اپنی عورت، دمِ رخصت بھائی کو سونپ گیا۔ قاضی گاہ گاہ خبر کو اُس عورت کے پاس جاتا تھا۔ پردہ اِسی واسطے

خوب ہوتا ہے۔ جتنا دُنیا کا قصّہ بکھیڑا ہے، سب آنکھوں سے دیکھا سُنا ہے۔ وہ تو بہ درجہ حَسین تھی؛ شیطانِ عَلَیہِ اللَّعن نے وَرغَلانا؛ قاضی کی آنکھ پڑی، فَریفتہ ہوا۔ چند روز میں ولولۂ طبیعت حد سے فُزوں، بلکہ قریبِ جُنوں ہوا؛ مگر وہ عورت جیسی خوب صورت تھی، اُس سے زیادہ عِصمت و عِفّت رکھتی تھی۔ ایسا حُسن حُسنِ اِتّفاق سے ہوتا ہے۔

قاضی نے ایک روز اُس سے سوالِ وِصال کیا۔ اُس نے اِس اَمرِ بد سے اَزحد انکار کر کے، خوشامد کا کچھ نہ خیال کیا۔ قاضی سمجھا: یہ راضی نہ ہوئی اور نہ ہوگی۔ خِفّت میں دو اندیشے ہوئے: ایک تو محرومیِ وِصال، دوسرے اِفشاے راز کا ملال؛ گھبرا کر بادشاہ سے عرض کی: دَمِ رخصت میرا بھائی اپنی جُورو مجھے سَونپ گیا تھا؛ اُس فاحِشہ نے اُس کی غَیبَت میں زِنا کیا، مجھے ثبوتِ کامل ہوا۔ بادشاہ نے مردِ مُتَشَرِّع سمجھ، صاحِبِ زُہد و وَرَع جان کر اِختیار دیا۔ قاضی نے اُس کو تنہا لے جا کر سمجھایا کہ اب تک خَیر ہے، مجھ سے راضی ہو؛ نہیں، بڑا شَر ہوگا، بے سُود تیری جان کا ضَرَر ہوگا۔ دل پر جَبر اِختیار کروں گا، تجھے سَنگسار کروں گا۔ وہ عورت شیر صفت اُس کی گیدڑ بھبکی سے نہ ڈری، مرگ پر راضی ہوئی۔ اُس کم بخت شہوت پرست نے شہر کے باہر لے جا، اُس کو سَنگسار کیا۔ خلقِ خدا عبرت کُناں، خائف و لَرزاں اپنے اپنے گھر پھری۔ وہاں حافِظِ حقیقی نے شیشۂ حیات اُس نیک صِفات کا سنگِ ستمِ قاضی سے بچا لیا، ٹھیس نہ لگی۔

خواہشِ بے جا میں ایسا ہی ہو جاتا ہے، عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ شب کو عورت پتھر سَرکا، ایک سمت پیادہ پا روانہ ہوئی۔

جنگل میں ایک وِیرانی رہتا تھا، مردِ خدا پرست۔ بستی کو چھوڑ، اہلِ دُنیا سے مُنہ موڑ دَشت بسایا تھا، ویرانے میں گھر بنایا تھا۔ یہ جب وہاں پہنچی، اُس حق پرست نے اِس کی غریبُ الوطنی پر رَحم کھایا۔ لڑکا اُس کا خُرد سال تھا؛ اُس کی خبر گیری، خدمت کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس وِیرانی کا ایک غُلام بسخت نُطفۂ حرام تھا، بد ذات، گُپدی۔ مَثَل مشہور ہے: لَاخَیرَ فِی عَبِیدِی۔ رنڈی جوان دیکھ کر عاشق ہوا۔ بہت سی چاپلوسی کی، وہ ڈھب پر نہ چڑھی۔ اُس شَقی نے وِیرانی کا لڑکا ذَبح کرکے، تُہمتِ قتل اُس عورت پر کی۔ اولاد کی مَحبّت مشہور ہے۔ امیر ہو یا فقیر، اِس میں مجبور ہے۔ وِیرانی کو بہ شِدّت رنج ہوا؛ لیکن وہ صابر و شاکر تھا، عورت سے کچھ نہ کہا، بجز: رَضِینا بِالقَضَا۔ اور بیس دینار زادِ راہ دے کر رُخصت کیا۔

وہ بے چاری مصیبت کی ماری چل نکلی۔ ایک شہر میں وارِد ہوئی۔ بازار میں بھیڑ دیکھی، شور و غُل برپا تھا، اور ایک شخص کو زنجیر و طَوق میں پھنسا، کشاں کشاں لوگ لیے جاتے تھے۔ عورت نے پوچھا: اِس سے کون سا جُرمِ قَبیح سَرزَد ہوا، جو ایسی آفت میں مُبتَلا کیا۔ لوگوں نے کہا: یہ بیس دینار کا قرض دار ہے، ادا کی طاقت نہیں؛ اُس کے بدلے یہاں کے سردار نے دار کا حکم دیا ہے۔ عورت کو رَحم آیا، وہی وِیرانی کے دینار دے کر قید سے چُھڑا دیا۔ وہ مکّار، بد باطن، عیّار تھا۔ رنڈی

جو خوب صورت دیکھی، جی بھر بھر آیا، کہا: تو تو میری مُحسِنَہ ہے، میں تیرے ہمراہ رہوں گا، خدمت گزاری کروں گا۔ اِس حیلے سے ساتھ ہوا۔

کچھ دور شہر سے نکلی تھی، راہ میں دریا ملا۔ یہ مدّت سے نہائی نہ تھی، کپڑے بھی کثیف ہو گئے تھے؛ ایک طرف لباس دھو کر، نہا رہی تھی۔ ناگہاں ایک سمت سے دو جہاز وہاں آئے۔ اہلِ جہاز نے دیکھا: عورت قمر طَلعت ہے، اُسی حرام زادے سے حال پوچھا کہ یہ کون ہے؟ اُس نے اپنی لونڈی بتایا۔ مول تول درمیان آیا۔ غَرَض کہ مَبالِغ خَطیر پر بیچ کر، کسی بہانے سے جہاز پر چڑھا دیا، روپے لے کر چل نکلا۔ وہ دو سوداگر تھے، دونوں اِس پر مائل ہوئے، قصّے فساد حائل ہوئے۔ پھر یہ صَلاح ٹھہری کہ بِالفِعل مال کے جہاز پر یہ رہے۔ جب اسباب بِک چکے، اُس وقت عورت جسے قبول کرے، وہ لذّت حُصول کرے۔ جھگڑا مِٹا دیا، اُسے مال کے جہاز پر بٹھا دیا۔ ایک روز آندھی چلی، طوفان آیا۔ جس جہاز پر سوداگر تھے، وہ تو ڈوب گیا؛ مال کا جہاز اور یہ جاں باز سلامت رہی، مالک ہوئی۔ چند عرصے میں جہاز اُس شہر میں آیا جہاں سے یہ سَنگسار ہو کر نکلی تھی۔

دو کلمے یہ سُنو: جس شخص نے اِس کو بیچا تھا، کسی تقریب سے وہ یہاں کے بادشاہ کا بخشی ہوا۔ اور ویرانی کا غلام، بہ مَدَدِ اَیّام پایۂ وِزارت پا گیا۔ اور مُفتی صاحب سفر سے پھر کر، مُفت جورو کے اَلَم میں مُبتَلا تھے۔ جس دن جہاز اُس شہر میں پہنچا، وہاں کے پیمبر کو حُکمِ اِلٰہی آیا کہ ہمارا ایک خاص بندہ جہاز پر آیا ہے، یہاں کا بادشاہ؛ وزیر، بخشی اور

قاضی و مُفتی کو لے کر اُس کے پاس جائے، اور اِس سال جو جو گُناہِ صَغیرہ یا کبیرہ اِن سب سے عمدًا اور سہوًا سرزد ہوئے ہوں، اُس کے رُو بہ رُو بیان کریں۔ جو وہ خطا مُعاف کرے، تو ہم بھی در گُزریں؛ وگرنہ بلاے آسمانی، آفتِ ناگہانی اِس زمین پر نازِل کروں گا۔

پیمبر نے بادشاہ سے کہا۔ وہ سب کو ہمراہ لے کر، نبی کو گواہ لے کر جہاز پر آیا۔ عورت پردہ چھوڑ کر آ بیٹھی۔ تقریر شُروع ہوئی۔ پہلے بادشاہ نے کہا: میں سِیہ کار، اَز سَر تا پا گُنہ گار، مَعصِیَت کا پُتلا ہوں؛ مگر یہ خَدشَہ تازہ ہوا ہے کہ قاضی کے کہنے سے مُفتی کی جورو کو بے تحقیقات رَجم کا حکم دیا۔ عورت بولی: غَفَرَ اللہُ لَکَ۔ یعنی بخشے خدا تجھے۔

پھر مُفتی نے کہا: مجھے جورو کی طرف سے گُمانِ بد ہے۔ اُس نے کہا: تو ابھی چُپ رہ، بیٹھ جا۔ پھر قاضی نے بیان کیا: مجھ سے بَدَولَتِ نَفسِ اَمّارَہ یہ حَرَکتِ ناکارہ ہوئی کہ بے جُرم و خطا ایک بے گُناہ کو سنگسار کیا۔ اُس نے کہا: اللہ تیری مَغفِرت کرے۔ بعد اِس کے وزیر، وہ ویرانی کا غلام آیا؛ ندامت سے سر جُھکایا، کہا: بہ تحریکِ شیطان اور جُوشِ شَہوَت، غلام سے جُرم قَبیح ہوا کہ آقا کا لڑکا مار ڈالا، صاحبِ عِصمت کا قُصور ٹھہرایا، بوجھ اپنا اُس پر ٹالا۔ وہ بولی: غفورُ الرّحیم تجھ پر رحم کرے۔

جب بخشی آیا اور بیچنے کا ماجرا زَبان پر لایا، عورت نے کہا: تو مُحسِن کُش ہے، خدا تجھے نہ بخشے گا۔ اَلغَرَض بخشی کی جُرم بخشی نہ ہوئی۔ پھر وہ پردہ اُٹھا کے باہَر آئی، مُفتی سے کہا: یہ سب بکھیڑا تو نے سُنا، تو نے

مجھے پہچانا؟ یہ سب قصہ میری عفت کا ہے۔ آج تک خدا کے حفظ و عنایت سے میری عزت و آبرو بچی، اب خُلع کی امیدوار ہوں۔ یہ مال و متاع تو اپنے صرف میں لا، مَیں تنہا گوشۂ عزلت میں بیٹھ کے عبادتِ معبود کروں گی، اِسی شغل میں مروں گی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاضرینِ صحبت، ناظرینِ جلسہ تھرّائے۔ بادشاہ سلامت مُنفَعِل گھر آئے۔ وہ عورت تو حُجرہ بنا کے طاعتِ یزداں میں مشغول ہوئی، دولتِ کونَین حُصول ہوئی۔

توتا یہ قصہ تمام کر کے بولا: جانِ عالم! جو لوگ ثابت قدم ہیں، اُن کا ہر وقت اللہ یار ہے۔ ہر بحرِ بے کنار سے اُن کا بیڑا پار ہے۔ فرد:

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد، مرد
خدا پنج انگشت یکساں نکرد

یہ نقل سن کر شاہ زادے کا نشہ ہرن ہوا۔ دونوں کی مشقّت اور ایذا اُٹھانی، خانہ ویرانی، بادیہ پیمائی، عزیزوں کی جدائی یاد آئی۔ خوفِ خُدا سے مثلِ بید کانپا۔ ندامت سے عُذر کیا کہ حالتِ نشے میں جھک مارا، قصور ہوا، اب یہ خدشہ دل سے دور ہوا۔ پھر ہنسی خوشی وہاں سے کوچ کیا۔

اب تماشا ہے نہ سیر ہے، خاتمہ بالخیر ہے۔ وطن
پہنچنا اُس سیّاحِ جہاں گرد کا آرام و چین سے،

بعدِ حُصولِ سعادتِ قدم بوس ملنا والِدَین سے۔
پھر فیروز شاہ کا جانِ عالَم کو تخت و تاج دینا، آپ
گوشۂ عُزلت لینا۔ اور قتل وزیر زادے کا، سزائے
اعمال کو پہنچنا اُس حرام زادے کا۔

اَبیات :

چل اے توسَنِ خامہ منزل رَساں | کہ اب گھر پہنچتا ہے یہ کارواں
پھرا گھر کو شہ زادۂ خوش سیَر | جھمکڑے کا عالم، بہت کرّ و فَر
وہ اِس طَرح پہنچا وطن کی طرف | بہار آئے جیسے چمن کی طرف
بڑی فکر رہتی تھی ہر صبح و شام | ہوئی فضلِ حق سے کہانی تمام
وہ بچھڑے تو سب ہو گئے ایک جا | ہوئے اپنے مطلوب سے ہم جُدا
رہی شَرحِ جَورِ فلک ناتمام | سُرورِ حزیں! توسَنِ خامہ تمام

غَرض کہ شاہ زادۂ جانِ عالَم منزل بہ منزل مَسافت طے کر، مَعَ الخَیر وطن پہنچا۔ دو کوس شہر سے باہر خیامِ ذوِی الاِحترام اِستادہ ہوئے، لشکرِ ظفر پیکر نے مُقام کیا۔ یہ خبر فُسحت آباد میں گھر گھر مشہور ہوئی کہ کوئی غنیم بے خوف و بیم فوجِ عظیم لے کر وارِد ہوا ہے، دیکھیے ہوتا کیا ہے۔ شہر کا یہ نقشہ تھا: جس روز سے جانِ عالَم مَفقودُ الخَبَر،

دَربَدَر ہوا تھا؛ سُنسان، ویران، بے چراغ پڑا تھا اور بادشاہ گریباں چاک، سر پر خاک، نہ تخت کی خبر، نہ سلطنت سے سروکار، نہ مُلک سے مطلب، نہ دربار سے غَرَض، دیوانہ وار، بادلِ بے قرار محل میں پڑا رہتا تھا۔ نہ کسی کی سُنتا تھا، نہ اپنی کہتا تھا۔ اور شہ زادے کی ماں بھی غمگین، اندوہ ناک، بے چین؛ دن رات غم کی حکایت، اَندوہ کے بَین، نصیب کی شکایت، لَب پر شُور و شَین۔ خَلِشِ نَشترِ غم سے کوئی ساعَت قرار نہ پاتی تھی، ہر وقت بِلبِلاتی تھی۔ یہاں تک دُورِیِ دِلبَند، مَہجُورِیِ فرزند میں دونوں رُوئے تھے کہ آنکھیں اُن عزیزوں کی یوسفِ گُم گَشتہ کے فِراق میں، دید کے اِشتیاق میں ہم چشمِ دیدۂ یعقوب علیہ السّلام ہوگئی تھیں، بہ حُکمِ آیۂ وافی ہِدایہ: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ۔ اور سچ ہے: فراقِ نورِ چشم میں نورِ چشم کب رہتا ہے۔ رات دن آنکھوں میں یکساں، ہر وقت سَراسیمہ و پریشاں؛ مگر اَرکانِ سلطنت، نمک خوارِ قدیم کوششِ عظیم سے درپردہ ریاست کا نام سنبھالے تھے۔

جب وُرُودِ لشکر بہ ایں کرّ و فرّ سُنا، وزیرِ اعظم کو جانِ عالَم کے پاس حال دریافت کرنے بھیجا۔ بس کہ شہ زادۂ با اِمتیاز کی مُفارَقَت کو عرصۂ دراز ہوا تھا؛ اِس کے سوا وہ سامان، جاہ و حَشَم، لشکر کا چَم و خَم، فوج ہزار در ہزار، اَنبوہِ بے شُمار، خزانۂ لاانتہا دیکھ کر وزیر گھبرایا، اپنے شہ زادے کا وہم و گُماں نہ آیا۔ دست بستہ عَرض کی: قبلۂ عالم! گردِشِ طالِعِ واژُوں، نیرنگیِ گَردُونِ دُوں سے وارِثِ تختِ سلطنت یہاں کا دَفعَتہً گُم ہوگیا۔ بادشاہِ

آسماں جاہ ہمارا، مصیبت کا مارا جگر گوشے کی مُفارَقَت میں دامانِ صبر، گریبانِ شکیب پارہ پارہ کرکے ؛ نورِ نظر بھی اُس اپنے قُرَّۃُ العَین، طاقتِ بَصَر کے ہجر میں گریے کی نَذر کر چکا ہے۔ زیست بہ نام ہے، مر چکا ہے۔ ہَنُوز اُس عَینُ الکمال کے قدم کی خاک سُرمۂ چشمِ مُشتاقان و کُحَلُ الجَواہرِ دیدۂ مُنتَظِراں نہیں ہوئی۔ بعدِ رسمِ سلام حُضور کو یہ پیام دیا ہے کہ اگر خواہشِ تخت یا تمنّائے تاج منظورِ خاطر ہے ؛ بِسمِ اللہ، کل نہیں آج حاضر ہے ؛ مگر سامان جنگ و جِدال، گرم بازاریِ عرصۂ قِتال، خوں ریزیِ بندہ ہائے خُدا ناحق، ناروا ہے۔ مجھے تختِ سلطنت تختۂ تابوت سے بدتر ہے، اِلّا مُعاملۂ قضا و قَدَر سے مجبور فردِ بَشَر ہے۔ ہر چند جینے سے سخت جی بیزار ہے، لیکن مر جانے کا کسے اِختیار ہے۔ شعر:

مرنے کو میں تو راضی ہوں، موت کو موت آگئی
زندگی اب گلے پڑی، اِس کی میں کیا دوا کروں

شَرحِ سخت جانی مُوجِبِ پریشانیِ گوشِ حق نیوش جان کر طوُل کو مُختَصَر کیا۔ جانِ عالَم نے یہ سُن کر رو دیا۔ وزیر کو گلے سے لگایا، خِلعَتِ فاخرہ عِنایَت کیا، پھر کہا: افسوس! تم نے گُود کے پالے عرصۂ قلیل میں بھلا ڈالے۔ بعدِ آداب و کُورنِش عرض کرنا کہ بَدولَتِ کَشِشِ اُلفتِ پِدَری و تاثیرِ دُعائے سَحَری سے خانہ زادِ بامُراد زندہ و سالم شَرَفِ آستاں بُوس سے مُشَرَّف ہوا۔ اُس وقت وزیر نے پہچانا، قدموں پر گرا۔ پھر سر اُٹھاکر بے اِجازت بھاگا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، پکارا: مبارک ہو۔ اُستاد:

بوئے یوسف سوئے پیغمبرِ کنعاں آئی (1)

اے شاہِ با اقبال و اے صاحبِ جاہ و جلال ! بہ عنایتِ جامعُ المتفرِقین اور باعثِ برکتِ دُعاے مُہاجرین وہ نَیّرِ اَوجِ بختیاری، کوکبِ درخشندۂ سِپہرِ شہریاری بافوج و لشکر اور مجمعِ حورانِ پری پیکر یہاں آیا اور اِس اُجڑے نگر کو آباد کیا، بسایا۔ مُشتاقوں کا دلِ اَلَم رَسیدہ شاد کیا۔ شُکر صَد شُکر نالۂ شب گیر با تاثیر تھا۔ بادشاہ کو تو مرتبۂ یاس حاصل تھا، وزیر سے یہ کلمہ فرمایا، میر تقی :

کوئی اور ہوگی، وقتِ سحر ہو جو مُستجاب [1]

شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہیں

وزیر نے مکرّر عرض کی : بہ سَرِ اَقدسِ حُضور، شبِ دَیجور ہماری یُمنِ قدم سے اُس شمعِ انجمن اَفروزِ سُلطانی کے رُوشن ہوئی۔ ہر گلی اِس شہرِ ویراں کی رشکِ گلشن ہوئی۔ اِس گفتگو میں وزیر تھا کہ جانِ عالم تنہا داخل ہوا۔ محل میں محشر کا قیام ہوا، رُونا پیٹنا مچا، رنڈیوں کا اِزدِحام ہوا۔ ماں باپ نے گلے سے لگایا۔ شہ زادہ بِالرّاسِ وَالعَین آداب بجا لایا۔ عَین عنایَتِ الٰہی دیکھیے، اُسی دم دونوں کی آنکھوں میں بینائی آئی، جسم میں تاب و توانائی آئی۔ بادشاہ جلد سوار ہوا، بہوؤں سے لشکر میں جاکر دوچار ہوا۔ شہر والوں نے یہ ماجرا سُنا؛ صغیر و کبیر، بَرنا و پیر دوڑے۔ دونوں لشکر جِلَو میں ہمراہ، آگے آگے جہاں پناہ، روپیہ اشرفی دو رویہ تَصدُّق ہوتا، محل سرا میں لاکر داخل کیا۔ جانِ عالم کی ماں نے انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کو دیکھا، جان و دل دونوں پر نثار کیا، بہت سا پیار کیا۔ مُبارک سلامت کی صدا در و دیوار سے پیدا ہوئی جس نے

دیکھا، وہ شیدا ہوئی۔

دوسرے دن ملکہ اور انجمن آرا نے شاہ فیروز بخت سے عرض کی کہ اگر حضرت کی اجازت ہو تو شہ زادے کی محل سرائے قدیم میں ہم جائیں، ماہ طلعت سے ملاقات کر آئیں۔ بادشاہ نے فرمایا: وہ عورت بدبخت سخت مُنہ پھٹ، بڑھ بولی، فضول ہے؛ اُسے شرمندہ کرنے سے کیا حصول ہے۔ میاں مٹھو بھی حاضر تھے، بول اُٹھے: قبلۂ عالم! یگانگت مقتضیِ ملاقات خواہ نخواہ ہے، باہم رہ و رسم بڑھے گی، مدارات ہوگی، خفت و ذلت کی کیا بات ہوگی۔ بادشاہ چُپ ہو رہا۔ شہ زادیوں نے سواری طلب کی۔ طائرِ پرّاں نے پیش قدمی کر کے ماہ طلعت کو سلام کیا۔ اُس نے سر جھکالیا۔ یکایک سواریاں پہنچیں۔ اُس وقت وہ بے چاری خفت کی ماری اٹھی، اِستقبال کیا۔ دونوں نے گلے سے لگایا، مسند پر جا بیٹھیں۔

ملکہ بڑی مقرِر، خوش بیاں تھی؛ انجمن آرا نمونہی، بے زباں تھی؛ سلسلۂ کلام بہ دِل دارِی تمام کھولا کہ ہماری جانب اَور گمان نہ لانا، ہم بہ ہر حال شریکِ بشاشت، مونسِ رنج و ملال ہیں۔ توتا انجمن آرا کے سامنے آیا، پھر ماہ طلعت سے کہا: غریب نواز! اِتنا زبانِ مبارک سے فرماؤ کہ آج سچا کون ہے، جھوٹے کے مُنہ میں کیا ہے؟ اَور تو کیا کہوں، آپ کی کج بحثی کے باعث جانِ عالم کے ہاتھ یہ لوگ مہر جبیں، ماہ سیما آئے، گو اِتنا چکر ہوا؛ میرے سبب آپ کو ندامت ہوئی، جھوٹے کے مُنہ میں گھی شکر ہوا۔

انجمن آرا تو سیدھی، بھولی تھی؛ توتے سے بدمزہ ہوئی، فرمایا: دیوانے!

کیا بیہودہ بکتا ہے ! بے حکمِ خُدا کسی سے کیا ہو سکتا ہے ! پھر ماہ طلعت سے کہا : سُنو میری جان ! یہ جانور بے شعور، عقل سے دور، حیوانیّت سے مجبور ہے۔ دُنیا کا کارخانہ فسانہ ہے۔ رہا یہ حُسن و خوبیِ عارِض، عارِضی شَے ہے، اِس پر کیا اِترانا ہے ! یہ کیفیت، یہ جُوبن، یہ سِن ؛ چار دن کا ہے ناپایدار، اِس کا کیا اِعتبار ! رنگِ چمنِ دُنیا جاوِداں نہیں۔ کون سی بہار ہے جسے دَغدغۂ خزاں نہیں۔ حُسن پر غُرور بے جا ہے، سُرور یہ کہتا ہے، شعر:

بہتا دریا ہے یہ حُسن، اِس میں ارے دُھولے ہاتھ
بے خبر اِتنا ہے کیوں بَرسَرِ ساحل بیٹھا

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَام۔

نظر پڑا چمنِ دَہر میں جو ہم کو مکاں ہزار خوار ہوئی دیکھی بلبلِ نالاں
ہمارے زُعم میں اُس سا کوئی نہیں ناداں جو اپنے حُسنِ دو روزہ پہ کچھ ہوا نازاں
شِکستہ رنگیِ گُل شاہدِ چمن ہے یہاں کہ اِس بہار کا انجام، آخرش ہے خزاں
گھمنڈ اِس پہ، حماقت کی بس نشانی ہے
مقامِ عبرت و حیرت سرائے فانی ہے

آخر کار دونوں نے ماہ طلعت کو شیریں زبانی اور اپنی خوش بیانی سے شِگفتہ خاطر، خنداں رُو کیا، معاملہ یک سُو کیا۔ دو چار گھڑی ہنسی خوشی، اِختلاط رہا ؛ مگر تُوتا نُوک چُوک، چھیڑ چھاڑ کیے گیا۔ پھر رخصت ہوئیں۔ اُس نے حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ واقعی جنھیں اللہ حُسنِ بے مثال، مرتبۂ جاہ و جلال دیتا ہے ؛ اُن لوگوں کا دلِ صفا منزل غُبارِ کُلفت اور

عُجب و نَخُوَت سے صاف، اور مرآتِ سینہ زنگِ حَسَد وکینہ سے شفّاف ہوتا ہے۔ اَلقِصّہ، باہم بے رنج والم رہنے لگے۔ شب شاد، ہر روز خنداں، خُرّم و فَرحاں بسر کرنے لگے۔ نئے سِرسے وہ اُجڑا ہوا شہر بسا۔ بِنائے ظلم و ستم مُنہدِم ہوئی۔ مُرَوَّج عَدل وداد ہوا۔ دُونا سابِق سے حال میں آباد ہوا۔ خزاں چمن سے دور ہوئی۔ بلبلِ نالاں چہچہے کرنے لگی، مسرور ہوئی۔

ایک روز جانِ عالم نے تمام خَلقت کو دَرِ شہر پناہ پر طلب کر کے، وہ بکری کا بچّہ دِکھا، نمک حرامیاں اُس کی سُنا، جَلّاد سے حُکم کیا: اِس کے اَعضا اَعضا سے جُدا، بے دست و پا کر کے، زاغ و زَغَن کو، گوشت کی بُوٹیاں اُڑا کر، کِھلا دو۔ شکاری کُتّوں کو، لہو اِس کا بہا کر، چٹا دو۔ بہ مُجرّد فرمان اُسی آن بند بند تیغِ تیز سے جُدا ہو گیا۔ ایک عالم یہ سانحہ سُن کے حیرت کا مُبتلا ہو گیا۔ سب نے اُس بے دین پر لعنت و نفریں کی۔ جانِ عالم نے دَولت سَرا کی راہ لی۔ اُسی روز فیروز شاہ نے تاج و تخت بیٹے کو حوالے کیا، خود گوشۂ تنہائی لیا۔ بادشاہ شب اپنی عبادت اور بیداری میں سَحَر کرتا تھا؛ وہ تو قائمُ اللیل، صائمُ النّہار مشہور ہوا۔ جانِ عالم ہر روز تخت پر جلوہ افروز ہو، عَدل کی داد دے کے، شب کو پری پیکروں میں بسر کرتا تھا؛ یہ عادل و سخی، رحیم و شجاع، یکتائے روزگار مشہور ہوا۔ ذِکر دونوں کا تا قیامِ قِیامت صَفحۂ روزگار، وَرَقِ لَیل و نَہار پر اور بَرزبانِ یگانہ و بیگانہ رہا۔ بات باقی رہ گئی، نہیں تو دَورِ دَوراں میں کس کا دَور رہا، کس کا زمانہ رہا!

جس طرح جانِ عالم کے مطلب ملے ، اسی طرح کُل عالم کی مُراد اور تمنّائے دِلی اللہ دے۔ عَلَی الخصُوص سامعین ، ناظرین ، راقم و مُؤلّف کی خواہش و آرزو بہ تصدّقِ رسولِ عَرَبی بر آئے۔ بحُرمَۃِ النّبِیِّ وَآلِہِ الاَمجاد بِالنُّونِ وَالصَّاد۔ بہ اَسبابِ ظاہر یہ فسانہ ہے ، نادرِ زمانہ ہے ، مضمونِ چکیدۂ دل و تحریرِ خامہ ہے ؛ اگر دیدۂ غور و نظرِ تامّل سے مُلاحظہ کرو ، تو حقیقت میں کارنامہ ہے۔ مُؤلّف :

گلزار کو جہاں کے ہم نے بہ غور دیکھا — کیا بے ثبات، ہے ہے! دِل چسپ یہ مکاں ہے
اک رنگ پر نہیں ہے رنگین اِس کا نقشہ — ہے فصلِ گُل کبھی تو گہ موسمِ خزاں ہے
روتی چمن میں شبنم ، ہنسنے پہ ہے گُلوں کے — نالے سے بلبلوں کے جو گُل ہے، شادماں ہے
دیکھا بہ چشمِ عبرت ہم نے طلسمِ دُنیا — رشکِ حبابِ شبنم واللہ بے گماں ہے
پابند یاں نہ ہوئے، جس کو کہ عقل کچھ ہو — دُنیا ہے نام جس کا ، وہ قحبۂ جہاں ہے
آتی صدا جرس سے کانوں میں ہے یہ پیہم — غافل عبث ہو، رہ میں یاروں کا کارواں ہے
از بہرِ پنجتن تو سُن لے دُعا یہ خالق! — جو ہے نہاں جہاں میں، تجھ پر وہ سب عیاں ہے
اہلِ دوَل کا مجھ کو محتاج تو نہ کرنا — احساں کا بار اُن کے مجھ کو بہت گراں ہے
کعبہ بھی اور مدینہ دکھلا سُرورؔ کو تو — وہ مدّعائے دل ہے، یہ آرزوئے جاں ہے

تاریخ مُؤلّف :

جس نے کہ سُنا اِس کو، یہ کہنے لگا دل میں — یا رب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابِل کا
تاریخ سُرورؔ اِس کی منظور ہوئی جس دم — بے ساختہ جی بولا " نشتر ہے رگِ دل کا "

۱۲۴۰

جس دم یہ کہانی تمام ہوئی، بہ طریقِ اصلاح جناب قبلہ و کعبہ آغا نوازش حسین خاں صاحب، عرف مرزا خانی، متخلّص بہ نوازش کی نظرِ فیض اثر سے گزری؛ اِس تاریخ سے زینت بخشی : قطعۂ اُستاد :

برای خاطرِ یاران و احباب　　سُرورؔ ایں قصہ را چوں کرد ایجاد (1)
بجستم سالِ تاریخش نوازشؔ　　فلک ایں "گلستانِ بے خزاں داد"

یہ فسانہ رائج جو ہوا؛ بندے کے دوست تھے نیک سیرت، ستودہ صفات، خجستہ افعال، اکملِ ہر کمال، تعلّقِ دہر سے مثلِ سرو آزاد لالہ دُرگا پرشاد۔ ہنر ہیں، عیب پوش، تخلّص مدہوش۔ خُمِ محبّت سے مَےِ الفت جوش میں آئی، یہ تاریخِ مستانہ زیبِ فسانہ فرمائی، مدہوشؔ :

کہا فسانہ جو یہ عجائب سُرورِؔ دل خستہ و حزیں نے
کہ جس کی تاثیر سے بیاں کی، ہر ایک دل بے قرار دیکھا
جہاں پہ کچھ گُل کی گفتگو ہے، وہاں پہ کچھ اور رنگ و بو ہے
جہاں خزاں کی خلش ہے اِس میں، وہاں پہ کیا کیا نہ خار دیکھا
جہاں کیا غم نے ہے جگر خوں، نظر پڑا واں شفق کا عالم
کہیں جو ہے داغ دل کا پھولا، تو اُس جگہ لالہ زار دیکھا
کہیں جو چشمے کا ماجرا ہے، دکھائی وہ آب و تاب اُس نے
کہ چشمۂ چشم سے ہر اک کے رواں ہوا چشمہ سار دیکھا
کہیں جو دریا کا ذکر آیا، تو کشتیِ دل ہے نذرِ طوفاں
جو کوہ نے سر کہیں اُٹھایا، تو جان کو سنگسار دیکھا

ہوا ہے جس جس جگہ پر اِس میں بیانِ سحر و طلسم و جادو
تو قدرتِ حق سے اُس مکاں پر نئی طرح کا حصار دیکھا
جو قید میں دیو کی پھنسا ہے کسی جگہ پر کوئی پری رو
تو کیا نہ سامان چھوٹنے کا وہاں پہ بہ رفعِ کار دیکھا
جہاں لکھا اِس فسانہ پیرا نے حال کچھ رنج و بے کسی کا
وہاں پہ ہمدم نہ کوئی پایا، نہ کوئی مونس، نہ یار دیکھا
کسی جگہ پر جو جوگ آسن کا جوگیوں کے بیاں ہے اِس میں
جو خوب چھانا، تو اُس جگہ کچھ نہ غیرِ مُشتِ غُبار دیکھا
شکستگیِ بیاں کے آگے تو زرد ہے رنگ زعفراں کا
جہاں ہے کچھ روپ بستگی کا، وہاں پہ دل کو فشار دیکھا
کہیں جو آمد کی یار کی کچھ خبر کا چرچا کیا ہے اُس نے
تو دیدہ ہر اہلِ دید کا واں پہ وقفِ صد انتظار دیکھا
جو وصل کی شب کا کچھ بیاں ہے، تو جمع ہے خاطرِ پریشاں
جو روزِ ہجراں کا غم لکھا ہے، تو دل کو کیا انتشار دیکھا
جو بزم کا کچھ بیاں کیا ہے، تو کوئی مجلس نہ دیکھی ایسی
جہاں پہ کچھ رزم کا بیاں ہے، ہر اک کو اسفندیار دیکھا
جہاں سخاوت کا کچھ بیاں ہے، نہ پوچھ احوال واں کا مجھ سے
کہ حاصلِ بحر و کانِ عالم کو ایک دم میں نثار دیکھا

کہیں کھنچی ہے جو تیغِ ابرو، تو ہو گئے دل کے ٹکڑے ٹکڑے
کہیں جو تیرِ نگاہ چھوٹا، تو صاف سینے کے پار دیکھا
خرابیِ حالِ عاشق ایسی، کہ جس پہ رونا فلک کو آوے
کہیں یہ معشوق کی ہے خوبی کہ ملک تک زرنگار دیکھا
نہ پوچھو حال اِس فسانے کا تم کہ ڈھنگ کیا کیا بھرے ہیں اس میں
جو حُسن دیکھا تو زُور دیکھا، جو عشق دیکھا تو زار دیکھا
ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سالِ تاریخ اِس کا لکھے
تو کھینچ کر "آہ" دل سے نکلا "خزاں سے رنگِ بہار دیکھا"
۱۲۴۶　　　　　۶

حرفِ آغاز

(اشاعتِ انجمن)

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی کتاب 'انتخابِ خطوطِ غالبؔ' برسوں پہلے شائع ہوئی تھی جس کے اب تک سولہ اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ چوں کہ یہ کتاب مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابات میں شامل ہے، اس لیے، اسکول کے طلبہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے مقصد سے انجمن ترقی اردو (ہند) اسے بہ اہتمام شائع کر رہی ہے۔

اطہر فاروقی

جنرل سکریٹری

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴	۱۲	برزن	ہرزن
۵۱	۳	عزمِ	عزم
۸۸	۲	بِسَرَۂ	بِسُرۂ
۹۳	۱۵	~	اِس نشان کو نکال دیا جائے۔
۱۲۵	۴	پہلے مصرعے پر ① بنالیا جائے۔	
۱۲۶	۱	اگر پر تم	اگر تم پر
۱۴۹	۴	لَقا	لِقا
۱۷۵	۱۰	عزمِ	عزم
۲۵۰	۳	تعذیر	تعزیر
۲۵۲	۷	بے گرفتارِی	بے گرفتاری
۲۶۶	۴	مُجَرُبھا	مُجَرُبھا
۲۷۳	۱۴	ہِسَرَۂ	ہِسُرۂ
۲۸۶	۲	واجبُ التَّعذیر	واجبُ التَّعزیر
۳۳۱	۲	شیطانِ	شیطان
۳۳۶	۱۱	تمام	تھام

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴۲	۱۴	قائمُ الّیل	قائمُ اللّیل
۵۶۹	کالم ۲، سطر ۲	بادشاہ کے	بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا۔
۵۶۹	کالم ۲، سطر ۳	حضور میں پیش کرتا تھا۔	اِسے قلم زد کر دیا جائے۔
۵۸۲	کالم ۱، سطر ۸		اِس لفظ کے تحت تشریحی عبارت کو قلم زد کر کے، اُس کی جگہ یہ عبارت لکھی جائے: دودھ کا مصنوعی جھاگ سردی کے موسم میں دودھ کو تھوڑی سی مصری کے ساتھ خوب گاڑھا پکا کر اور رات کو اوس میں رکھ کر صبح تڑکے اچھال کر اس کو بنایا جاتا تھا۔ صبح کے وقت پھیری والے اسے بیچتے پھرتے تھے۔

رشید حسن خاں شاہ جہاں پور میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں فوجی ملازمت خاندانی روایت بن چکی تھی۔ تعلیمی اسناد کے مطابق اُن کی تاریخِ ولادت ۱۰ رجنوری ۱۹۳۰ء ہے۔ اُن کے والد امیر حسن خاں کٹّر قوم پرست تھے۔ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں اُنھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی تھی اور اُس کے بعد سے سرکاری ملازمت کو مسلمانوں کے لیے ناجائز سمجھتے رہے۔ رشید حسن خاں نے سب سے پہلے درسِ نظامی کی تعلیم مدرسۂ بحرالعلوم شاہ جہاں پور میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء تک وہ فیلڈ ورکر کی حیثیت سے مقامی ٹریڈ یونین سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۹ء کے وسط تک اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہ جہاں پور میں اُردو فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اُس کے بعد دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہو گئے۔

ادبی تحقیق، لُغت، املا، قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری، عروض اور تدوین اُن کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ اُن کی کتاب 'اُردو املا' اپنے موضوع پر سب سے مفصّل اور بہت وقیع تصنیف ہے۔ تلفّظ اور قواعدِ شاعری سے متعلق اُن کی مشہور کتاب 'زبان اور قواعد' ہے، جو دو بار شائع ہو چکی ہے۔ اُن کا ایک تاریخی کام مقدمۂ کلامِ ناسخ ہے، جس میں پہلی بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ناسخ سے تحریکِ اصلاحِ زبان کا انتسابِ درست نہیں۔ جن قواعد کو ناسخ سے منسوب کیا گیا ہے، اُن کے وضع کرنے والے دراصل رشک [تلمیذِ ناسخ] تھے۔

اُن کی دوسری تصانیف میں اُردو کیسے لکھیں، تلاش و تعبیر [تنقیدی مضامین کا مجموعہ] اور ادبی تحقیق خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ تحقیق میں وہ قاضی عبدالودود کی روایت کے پیرو تھے اور تدوین میں مولانا عرشی کو اپنا معنوی اُستاد مانتے تھے۔ وہ ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ حق گو اور بے باک محقق تھے، جن کے تبصروں نے احتساب کی روایت کو تسلسل بخشا ہے اور زندہ رکھا ہے۔

اُن کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا تھا، جن میں دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ [۱۹۷۷ء] اور غالب ایوارڈ [۱۹۷۹ء] شامل ہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ، مجلّہ غالب نامہ کی مجلسِ ادارت اور ترقی اُردو بورڈ کی املا کمیٹی کے رُکن تھے۔ رشید حسن خاں صاحب آج ہمارے درمیان نہیں ہیں ۲۶ رفروری ۲۰۰۶ء کو وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔

ISBN : 81-7160-079-4